ڈائری

۱۹۹۳-۹۴

مولانا وحیدالدّین خاں

ڈائری

۱۹۹۳-۹۴

مولانا وحیدالدین خان

Diary: 1993-1994
By Maulan Wahiduddin Khan

Goodword Books 2005

The book does not carry a copyright

Goodword Books Pvt. Ltd.
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110013

e-mail: info@goodwordbooks.com

www.goodwordbooks.com

آغازِ کلام

ڈائری، اپنے عام مفہوم میں، کسی آدمی کے ذاتی مشاہدات اور تجربات کا روزنامچہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں ڈائری کو تاریخی یا سوانحی اعتبار سے بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ ڈائری کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آدمی بے تکلف انداز میں بہت سی ایسی باتیں لکھ دیتا ہے جن کو وہ کتاب میں لکھنا پسند نہیں کرتا۔

ڈائری لکھنے کا طریقہ بہت پرانا ہے۔ مثلاً رومیوں کے یہاں اس کا رواج پایا جاتا تھا۔ تاہم پہلے یہ تھا کہ ڈائری اور یادداشتوں (memoirs) میں فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ قرونِ وسطیٰ کے آخر میں دونوں کو الگ الگ انداز سے مرتب کیا جانے لگا۔ پریس کے دور نے ڈائری کی اہمیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

انگلستان میں پہلا قابل ذکر ڈائری نگار وہائٹ لاک (Bulstrode Whitelock) ہے جس کا زمانہ ۱۶۷۵۔۱۶۰۵ تھا۔ فرانس کا ابتدائی ڈائری نگار (Marquis de Dangeau) ہے جس کا زمانہ ۱۷۲۰۔۱۶۳۸ تھا۔

تاہم دورِ جدید میں جس کی ڈائری کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی وہ سموئیل (Sameuel Pepys) ہے۔ اس نے یکم جنوری ۱۶۶۰ سے اپنی ڈائری لکھنا شروع کیا جو کہ ۳۱ مئی ۱۶۶۹ تک جاری رہی۔ اسی طرح جذباتی تحریر کے اعتبار سے ڈبلن کے مسٹر سویفٹ (Jonathan Swift) کی ڈائری بہت مشہور ہے۔ وہ ۱۷۱۰ اور ۱۷۱۳ کے درمیان لکھی گئی۔

اس کے بعد بہت سے لوگوں کی ڈائریوں نے شہرت حاصل کی۔ مثلاً فینی برنی (Fanny Burney) جیمس باسویل (James Boswell) سر والٹر اسکاٹ (Sir Walter Scott) رابنس (Henry Crabb Robinson) اور اسی طرح گوئٹے، شیلر، ورڈس ورتھ، کولرج، وغیرہ۔

بیسویں صدی میں ڈائری لکھنے کا عام رواج ہو گیا۔ تعلیم یافتہ دنیا کا تقریباً ہر قابل ذکر آدمی اپنی ڈائری لکھنے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ قابل تقلید عادت اور کوئی نہیں، اہل علم کے لیے بھی اور عام لوگوں کے لیے بھی (III/524)

راقم الحروف کو ڈائری لکھنے کا خیال بہت عرصہ سے تھا۔ اور میں کچھ لکھتا بھی رہتا تھا۔ تاہم باقاعدہ صورت میں ڈائری کا اہتمام میں نے یکم جنوری ۱۹۸۳ سے شروع کیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک کوئی نہ کوئی بات یا کوئی نہ کوئی احساس یا تجربہ ہر روز قلم بند کرتا رہا ہوں۔ اس طرح میری ڈائریوں کا ایک وسیع ذخیرہ اکٹھا ہوگیا ہے۔ ان ڈائریوں کو دو دو سال کے مجموعہ کی صورت میں شائع کیا جارہا ہے۔

میری یہ ڈائریاں معروف انداز کی ڈائریوں سے کسی قدر مختلف ہیں۔ یہ ایک طرح کا ذاتی ریکارڈ ہے جس میں اس قسم کے اندراجات بھی ہیں جو عام طور پر ڈائری سے متعلق سمجھے جاتے ہیں اور اسی کے ساتھ وہ چیزیں بھی ہیں جن کو خواطر کہا جاسکتا ہے۔

میری پوری زندگی پڑھنے، سوچنے اور مشاہدہ کرنے میں گزری ہے۔ فطرت کا بھی اور انسانی تاریخ کا بھی۔ مجھے کوئی شخص تفکیری حیوان کہہ سکتا ہے۔ میری اس تفکیری زندگی کا ایک حصہ وہ ہے جو الرسالہ یا کتابوں میں شائع ہوتا رہا ہے۔ اس کا دوسرا، نسبتاً غیر منظم حصہ، ڈائریوں کے صفحات ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ لمبی تحریروں نے مضمون یا کتاب کی صورت اختیار کر لی اور چھوٹی تحریریں ڈائریوں کا جزء بن گئیں۔

ڈائری کا لفظ بظاہر یہ تاثر دیتا ہے کہ وہ کسی شخص کی روزانہ زندگی کا ریکارڈ ہے۔ حالاں کہ نہ ایسا ہے اور نہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ ایک انسان کی زندگی اتنی زیادہ گہری اور وسیع ہے کہ الفاظ کا کوئی بھی مجموعہ اس کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ کسی شخص کی ڈائری کو پڑھ کر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں نے اس کی زندگی کو پڑھ لیا۔ انسان اپنے پورے وجود کے اعتبار سے کیا ہے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو الفاظ کے کسی بھی مجموعے کی پکڑ میں نہیں آتی۔ حتی کہ اگر کوئی شخص ایک کتاب لکھے جس کا نام ہو "میری زندگی، اے سے زیڈ تک" تب بھی وہ اس کی زندگی کی ادھوری کہانی ہوگی نہ کہ مکمل کہانی۔

وحیدالدین مئی 1996

١٩٩٣

یکم جنوری ۱۹۹۳

میری زندگی کے ۷۶ سال پورے ہو گئے۔ مسنون عمر کا لحاظ کیا جائے تو اب میں اس سے آگے پہنچ چکا ہوں۔ یہ صفحہ لکھے بغیر اگر میری موت آجائے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہ ہوگی۔ کس قدر غیر یقینی ہے سارا معاملہ۔ تقریباً ۵۰ سال پہلے ایک مسلمان جوتشی نے میرا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا کہ تمہاری عمر ۷۰ سال ہے۔ مگر نہ اس وقت مجھے یقین تھا اور نہ اب یقین ہے کہ میں ابھی اور کتنے دن جیوں گا۔ بس یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ خاتمہ بالخیر فرمائے۔

۲ جنوری ۱۹۹۳

ہندستان ٹائمس (۲ جنوری) میں صفحہ گیارہ پر مسٹر جے ایس یادو کا مضمون ہے۔ اس کی سرخی مجھے پسند آئی۔ اس کے الفاظ یہ ہیں ——— مصیبت کو مواقع میں تبدیل کرلینا:

Turning adversity into an opportunity

یہی زندگی کی حقیقت ہے۔ اس دنیا میں مصیبتیں اور دشواریاں بہرحال پیش آتی ہیں۔ ان مصیبتوں اور دشواریوں کے خلاف احتجاج کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ مصیبتوں کو مواقع کار میں تبدیل کرلیا جائے۔

۳ جنوری ۱۹۹۳

پچھلے سال میں بھوپال گیا۔ وہاں میری ایک تقریر تھی۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ اقبال کا یہ شعر آپ کی تقریر کا موضوع ہے۔ جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔

میں نے کہا کہ یہ شعر تو میرے نزدیک صحیح نہیں۔ پھر میں اس کو اپنی تقریر کا عنوان کس طرح بنا سکتا ہوں۔ میرے نزدیک اصل بات یہ نہیں ہے کہ جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے، چنگیزی، بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ جدا ہو خوف خدا اہل سیاست سے تو پھر سیاست چنگیزی بن کر رہ جاتی ہے۔

۴ جنوری ۱۹۹۳

ایک شخص کے پاس لہو و لعب کے آلات ہیں۔ ایک واعظ اس کے یہاں آتا ہے۔ وہ اس کو نصیحت کرتا ہے۔ اور جب وہ نہیں مانتا تو واعظ اس کے آلات لہو کو توڑ ڈالتا ہے۔ اس

کے بارہ میں امام ابوحنیفہ سے فتویٰ پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ آلات لہو کو توڑنا کسی واعظ یا کسی عام شخص کو جائز نہیں۔ اگر کوئی شخص ایسا کرے تو اس پر ضمان (جرمانہ) لازم آئے گا۔ کیوں کہ یہ کام سلطان (حکمراں) کا ہے۔ حکومت ہی ایسا احتساب کر سکتی ہے اور کسی کو سزا دے سکتی ہے۔

یہ نہایت حکیمانہ بات ہے۔ کیوں کہ عام شخص جس کے پاس سیاسی قوت نہیں وہ لوگوں کو سزا دے تو اس سے سزا تو واقع نہ ہوگی، البتہ فساد پیدا ہو جائے گا۔

۵ جنوری ۱۹۹۳

عربی ہفت روزہ الدعوۃ (ریاض) کے شمارہ ۲ مئی ۱۹۹۱ میں درج ہے کہ اجودھیا کی بابری مسجد ہندو منصوبہ کا صرف آغاز ہے۔ ان کے پاس مزید تین سو مسجدوں کی فہرست ہے جن کو ڈھانا چاہتے ہیں۔ (ان الهندوس عندهم قائمة بثلاثة آلاف مسجد يريدون ان يهدموها)

مزید لکھا ہے کہ اس کا مقصد ہندستان میں اسلام کو ختم کرنا ہے۔ بلکہ میں نے سنا ہے کہ ہندوؤں کی تنظیمیں اسپین کی اسلامی تاریخ کا مطالعہ کر رہی ہیں تاکہ اسپین میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کو ہندستان میں دہرا سکیں:

والمقصود هو القضاء على الاسلام في الهند. بل سمعت ان هذه المؤسسات الهندوسية تدرس تاريخ الاسلام في اسبانيا حتى يتم تكرار ما حدث من طرد المسلمين من الهند كما حدث لهم في الاندلس (صفحه ۲۵)

یہ بات بہت سے مسلمانوں نے لکھی ہے۔ مگر ہر ایک "سمعتُ" کے لفظ سے اس کا ذکر کرتا ہے۔ کسی نے آج تک اس کا متعین حوالہ نہیں دیا۔ اس قسم کے بیانات اس حدیث کے تحت آتے ہیں۔ جس میں کہا گیا ہے کہ: كفى بالمرء كذبا ان يحدث بكل ما سمع

۶ جنوری ۱۹۹۳

الحسن البصری ایک تابعی ہیں۔ انھوں نے بہت سے صحابہ کو دیکھا۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب خشکی میں اور سمندر میں تجارت کرتے تھے (كان اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم يتجرون في البر والبحر)

موجودہ زمانہ میں ہندستان کے مسلمان یہ شکایت کرتے ہیں کہ انھیں سرکاری محکموں میں ملازمت نہیں دی جاتی۔ اگر وہ صحابہ کے طریقہ پر چلتے تو وہ تجارتوں میں لگ جاتے اور پھر انھیں اس قسم کی شکایت کی ضرورت نہیں رہتی۔

۷ جنوری ۱۹۹۳

سعودی میگزین المجلہ کے شمارہ یکم دسمبر ۱۹۹۲ میں مصر کے وزیر داخلہ عبد الحلیم موسیٰ کا تفصیلی انٹرویو چھپا ہے۔ ان سے پوچھا گیا کہ مصر میں جو مسلم جماعتیں اسلامی نفاذ کے نام پر مسلح تحریک چلا رہی ہیں ان کے خلاف حکومت مصر بہت متشددانہ کارروائی کر رہی ہے۔ وزیر داخلہ نے جواب دیا کہ وہ ہمارے خلاف ہتھیار استعمال کر رہے ہیں، پھر کیا ہم ان کو سینہ سے لگائیں گے:

انهم يواجهوننا بالسلاح، فهل نواجههم بالاحضان

اسی قسم کا واقعہ جب انڈیا میں ہوتا ہے تو اس کو ظلم کہا جاتا ہے۔ حالاں کہ جب بھی تشدد کیا جائے تو اس کا جواب تشدد سے دیا جائے گا۔ اس کا حل تشدد کے خلاف احتجاج نہیں ہے، بلکہ اپنے تشدد کو ختم کر دینا ہے۔

۸ جنوری ۱۹۹۳

ایک عربی رسالہ میں ایک مضمون نظر سے گزرا۔ اس کا عنوان تھا ——— امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس امت کی فضیلت کا راز ہے۔ (الامر بالمعروف والنهي عن المنكر سر افضلية هذه الامة)

یہ ایک لغو بات ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر امت مسلمہ کا ایک فریضہ ہے۔ اس کا شرف اور افضلیت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ فریضہ پچھلی امتوں پر بھی اسی طرح تھا جس طرح وہ امت محمدی پر مقرر کیا گیا ہے۔

۹ جنوری ۹۹۳

حیدر آباد کے نا اہل مسلم لیڈروں نے مسلمانوں کو یہ نعرہ دیا تھا کہ ——— چھیڑیں تو مت چھوڑو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں نے اگر مسلم علاقہ میں جلوس نکالا یا انھوں نے کوئی الٹا نعرہ لگا دیا تو مسلمان فوراً اس سے لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس طرح حیدر آباد میں

بار بار فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ اس کے نتیجہ میں یک طرفہ طور پر مسلمان ہی تباہ ہوئے۔

مسلمان لیڈر اگر سمجھ دار ہوتے تو وہ "چھیڑیں تو چھوڑو مت" کے بجائے مسلمانوں سے یہ کہتے کہ: چھیڑیں تب بھی نہ الجھو۔

۱۰ جنوری ۱۹۹۳

آر ایس ایس کا فلسفہ ماننے والے ایک ہندو سے ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا کہ آپ لوگوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ بھارت میں اسپین کی تاریخ دہرانا چاہتے ہیں۔ مگر آپ کو جاننا چاہئے کہ یہ سراسر ممکن ہی نہیں۔

بھارت میں مسلمانوں کی تعداد بارہ کروڑ ہے، جب کہ قدیم اسپین میں مسلمانوں کی تعداد بارہ لاکھ سے بھی کم تھی۔ آخر آپ اتنی بڑی تعداد کو کیسے ختم کر سکتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں بہت سے ایسے نئے اسباب پیدا ہو چکے ہیں جو قدیم اسپین کے عمل کو دہرانے کی راہ میں فیصلہ کن طور پر رکاوٹ بنیں۔

پھر آپ کو معلوم ہے کہ اسپین کو اپنے اس عمل کی کیا قیمت دینی پڑی۔ اس کے نتیجہ میں اسپین جدید ترقی میں دو سال پیچھے ہو گیا۔ اس دوران میں یورپ کے دوسرے ملک بہت آگے بڑھ چکے تھے۔ چنانچہ یورپی برادری میں وہ دوسرے درجہ کا ایک ملک بن کر رہ گیا۔

اسپین میں مسلم قیادت کے تحت جدید ترقی کا عمل شروع ہوا۔ اگر اسپین مسلم دشمنی کے جنون میں مبتلا نہ ہوتا تو وہ جدید یورپ کا امام ہوتا۔ مگر مسلمانوں کے ساتھ تعصب اور دشمنی کی قیمت اس کو یہ دینی پڑی کہ وہ جدید یورپ میں محض ایک مقتدی قوم بن کر رہ گیا۔

۱۱ جنوری ۱۹۹۳

کانٹ نے ۱۷۸۱ میں تنقید عقلیت (Critique of Pure Reason) نامی کتاب شائع کی۔ اس میں اس نے دکھایا کہ خالص علم کے ذریعہ ہمیں خدا کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔ آج تک اکثر دانشور اس نقطہ نظر سے اتفاق کرتے ہیں۔

مگر یہ درست نہیں۔ وہ چیز جس کو سائنسی علم کہا جاتا ہے اس کی معرفت بھی کامل معنوں میں خالص علم کے ذریعہ نہیں ہوتی۔ سائنسی علم میں بھی ایک حد کے بعد قیاس یا معقول قیاس

پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔ عین یہی خدا کی معرفت کا معاملہ بھی ہے۔ (reasoned probability)
خدا کی معرفت آخری اور انتہائی معنوں میں بلاشبہ خالص علم کے ذریعہ نہیں ہوتی لیکن اگر معقول قیاس (reasoned probability) کر لیا جائے تو یقینی طور پر خدا کی معرفت کامل طور پر حاصل کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔

۱۲ جنوری ۱۹۹۳

امام مالک جلیل القدر محدث اور فقیہہ ہیں۔ وہ ۹۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۷۹ میں ان کی وفات ہوئی۔ ابن عبد اللہ کہتے ہیں کہ ایک شخص لمبا سفر کرکے امام مالک کے پاس آیا۔ اس نے ایک مسئلہ پوچھا۔ امام مالک نے جواب دیا کہ میں اس کو اچھی طرح نہیں جانتا۔ سائل نے کہا کہ میں لمبی مسافت طے کرکے اس مسئلہ کی خاطر یہاں آیا ہوں۔ جن لوگوں نے مجھ کو آپ کے پاس بھیجا ہے میں واپس جا کر ان کو کیا جواب دوں گا۔ امام مالک نے کہا: تم یہ کہہ دینا کہ مالک نے کہا ہے کہ میں اس کو نہیں جانتا۔

یہ قدیم علماء کا حال تھا۔ آج کے علماء کا حال یہ ہے کہ وہ "میں نہیں جانتا" کہنا نہیں جانتے وہ ہر سوال کا ضرور جواب دیتے ہیں، خواہ اس کے بارہ میں وہ ضروری واقفیت سے محروم ہوں۔

۱۳ جنوری ۱۹۹۳

افریقہ کے سیاہ فاموں کے لیڈر نلسن منڈیلا (Nelson Mandela) کی کتاب حال ہی میں چھپی ہے۔ اس کا نام ہے:

No Easy Walk To Freedom

مسٹر منڈیلا نے اس کتاب میں دکھایا ہے کہ آزادی کا راستہ کوئی آسان راستہ نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ آزادی کا راستہ ایک مشکل راستہ ہے۔ مگر آزادی کے بعد قوم کی تعمیر کا راستہ اس سے بھی زیادہ مشکل راستہ ہے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو پیشگی طور پر اس حقیقت کو جان سکیں۔

۱۴ جنوری ۱۹۹۳

میرے تجربہ میں مسلمانوں کا کیس بنیادی طور پر قساوت کا کیس ہے۔ حتی کہ بظاہر نماز

پڑھنے والے لوگ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک طبقہ بے نماز قسی القلب ہے، اور دوسرا طبقہ با نماز قسی القلب۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو بھی اصلاحی تحریک اٹھی اس نے مسلمانوں کو مسلمان فرض کرکے اسلامی عمل کی طرف بلانا شروع کر دیا۔ حالاں کہ ضرورت تھی کہ اسلامی عمل سے پہلے لوگوں کے اندر اسلامی ذہن پیدا کیا جائے۔

۵ا جنوری ۱۹۹۳

خدا کے وجود کے بارہ میں سب سے زیادہ شبہہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ دنیا میں برائی (evil) ہے۔ ان کے نزدیک خدا اگر کامل ہے تو وہ دنیا میں برائیوں کو کیوں برداشت کرتا ہے۔ ایک مفکر نے لکھا ہے کہ مجھے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ دنیا میں اس قدر برائی اور مصیبت کا وجود مختار کل اور مشفق خدا کے تصور کی نفی کرتا ہے۔

مگر یہ شبہہ درست نہیں۔ برائی کے مسئلہ کا تعلق وجودِ خدا سے نہیں ہے بلکہ منصوبۂ خدا سے ہے۔

۱۶ جنوری ۱۹۹۳

ایک عیسائی خاتون نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کا موجودہ نام زرینہ لزارس (Zarina Lazarus) ہے۔ ان کا پتہ یہ ہے:

A-30, Gulmohar Park, New Delhi-110049, Tel. 668568

وہ موجودہ مسلمانوں کی اخلاقی حالت سے سخت نالاں ہیں۔ مگر وہ اسلام سے اتنا ہی زیادہ متاثر ہیں۔ گفت گو کے دوران انھوں نے کہا کہ آپ مسلمانوں کا انکار کر سکتے ہیں، مگر آپ اسلام کا انکار نہیں کر سکتے:

You can deny Muslims, but you cannot deny Islam.

۱۷ جنوری ۱۹۹۳

زندگی میں سب سے زیادہ مشکل کام نیا فیصلہ لینا ہے۔ فرد کے لئے بھی اور گروہ کے لئے بھی۔ دنیا میں مختلف اسباب سے حالات بدلتے رہتے ہیں۔ مگر بیشتر لوگوں کا یہ حال ہوتا ہے

کہ ان کا ذہن پچھلے حالات میں گھرا رہتا ہے۔ وہ ایسا نہیں کر پاتے کہ نئے حالات کو گہرائی کے ساتھ سمجھیں اور اس کے مطابق کوئی نیا فیصلہ لے سکیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں میں یہ کمزوری بہت زیادہ عام نظر آتی ہے۔

۱۸ جنوری ۱۹۹۳

بھارتیہ جنتا پارٹی کا یہ کہنا ہے کہ ہم لوگ انڈیا میں رام راجیہ لانا چاہتے ہیں تو یہ کوئی غلط کام نہیں۔ اس لئے کہ قوم کے باپو مہاتما گاندھی کا بھی یہی کہنا تھا کہ آزادی کے بعد وہ دیس میں رام راجیہ لانا چاہتے ہیں۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۸ جنوری ۱۹۹۳) نے اس سلسلہ میں گاندھی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ رام راجیہ سے میری مراد ہندو راج نہیں ہے۔ رام راجیہ سے میری مراد خدائی راج ہے۔ میرے نزدیک رام اور رحیم دونوں ایک ہیں:

By Ram Raj, I do not mean Hindu Raj. I mean by Ram Raj—Divine Raj—the kingdom of God. For me Ram and Rahim are one and same deity.

۱۹ جنوری ۱۹۹۳

جولیٹ رینالڈس (Juliet Reynolds) ایک خاتون برٹش جرنلسٹ ہیں جو ایک عرصہ سے انڈیا میں رہتی ہیں۔ ان کے مضامین روزنامہ پانیر میں چھپتے ہیں۔ پانیر کے شمارہ ۹ جنوری ۱۹۹۳ میں ان کا ایک مضمون چھپا ہے، اس کا عنوان ہے ——— انڈیا کے لوگ تاریخ کے شعور سے محروم ہیں:

Indians are devoid of a sense of history.

وہ لکھتی ہیں کہ اس ملک کے ذہین طبقہ کی زبان سے جو تاثرات میں نے سنے ہیں، ان میں سے ایک بات جو بار بار سننے میں آئی ہے وہ یہ کہ ہندستان کے لوگ غیر تاریخی قسم کے افسانوں کے دائرہ میں سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اور اس لئے وہ تاریخ کے شعور سے محروم ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ یہ چیز انڈیا کے دوسرے ساجوں سے زیادہ اس خطرہ میں مبتلا کر دیتی ہے کہ وہ ماضی کی غلطیوں کو دہرائیں۔

ان کے اصل انگریزی الفاظ یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

One of the observations I have most frequently heard expressed by intellectuals in this country is that the Indian people are conditioned to think within the boundaries of a historically interpreted myth and are hence devoid or deprived of a sense of history. This, they say, makes India more prone than most other societies to repeat the mistakes of the past. (p. 8)

۲۰ جنوری ۱۹۹۳

آج مسٹر بی کے نہرو (۸۲ سال) سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ تقسیم کے وقت وہ فائننس منسٹری میں سکریٹری تھے۔ ۱۹۴۸ میں وہ کراچی گئے تاکہ دونوں ملکوں کے مالی معاملات طے کر سکیں۔ وہاں ان کے ہم رتبہ چودھری محمد علی تھے۔ بی کے نہرو کراچی میں اخبار ڈان پڑھتے تھے۔ اس میں روزانہ انڈیا کے بارہ میں اس قسم کی خبریں چھپتی تھیں کہ انڈیا اسلام اور مسلمانوں کا دشمن ہے۔ یہاں مسلمانوں کا خاتمہ کیا جا رہا ہے۔ ہندستان میں ہندوؤں کا ایک ہی کام ہے کہ وہ مسلمانوں کو قتل کر رہے ہیں۔

مسٹر بی کے نہرو نے چودھری محمد علی سے کہا کہ یہ سب تو جھوٹ ہے۔ تمہارے اخبارات روزانہ جھوٹی خبریں چھاپتے ہیں، اور تم ان پر روک نہیں لگاتے، چودھری محمد علی نے کہا کہ یہ ہماری قومی ضرورت ہے۔ ہم کو ایک خارجی دشمن چاہئے تاکہ ہم اپنے کو متحد کر سکیں:

We need an external enemy to unite us.

بی کے نہرو نے کہا کہ پھر تم یہ جھوٹ کب تک چلاؤ گے۔ چودھری محمد علی نے کہا کہ صرف پانچ سال تک۔ اس کے بعد اس کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ بی کے نہرو نے کہا کہ جس طرح تم لوگ "اسلام اِن ڈینجر" کا نعرہ لگا رہے ہو، اگر ہم بھی انڈیا میں "ہندوازم ان ڈینجر" کا نعرہ لگانے لگیں تو پھر کیا ہوگا۔ چودھری محمد علی نے کہا کہ انڈیا میں ایسا نہیں چلے گا کیوں کہ تمہارا مذہب فناٹسزم کے لئے نااہل ہے:

Because your religion is incapable of fanaticism.

ہندوازم بلاشبہ فناٹسزم کے لئے نااہل تھا۔ مگر پاکستان کی جھوٹی سیاست نے ہندوؤں کو بھی فناٹک بنا دیا۔ ۶ دسمبر کو بابری مسجد کا ڈھایا جانا اسی کا نتیجہ ہے۔

۲۱ جنوری ۱۹۹۳

سنن ابی داؤد میں ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
لیشربن ناس من امتی الخمر، یسمونہا بغیر اسمہا (۲/ ۲۹۵) میری امت کے کچھ لوگ شراب ضرور پئیں گے، وہ اس کو دوسرا نام دے دیں گے۔

عام طور پر اس حدیث کو صرف "شراب" سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہاں شراب ایک علامتی لفظ کے طور پر آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بعد کے زمانہ میں لوگ غلط افعال اختیار کریں گے۔ مگر اس کا نام ایسا رکھ دیں گے جس سے بظاہر معلوم ہو کہ وہ درست ہے، جیسے کہ ٹکراؤ کی سیاست اسلام میں ناجائز ہے۔ مگر اس کو خوبصورت نام دے کر جائز کر لیا گیا ہے۔

۲۲ جنوری ۱۹۹۳

مسٹر پی کے نہرو نے بتایا کہ لکھنؤ کے ایک مسلمان کے نہرو خاندان سے تعلقات تھے۔ ۴۶ - ۱۹۴۷ کے ہنگاموں سے متاثر ہو کر وہ مسلم لیگی ہوئے اور تقسیم کے بعد انڈیا کو چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔ ایک عرصہ کے بعد مسز وجے لکشمی پنڈت پاکستان گئیں۔ وہاں ان کی ملاقات مذکورہ مسلمان سے ہوئی۔ وہ بڑے جوش کے ساتھ انڈیا میں مسلمانوں کے اوپر ظلم کے خلاف بولتے رہے۔ جب وہ بول چکے تو وجے لکشمی پنڈت نے نرمی سے کہا: اچھا چچا جان، یہ بتاؤ کہ یہاں کیسے ہو۔ وجے لکشمی پنڈت کے اس نرم انداز کا یہ نتیجہ ہوا کہ مذکورہ مسلمان کا سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ مزید یہ کہ وہی جو پہلے انڈیا کی برائی بیان کر رہا تھا، اب وہ پاکستان کی برائیاں بیان کرنے لگا۔

نرم جواب دینا دشمن کو دوست بنا دیتا ہے۔ اور گرم جواب دینا دشمن کی دشمنی میں اور اضافہ کر دیتا ہے۔

۲۳ جنوری ۱۹۹۳

مشہور فلسفی اور نفسیات داں ولیم جیمز (۱۹۱۰ — ۱۸۴۲) نے کہا ہے کہ مذہب کا سب سے زیادہ بنیادی عنصر یہ پکار ہے کہ مدد کرو، مدد کرو:

William James held that the basic element in religion is the cry "Help! Help!" (8/685)

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کی فطرت میں سب سے زیادہ بڑا جذبہ جو بھرا ہوا ہے وہ عجز کا جذبہ ہے۔ انسان کو اس کی عاجزانہ فطرت پر رکھا جائے تو وہ کبھی دوسرے کے لئے مضر نہیں بن سکتا۔

۲۴ جنوری ۱۹۹۳

ایک صاحب سے ہندستان کی مسلم قیادت کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ مسلم قائدین کے درمیان مخلص اور غیر مخلص کا فرق تو ہو سکتا ہے مگر قائدانہ نااہلی کے اعتبار سے ان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے مسائل کی اصل ذمہ داری خود ان کے قائدین پر آتی ہے۔

مثلاً ہندستان کے مسلمان سب سے زیادہ جلوس کے جھگڑوں کی وجہ سے مہلک فسادات کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ ان فسادات سے بچنے کا آسان حل ان سے اعراض کرنا تھا مگر مسلم قائدین مسلمانوں کو یہ سبق نہ دے سکے۔ مسلمان پچھلے پچاس سال سے اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ان کے لئے جو چوائس ہے وہ جلوس اور بے جلوس میں نہیں ہے بلکہ جلوس اور فساد میں ہے۔ اگر مسلمانوں کو اس بارے میں باشعور بنا دیا گیا ہوتا تو یقینی طور پر مسلمان ہزاروں تباہ کن فساد سے بچ جاتے۔

۲۵ جنوری ۱۹۹۳

میں پچھلے تقریباً ۲۵ سال سے مسلمانوں کو صبر و اعراض کی تلقین کرتا رہا ہوں۔ مگر مسلمانوں کی اکثریت اس کو بزدلی کہہ کر نظر انداز کرتی رہی۔ اب فسادات کی کثرت، خاص طور پر دسمبر ۱۹۹۲ میں بمبئی کے فساد نے ان کو ہلا دیا۔ اب ہر طرف صبر و تحمل کی باتیں کی جا رہی۔ ٹائم میگزین (۲۵ جنوری) میں انٹرویو دیتے ہوئے شیوسینا کے لیڈر بال ٹھاکرے نے کہا کہ مجھے امید ہے کہ مسلمانوں نے اب سبق سیکھ لیا ہے:

I hope the Muslims have understood the lesson well. (p. 31)

صبر و اعراض کی پالیسی کو ایک اصول کے طور پر اختیار کیا جائے تو وہ بہادری ہے مگر جب صبر و اعراض کو دباؤ کے تحت اختیار کیا جائے تو یہ بزدلی ہوگی۔

۲۶ جنوری ۱۹۹۳

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو اجودھیا کی بابری مسجد ڈھائی گئی۔ اس کے بعد تقریباً دو ہفتہ تک بمبئی اور ملک کے دوسرے شہروں میں ہولناک فسادات ہوئے۔ یہ بلاشبہ اندوہناک تھا۔ مگر اس شر میں ایک خیر کا پہلو نکل آیا۔ وہ یہ کہ ۱۹۴۷ کے بعد پہلی بار نام نہاد مسلم لیڈر بے نقاب ہوگئے ہیں۔ ذاتی مشاہدہ اور اخباری رپورٹ، دونوں میں مجھے نظر آیا کہ مسلم عوام ان لیڈروں سے کھلم کھلا بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں۔

ٹائمس آف انڈیا (۲۶ جنوری) میں مشہور صحافی دلیپ پیڈگاؤکر (Dilip Padgaonkar) موجودہ حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> The most significant change following the developments in Ayodhya and Bombay seems to be taking place in the Muslim community. For the very first time since Independence younger Muslims with a liberal outlook have come out in the open fearlessly to denounce leaders of their own community (p. 12)

اجودھیا اور بمبئی کے واقعات کے بعد جو سب سے زیادہ بامعنی تبدیلی آئی ہے وہ مسلم فرقہ میں پیدا ہونے والی تبدیلی ہے۔ آزادی کے بعد پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ مسلم نوجوان آزادانہ طور پر سوچ رہے ہیں۔ وہ کھل کر اور بلاخوف اپنی کمیونٹی کے لیڈروں کی مذمت کر رہے ہیں۔

۲۷ جنوری ۱۹۹۳

ایک صاحب ملاقات کے لئے آئے۔ وہ کسی سرکاری دفتر میں سروس کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ دفتر میں ہمارے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں کیا کیا جائے۔ میں نے کہا کہ زندگی نام ہے ناانصافی کو برداشت کرنے کا۔ اگر آپ موجودہ دفتروں کو الٹ پلٹ ڈالیں اور اس کے بعد ایک نیا دفتری نظام بنائیں تب بھی وہاں کسی نہ کسی طرح کی ناانصافی موجود ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ پھر کیا کیا جائے۔ میں نے کہا کہ نہ صرف دفتر کے لئے بلکہ پوری زندگی

کے لئے ایک ہی صحیح اصول ہے اور وہ یہ کہ پیش آمدہ مسئلہ کو حل کرنے کے لئے جو بھی تدبیر کی جائے وہ یہ سوچ کر کی جائے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ اگر ایک مسئلہ کو حل کرنے کے نام پر دو اور شدید تر مسئلہ پیدا ہو جائے تو یہ ایک الٹی تدبیر ہوگی جس سے بچنا ہر دانشمند آدمی کے لئے ضروری ہے۔

۲۸ جنوری ۱۹۹۳

دہلی کی جامع مسجد کے امام نے نہایت احمقانہ طور پر یہ اعلان کیا کہ مسلمان ۲۶ جنوری کو یوم سیاہ کے طور پر منائیں اور اپنے گھروں اور دکانوں پر کالا جھنڈا لگائیں۔ اس کی وجہ سے پرانی دہلی میں تناؤ پیدا ہوا۔ اس کے بعد ۲۷ جنوری کو تراہا بہرام خاں کی مسجد میں ایک معمولی واقعہ ہوا۔ اس کے امام صاحب دن میں مسجد کا دروازہ بند کر کے ٹیوشن کے لئے چلے گئے۔ واپس آکر وہ مسجد کا تالا کھول کر اندر داخل ہوئے تو قرآن کے کچھ سپارے الماری سے گر کر فرش پر پڑے ہوئے تھے۔

بیوقوف امام صاحب فوراً باہر نکلے اور محلہ میں یہ چرچا شروع کر دیا کہ کسی نے مسجد میں داخل ہو کر قرآن کی بے حرمتی کی ہے۔ تمام لوگ اس بات کو سن کر اسے دہرانے لگے۔ کسی نے امام صاحب سے یہ نہ پوچھا کہ مسجد کے دروازہ میں باہر سے تالا لگا ہوا تھا تو کوئی شخص کیسے اس کے اندر چلا گیا۔ یہ افواہ تیزی سے پرانی دلی میں پھیل گئی اور جامع مسجد کے علاقہ میں فساد پھوٹ پڑا۔ چتلی قبر میں مسلمانوں نے ایک سہگل پینٹ ہاؤس کو آگ لگا دی۔ گلی کوتانہ (سوئی والان) میں ایک مندر میں توڑ پھوڑ کی گئی۔ ایک ہندو ڈاکٹر کے کلینک کو جلا دیا۔ دو آدمی چھرے بازی میں مارے گئے۔ وغیرہ۔

اگلے دن قومی آواز کا نمائندہ علاقہ میں گیا۔ اور تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اس علاقہ میں بندر رہتے ہیں۔ بندروں نے مسجد میں گھس کر اچھل کود کی جس کی وجہ سے الماری پر رکھے ہوئے سپارے زمین پر گر پڑے۔ (قومی آواز ۲۹ جنوری ۱۹۹۳)

جناب ریاض احمد آرٹسٹ (دریا گنج) نے بتایا کہ وہ مذکورہ مسجد میں گئے۔ انھوں نے کہا کہ اگر میں یہاں ہوتا تو ہرگز یہ فساد نہیں ہو سکتا تھا۔ لوگوں نے پوچھا کہ وہ کیسے۔ ریاض

صاحب نے ان کو جواب دیا کہ میں فرش پر گرے ہوئے سپاروں کو اٹھا کر انھیں دوبارہ الماری پر رکھ دیتا اور کسی سے اس کا ذکر نہ کرتا۔ مسجد میں موجود ایک مسلمان نے کہا: "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم الرسالہ پڑھتے ہو"۔

کیسی عجیب بات ہے کہ لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ الرسالہ کا طریقہ اختیار کرنے سے فساد نہیں ہوگا، اس کے باوجود وہ سرکشی کا طریقہ اختیار کرکے فساد برپا کرتے ہیں۔

۲۹ جنوری ۱۹۹۳

آج خواجہ افتخار احمد سنبھلی (۳۸ سال) سے ملاقات ہوئی۔ وہ ماڈرن اسکول، بارہ کھمبا روڈ، نئی دہلی میں استاد ہیں۔ ان کا ٹیلیفون نمبر یہ ہے: 3311618

انھوں نے بتایا کہ ماڈرن اسکول میں وہ تنہا مسلمان استاد ہیں۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے واقعہ کے بعد اسکول کے لڑکوں نے کئی بار ان کے ساتھ بدتمیزی کی۔ مثلاً وہ اسکول کے گیٹ میں داخل ہو رہے ہیں یا نکل رہے ہیں، وہاں کھڑے ہوئے لڑکوں نے ان کی طرف دیکھ کر کہنا شروع کیا: مندر وہیں بنائیں گے۔ مگر افتخار صاحب نے ذرا بھی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔

چند دن بعد لڑکے خود ان کے کمرہ میں آئے۔ انھوں نے افتخار احمد صاحب کا چرن اسپرش کیا اور ان سے معافی مانگی۔ افتخار احمد صاحب الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ انھوں نے کہا کہ برداشت میں بہت بڑی طاقت ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں برداشت کا مادہ نہیں۔ اسی لئے وہ مصیبت اٹھا رہے ہیں۔

۳۰ جنوری ۱۹۹۳

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا کہ آجکل بابری مسجد کے بارہ میں آپ کے تین نکاتی فارمولے کا بہت چرچا ہو رہا ہے۔ اس فارمولے پر عمل کرنے کے لئے ہم کو ہندو کے قول پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ پھر ہم کیوں کر ان کے قول پر بھروسہ کرلیں جب کہ معلوم ہے کہ وہ مسلم دشمن ہیں۔

میں نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ آپ جیسے لوگ ہندوؤں کو مسلم دشمن سمجھتے ہیں جب کہ

ہیں ہندو کو بھی اسی طرح نارمل انسان سمجھتا ہوں جس طرح کوئی دوسرا آدمی۔ اگر آپ اپنے ذہن سے اس غلط مفروضہ کو نکال دیں کہ ہندو مسلم دشمن ہیں اور ان کو نارمل انسان کے روپ میں دیکھنے لگیں تو یہ شبہ اپنے آپ آپ کے ذہن سے ختم ہو جائے۔

۳۱ جنوری ۱۹۹۳

میری زندگی کی آخری تمنا صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ ہندوؤں کو ہدایت کی توفیق عطا فرمائے۔ اگر ہندوؤں میں بڑے پیمانہ پر ہدایت پھیل جائے تو ایک طرف یہ ہوگا کہ وہ خدا کی رحمت کے مستحق ہو جائیں گے اور ابدی زندگی میں جنت میں داخل کئے جائیں گے۔

دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ دین حق کا حامل بننے کے لئے ایک زندہ قوم حاصل ہو جائے گی۔ ہندو بلاشبہ ایک جاندار قوم ہیں۔ ان کے اندر بہت Potential ہے۔ میرے خیال کے مطابق، موجودہ دنیا کی تمام قوموں میں دین حق کی علمبرداری کے لئے سب سے زیادہ باصلاحیت قوم اگر کوئی ہے تو وہ صرف ہندو ہیں۔ میں نے اکثر رو رو کر ہندوؤں کی ہدایت کے لئے دعائیں کی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ضرور میری دعاؤں کو قبول فرمائیں گے اور ہندوؤں کو وسیع پیمانہ پر ہدایت کی توفیق دی جائے گی۔

یکم فروری ۱۹۹۳

لاہور کے روزنامہ وفاق (یکم فروری) کے صفحہ اول پر ایک سرخی ان الفاظ میں ہے:

"بھارت میں مسلم کشی"——— پوری دنیا کو حقائق سے آگاہ کریں گے"۔ اس سرخی کے تحت اخبار میں بتایا گیا کہ موتمر عالمی اسلامی نے ایک مہم شروع کی ہے جس کے تحت تمام دنیا کے لوگوں کو بتایا جائے گا کہ بھارت کس طرح مسلمانوں کی نسل کشی کر رہا ہے۔ یہ اعلان اسلام آباد میں مؤتمر عالمی اسلامی کے سکریٹری جنرل راجہ ظفر الحق نے ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔

اس کو پڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ پاکستان کے مسلمان بھی کتنے ظالم ہیں۔ پچھلے ۴۵ سال سے کبھی ان کے اندر یہ تڑپ پیدا نہیں ہوئی کہ دنیا کی تمام قوموں کو اسلام کی سچائی سے باخبر کریں۔ اور بھارت کے مفروضہ مظالم سے دنیا کو باخبر کرنے کے لئے وہ بے قرار ہو رہے ہیں۔

۲ فروری ۱۹۹۳

ریاض کے عربی ماہنامہ الفیصل (فروری ۱۹۹۳) میں ایک مضمون الصحوۃ الاسلامیہ کے بارہ میں چھپا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ میں ایک کتاب (الاسلام فی امریکا) چھپی ہے۔ مصنف نے اسلام کے بارہ میں لکھا ہے کہ وہ ایک قدیم مذہب ہے۔ امریکی سماج میں نیا مقام حاصل کرنے کی تلاش میں ہے۔ (دین قدیم یبحث عن مکان جدید فی المجتمع الامریکی) صفحہ ۹۶

موجودہ زمانہ میں مسلمان جگہ جگہ اسلام کی اشاعت کا کام کر رہے ہیں۔ مگر عملاً وہ بہت کم موثر ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت کا کام صبر و اعراض کے ساتھ ہوتا ہے مسلمان ایک طرف اسلام کی اشاعت کا کام کرنا چاہتے ہیں، دوسری طرف جھگڑے کی سیاست چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ اور دونوں کام ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔

۳ فروری ۱۹۹۳

محمد عبد العظیم فروٹ مرچنٹ (رائچور) نے حیدرآباد کے اخبار رہنمائے دکن (۹ فروری ۱۹۹۳) کا ایک تراشہ بھیجا ہے۔ اس میں مولانا محمد حمید الدین عاقل حسامی کی تقریر چھپی ہے۔ تقریر کا بیشتر حصہ میرے خلاف ہے۔ اخبار کی رپورٹ کے مطابق انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"مولانا وحید الدین خاں دہلی میں جمعیۃ علماء ہند کی عمارت کے ایک حصہ پر قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ اور باوجود متعدد اپیلوں کے اسے خالی نہیں کرتے۔"

یہ سراسر جھوٹا الزام ہے۔ میں جمعیۃ بلڈنگ کے دو کمروں کا کرایہ دار ہوں نہ کہ قابض۔ الجمعیۃ سے تعلق کے زمانہ میں یہ کمرے میرے پاس تھے۔ ۱۹۷۴ میں جب ان لوگوں نے الجمعیۃ کو بند کیا تو خود ان کے اپنے حساب کے مطابق، ان کے ذمہ میری رقم باقی تھی۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ میری رقم مجھے دیدیں تو میں کمرہ خالی کر دوں گا۔ مگر دو سال گزر گئے اور انھوں نے میری رقم مجھے نہ دی۔

اس کے بعد حاجی عبد العزیز صاحب میرٹھ والے جمعیۃ ٹرسٹ سوسائٹی کے چیرمین مقرر

ہوئے۔ ان سے گفتگو ہوئی تو انھوں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ ہمارے پاس فنڈ نہیں ہے کہ ہم آپ کو آپ کی رقم دے سکیں۔ میں نے کہا کہ اگر آپ مجھے دونوں کا کرایہ دار بنا دیں تو میں اپنی رقم کا مطالبہ آپ سے نہیں کروں گا۔ وہ بخوشی اس پر راضی ہوگئے۔ اور باقاعدہ طور پر میری کرایہ داری قائم ہوگئی۔ اس وقت سے آج تک میں ہر ماہ رسید پر کرایہ ادا کر رہا ہوں۔ جمعیۃ علماء کے کسی ذمہ دار نے اس دوران کبھی مجھ سے نہ کوئی اپیل کی اور نہ یہ مطالبہ کیا کہ تم جمعیۃ بلڈنگ کو چھوڑ دو۔

۴ فروری ۱۹۹۲

بمبئی کی بعض مسجدیں مصروف سڑکوں کے کنارے واقع ہیں۔ جمعہ کے دن نمازی اتنے زیادہ جمع ہو جاتے ہیں کہ سڑکوں پر صفیں قائم کی جاتی ہیں۔ اور دیر تک دونوں طرف ٹریفک رکا رہتا ہے۔ اس پر بمبئی کے ہندوؤں کو اعتراض ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ سڑک پر نماز پڑھنے کا سلسلہ بند کیا جائے۔ مگر مسلمانوں نے اس کو اسلامی وقار کا مسئلہ بنا لیا ہے۔

بمبئی کے ایک مسلمان نے اس کی بابت مجھ سے سوال کیا۔ میں نے کہا کہ رسول اللہ نے تو اماطۃ الاذیٰ عن الطریق کو ایمان کا ایک تقاضا بتایا ہے۔ اور آپ لوگوں نے بطور خود ایک ایسا دین دریافت کیا ہے جس میں اقامۃ الاذیٰ علی الطریق ایمان کا تقاضا بن گیا ہے۔ کیسا عجیب فرق ہے آپ لوگوں کے دین میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں۔

۵ فروری ۱۹۹۳

اسٹیٹسمین (۵ فروری) میں لکھنؤ کی ڈیٹ لائن کے ساتھ ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس کے لکھنے والے موہن سہائے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ مولانا علی میاں اور لکھنؤ کے دوسرے مسلم لیڈروں کا خیال ہے کہ ہر کمیونٹی کے سیکولر لوگوں کو جوڑا جائے۔ اور ان کے ذریعہ ایودھیا اشو کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔

انڈیا کے مسلم لیڈر پچھلے پچاس سال سے اس بات کو دہراتے رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوؤں میں کچھ سیکولر لوگ ہیں اور کچھ غیر سیکولر۔ سیکولر لوگوں کو ساتھ لے کر ہم اپنے مسائل حل کر سکتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ تقسیم بنیادی طور پر غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ

تمام انسان اصلاً ایک ہیں۔ ہر آدمی اپنی نیچر پر ہے۔ یہاں کوئی مسٹر سکولر، مسٹر نان سکولر نہیں۔ ہر ایک مسٹر نیچر ہے۔

البتہ ہر آدمی کے اندر دو مختلف صفتیں ہیں۔ ایک نفس امّارہ (انانیت) اور دوسری نفس لوّامہ (ضمیر)، عام حالات میں ہر آدمی اپنے ضمیر کے تحت ہوتا ہے لیکن جب اس کی انا کو چھیڑ دیا جائے تو اس وقت اس کے اوپر نفس امّارہ غالب آجاتا ہے۔ کسی انسان یا گروہ کے شر سے بچنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ اس کو نفس لوّامہ پر رہنے دیا جائے۔ اس کو نفس امّارہ کا معمول نہ بننے دیا جائے۔

۶ فروری ۱۹۹۳

ایک ہندو سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ لوگ مسجدوں کو توڑ کر وہاں مندر بنانے کی بات کرتے ہیں۔ مگر اس کے نتائج پر آپ نے غور نہیں کیا۔ اس قسم کی تحریک اپنے نتیجے کے اعتبار سے مسجد کی جگہ مندر بنانے کی تحریک نہیں ہے، بلکہ مسجد۔مندر کے نام پر ملک کو تباہ کرنے کی تحریک ہے۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ میں آپ کے لئے جو انتخاب ہے وہ حقیقۃً اس ڈھانچہ اور اُس ڈھانچہ کے درمیان نہیں ہے بلکہ اس ڈھانچہ اور ملک کی تباہی کے درمیان ہے:

> Here the option is not between this structure and that structure. The real option is between this structure and destruction.

۷ فروری ۱۹۹۳

ایک صاحب نے بتایا کہ انھوں نے ہندی زبان کا ایک ویڈیو کیسٹ دیکھا۔ اس میں دو ہندو لڑکے آپس میں بات کرتے ہیں۔ ایک کہتا ہے مسلمان کون لوگ ہیں۔ دوسرا جواب دیتا ہے کہ مسلمان وہ ہے جو ہر معاملہ میں ہم سے الٹا کام کرے۔ جیسے کہ ہندو سیدھے توے پر روٹی پکاتے ہیں تو مسلمان الٹے توے پر روٹی پکاتے ہیں۔ ہندو بتوں کی پوجا کرتا ہے تو مسلمان بتوں کی پوجا نہیں کرتے۔ ہندو سبزی کھاتا ہے تو مسلمان گوشت کھاتا ہے۔ ہندو اپنے گھروں کی صفائی کرتے ہیں تو مسلمان اپنے گھروں کو گندا رکھتا ہے۔ ہندو امن چاہتا ہے تو مسلمان لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ وغیرہ۔

مذکورہ آدمی نے کہا کہ اس ایک مثال سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ آجکل ہندوؤں کے درمیان مسلمانوں کے خلاف کس قسم کے جھوٹے پروپگنڈے کئے جا رہے ہیں۔ ان پروپگنڈوں پر جو نسل اٹھے گی وہ مسلمانوں کے بارے میں کیسی ہوگی۔ میں نے کہا کہ اس کا بہت آسان حل ہے۔ آپ ہندوؤں اور مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ میل جول (interaction) بڑھائیے۔ اس کے بعد یہ تمام بے بنیاد پروپگنڈے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

۸ فروری ۱۹۹۲

مسٹر اے آر شیروانی نے بتایا کہ ریاست گوالیار میں یہ رواج تھا کہ محرم کا تعزیہ جب اٹھانا ہوتا تو مہاراجہ خود آکر اس کو کندھا دیتے اس کے بعد تعزیہ آگے بڑھتا۔ آزادی کے بعد جب نئے راجہ کا دور آیا تو دوبارہ مسلمانوں نے پیغام بھیجا کہ راجہ صاحب آئیں اور تعزیہ کو کندھا دے کر اسے آگے بڑھائیں۔ نئے راجہ نے بہانہ کر کے کہلا دیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لئے میں نہیں آسکتا۔

اس کے بعد مسلمانوں نے خاموشی سے ایک تدبیر سوچی۔ وہ تعزیہ اٹھانے کے لئے جمع ہوئے مگر کسی نے زیادہ زور نہیں لگایا اس لئے تعزیہ بھی اٹھ نہ سکا۔ اس کے بعد انھوں نے مہاراجہ کو پیغام بھیجا کہ آپ کے بغیر تعزیہ اٹھ نہیں رہا ہے اس لئے آپ کا آنا ضروری ہے۔ ورنہ تعزیہ اسی طرح پڑا رہے گا۔ یہ پیغام سن کر راجہ اس مقام پر آئے اور مسلمانوں کے ساتھ خود بھی تعزیہ کو ہاتھ لگایا۔ اب فوراً ہی مسلمانوں نے تعزیہ اٹھا لیا اور اس کو لے کر آگے بڑھے۔ راجہ صاحب اس بات سے بہت خوش ہوئے۔

گوالیار کے مسلمانوں کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اس وقت وہاں کوئی مسلمان لیڈر موجود نہ تھا جو ان کو یہ مشورہ دیتا کہ راجہ صاحب نے تعزیہ کی بے حرمتی کی ہے اس لئے ان کے خلاف ایجی ٹیشن چلانا چاہئے۔ وہاں مسلمانوں کی اپنی سادہ سوچ کے سوا کوئی اور چیز نہیں تھی جس سے وہ رہنمائی لیں اور انسان جب اپنی سادہ سوچ کی رہنمائی میں چل رہا ہو تو وہ اسی طرح ہر مسئلہ کا حل بآسانی دریافت کر لیتا ہے۔

۹ فروری ۱۹۹۳

ابراہیم النخعی ایک محدث ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جو شخص چاہتا ہے کہ وہ حدیث کا عالم بنے اس کو چاہئے کہ وہ حدیث کا تذکرہ کرتا رہے۔ حتی کہ ان لوگوں سے بھی جو اس کو پسند نہ کرتے ہوں (من سرہ ان یحفظ الحدیث فلیحدث بہ۔ ولو ان یحدث بہ من لا یشتھیہ) النظرات التسلیمیہ عند المحدثین، صفحہ ۹۳

اکثر لوگ اپنے ہم خیال لوگوں سے مذاکرہ پسند کرتے ہیں۔ اس کی بھی ایک اہمیت ہے۔ لیکن غیر ہم خیال لوگوں سے مذاکرہ اور بھی زیادہ مفید ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے مسئلہ کے مزید پہلو سامنے آتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں اپنے علم میں اضافہ ہوتا ہے اور زیادہ پختگی حاصل ہوتی ہے۔

۱۰ فروری ۱۹۹۳

میرٹھ کے کچھ مسلمان آئے۔ انھوں نے کہا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد ڈھانے سے پہلے آپ یہ کہتے تھے کہ ثالثی کے اصول پر اس مسئلہ کو حل کیا جائے۔ ۶ دسمبر کے بعد آپ اس مسئلہ کے حل کے لئے تین نکاتی فارمولا پیش کر رہے ہیں۔ یہ فرق کیوں۔

میں نے کہا کہ فقہ کا بنیادی اصول ہے کہ حالات کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں۔ ۶ دسمبر سے پہلے ہمارے لئے بابری مسجد کو بچانے کا مسئلہ تھا۔ اب ہمارے سامنے ملت مسلمہ کو بچانے کا مسئلہ ہے۔ ۶ دسمبر کو انھوں نے بابری مسجد اس طرح ڈھائی کہ اس کا پتھر تک ہٹا کر دور پھینک دیا۔ اور اس کے بعد عین اسی مقام پر ایک عارضی مندر بنا دیا جہاں روزانہ پوجا ہو رہی ہے۔ اس کے بعد صورت حال یکسر بدل چکی ہے۔ اب ہمارے سلئے انتخاب مندر اور مسجد میں نہیں ہے۔ بلکہ مندر اور تباہی ہے۔ ایسی حالت میں میں نے وہ اصول اپنایا ہے جس کو حدیث میں اختیار ایسر کہا گیا ہے۔

۱۱ فروری ۱۹۹۳

بابری مسجد کے مسئلہ کے حل کے لئے میں نے جو "تھری پوائنٹ فارمولا پیش کیا ہے اس کا آجکل پورے ملک میں ہر طرف چرچا ہے۔ ایک مسلمان نے کہا کہ آپ نے جو تین نکات

پیش کئے ہیں، اس میں یہ بھی شامل ہے کہ مسلمان اب اجودھیا اشو کو چھوڑ دیں۔ مگر آپ ایسا کیوں کر کہہ سکتے ہیں جب کہ شرعی مسئلہ یہ ہے کہ مسجد ایک بار جہاں بنا دی جائے وہ ہمیشہ مسجد ہی رہے گی۔

میں نے کہا کہ تین نکاتی فارمولے کا تعلق مسجد سے نہیں ہے بلکہ مسلمان سے ہے۔ یہ فارمولا مسجد کا شرعی حکم بتانے کے لئے نہیں وضع کیا ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ موجودہ قسم کی صورت میں مسلمان کے رویہ کے بارہ میں شرعی حکم کیا ہے، وہ مسلم رویہ کا شرعی بیان ہے نہ کہ مسئلہ مسجد کا شرعی بیان۔

۱۲ فروری ۱۹۹۳

آج ٹائمس آف انڈیا میں مشہور قانون داں اور ریٹائرڈ مسٹر نانی پالکھی والا کا ایک مضمون چھپا ہے۔ اس میں انھوں نے سب سے اچھے الفاظ میں میرے تین نکاتی فارمولا کی حمایت کی ہے۔ اس طرح کے اور بھی بہت سے غیر مسلم صاحبان کے مضامین ہندی اور انگریزی پریس میں چھپ چکے ہیں۔

تین نکاتی فارمولا حقیقۃً مسلمانوں کے تحفظ کے لئے ہے تاکہ ان کے لئے مستقبل کی تعمیر کا راستہ کھل سکے۔ مگر عجیب بات ہے کہ غیر مسلموں میں تو بہت بڑے پیمانہ پر لوگ پرجوش طور پر اس کی تائید کر رہے ہیں۔ مگر مسلمانوں میں کوئی بھی قابل ذکر آدمی ایسا نہیں نکلا جو کھل کر اس کی تائید کرے۔ بلکہ مسلمانوں کی معروف شخصیتیں اس کو رد کرنے کے لئے کھڑی ہوگئیں۔ مثلاً مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنے ایک انٹرویو میں میرے تین نکاتی فارمولا کو مکمل طور پر ڈسمس کر دیا ہے۔ (اسٹیٹسمین ۵ فروری ۱۹۹۳)

۱۳ فروری ۱۹۹۳

ناناجی دیشمکھ نے ایک سیاسی قصہ بتایا۔ انھوں نے کہا کہ ایک کانگرسی لیڈر جو کہ وزیر زراعت تھے، ان کا الکشن ہونے والا تھا۔ وہ اپنے انتخابی علاقہ میں آئے اور سرکٹ ہاؤس میں ٹھہرے۔ اپوزیشن کے آدمی نے نہایت خاموشی کے ساتھ ایک تدبیر کی۔ یہ موسم وہ تھا جب کہ جو اور گیہوں کی فصل اگی ہوئی تھی اور بالیں نکل آئی تھیں۔ اس نے ایک کھیت سے

دو بالیں توڑیں اور ان کو لے کر سرکٹ ہاؤس پہنچا

وہاں وہ مذکورہ وزیر زراعت کے کمرہ میں داخل ہوا۔ اس نے کہا کہ ہمارے یہاں بازار میں ایک بحث چھڑی ہوئی ہے اور اس کا فیصلہ نہیں ہو رہا ہے۔ میں آپ کے پاس اس کا فیصلہ لینے کے لئے آیا ہوں کیوں کہ آپ اس کونٹ سنے کے لئے پراپر پرسن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ جھگڑا ان دو بالوں کے بارہ میں ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ بالیں گیہوں کی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ بالیں جو کی ہیں۔ آپ چونکہ ایگری کلچر کے منسٹر ہیں، اس لئے آپ اس کا فیصلہ کر دیں کہ یہ بالیں گیہوں کی ہیں یا جو کی۔

جیسا کہ پیشگی طور پر اندازہ تھا، منسٹر صاحب اس سوال کا جواب نہ دے سکے۔ اس کے بعد وہ آدمی جلسہ میں پہنچا جس کا انتظام پہلے سے کیا جا چکا تھا۔ وہ اسٹیج پر دونوں بال لیکر کھڑا ہو گیا۔ پورا قصہ بتانے کے بعد اس نے کہا کہ جو کانگریس ایسے لوگوں کو زراعت کا وزیر بنائے جو گیہوں کی بال اور جو کی بال کا فرق نہ جانتے ہوں۔ وہ آخر ملک کو کس طرح ترقی کی طرف لے جا سکتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام میں کانگریسی لیڈر کی ساکھ اکھڑ گئی اور وہ الکشن ہار گئے۔

۱۴ فروری ۱۹۹۳

انڈیا میں جس ڈھنگ سے ڈیموکریسی ہے، اس میں کسی گورنمنٹ سے بہت زیادہ امید کرنا حماقت ہے۔ ایک ہندو مبصر راجیو دھون نے بہت صحیح کہا کہ موجودہ حالات میں گورنمنٹ اگر فیصلہ کن کردار ادا کرے تو اس پر یہ تنقید کی جائے گی کہ وہ بے درد ہے۔ اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کو بزدل بتایا جائے گا:

When the Government is decisive, it is criticised for ruthlessness. When it fails to act, it is accused of calculating cowardice.

ایسی حالت میں حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ حکومت پر بھروسہ کرنے کے بجائے خود اپنی تدبیر پر بھروسہ کیا جائے۔ ہماری طرف سے مثبت تدبیر کے بعد حکومت بھی زیادہ بہتر طور پر اپنا رول ادا کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔

۱۵ فروری ۱۹۹۳

ایک نوجوان عالم سے ملاقات ہوئی۔ وہ سعودیہ کی رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے مبعوث ہیں۔ اور حیدر آباد میں ایک مدرسہ سے وابستہ ہیں۔ ان کو سعودیہ سے ساڑھے آٹھ ہزار روپیہ مہینہ تنخواہ ملتی ہے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ یہ بتائیے کہ سعودی عرب میں آپ کو کوئی برائی نظر آتی ہے یا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک سو ایک برائی وہاں موجود ہے۔ پھر میں نے کہا کہ کیا آپ ان برائیوں کے خلاف بیان دیتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ سعودی عرب میں برائیاں دیکھنے کے باوجود اس کے ساتھ ساتھ موافقت اور ہم آہنگی کر کے رہ رہے ہیں۔ اس لئے وہاں سے آپ کو ساڑھے آٹھ ہزار روپیہ مہینہ مل رہا ہے۔ اگر آپ وہاں کی معلوم برائیوں کے خلاف بیان دیں تو فوراً آپ کی رقم بند ہو جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ جیسے ہزاروں مسلمان اسی طرح سعودی عرب (اور دوسرے بیرونی ملکوں) سے ایڈجسٹ کر کے رہتے ہیں۔ اس لئے وہاں کا فائدہ انھیں مل پاتا ہے۔ پھر آپ یہاں کے مسلمانوں کو کیوں نہیں بتاتے کہ بھائیو، ایڈجسٹمنٹ زندگی کا ایک لازمی قانون ہے۔ تم لوگ جس طرح سعودی عرب اور دوسرے ملکوں سے ایڈجسٹ کر کے رہتے ہو، اسی طرح انڈیا میں بھی ایڈجسٹ کر کے رہو۔ اس کے بعد یہاں تمہارے لئے کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔

۱۶ فروری ۱۹۹۳

نہانے کے بعد میں تھوڑی دیر کے لئے دھوپ میں بیٹھتا ہوں۔ اس کا مقصد بال کھانا ہوتا ہے۔ بال نہ سکھانے میں یہ ڈر رہتا ہے کہ زکام ہو جائے۔ آج فضا میں بادل چھائے ہوئے تھے، اس لئے نہانے کے بعد بال سکھانے کے لئے دھوپ موجود نہ تھی۔ میں نے الکٹرک ہیٹر جلایا اور اس کے سامنے کچھ دیر تک اپنا سر کئے رہا۔ بال سوکھ گئے۔

میں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح انسان کی ہر ضرورت کا اس دنیا میں انتظام کر رکھا ہے۔ ہمارے ہر طرف ہر لمحہ خدا کی بے شمار نعمتیں پھیلی ہوئی ہیں جن کے بارہ میں سوچ کر

احساس شکر سے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر آج انسان کا یہ حال ہے کہ نعمتوں کے ہجوم میں وہ شکر گزاری کے جذبے سے محروم ہو رہا ہے۔ اگر ایسا ہو کہ لوگوں میں صرف شکر کا جذبہ بیدار ہو جائے تو تمام جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں۔ تمام جھگڑے احساس محرومی پر ابھرتے ہیں۔ شکر کا جذبہ احساس یافت میں آدمی کو غرق کر دیتا ہے۔ اس کے بعد محرومی کا احساس باقی نہیں رہتا۔ اس لئے جھگڑے کی نوبت بھی نہیں آتی۔

۱۷ فروری ۱۹۹۳

دن کے بارہ بجے ہیں۔ کھڑکی کے باہر پارک کی طرف سے چڑیوں کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ بظاہر یہ چڑیوں کی آوازیں ہیں۔ مگر جیسا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ یہ حمد خداوندی کے نغمے ہیں۔ انسان اگر چڑیوں کی آوازوں میں خدا کے گیت سننے لگے تو اس کی زندگی یکسر بدل جائے۔

۱۸ فروری ۱۹۹۳

۸ فروری کو میں پونہ میں تھا، ہم لوگوں کی شانتی یاترا (دسمبر ۱۹۹۲) کا ویڈیو فلم جو شانتی لال موتھا (پونہ) نے تیار کرایا ہے، اس کو آج حاجی یونس صاحب (نیو ایرا) کے مکان پر دیکھا۔ بہت کامیاب ریکارڈنگ تھی۔

اس میں میں نے دیکھا کہ بستی بستی میں ہندو لوگ ہزاروں کی تعداد میں شانتی یاترا کے ساتھ سڑکوں پر چل رہے ہیں۔ آگے آگے سادھوی کے گیت کا کیسٹ بج رہا ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے۔ میں نے کہا کہ خدایا، یہی میری دعا ہے اور یہی میری تمنا ہے کہ ہندو قوم کو ایمان کی توفیق ملے اور قیامت کے دن وہ آپ کی حمد کے گیت گاتے ہوئے جوق در جوق جنت کے دروازوں کی طرف جا رہے ہوں۔

ہندو لوگ میرے ہم وطن اور میرے پڑوسی ہیں۔ ان سے مجھے بے پناہ محبت ہے۔ ہندوؤں کی ہدایت اور ان کی نجات کے لئے میں برسہا برس سے تڑپ رہا ہوں۔ میں نے ان کے لئے بہت بار آنسو بہائے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ کبھی کوئی غیر پیغمبر کسی قوم کی ہدایت کے لئے اس طرح رویا ہوگا۔

میرے دل میں یہ غیر معمولی کیفیت کیسے پیدا ہوئی۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اللہ بندوں کو ہدایت دینا چاہتا ہے۔ اس لئے اس نے مجھ سے ان کے حق میں اس طرح دعائیں کرائیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ دعا قبول ہوگی اور ہندو قوم کے اعلیٰ طبقہ میں ہدایت کی ہوائیں چلیں گی، خواہ میری زندگی میں ایسا ہو یا میرے مرنے کے بعد۔

۱۹ فروری ۱۹۹۳

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۲۸ جنوری ۱۹۹۳) میں اس کے اڈیٹر کے قلم سے ایک مضمون چھپا ہے۔ اس میں ایک رپورٹ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق بوسنیا میں سربوں کی مہم بوسنیا کے مسلمانوں کے خلاف اب پوری طرح کامیاب ہو چکی ہے۔

اس میں بتایا گیا ہے کہ بوسنیا کے مسلمان اپنی ۷۵ فیصد زمین کھو چکے ہیں۔ ان کے تقریباً ۱۵۰ ہزار لوگ مارے جا چکے ہیں۔ دو ملین مسلمان بیرونی ملکوں میں پناہ گزیں کے طور پر چلے گئے ہیں۔ ہزاروں افراد قیدی ہیں۔ ان کی اقتصادیات مکمل طور پر تباہ ہو چکی ہیں (دمر اقتصادہم تدمیراً کاملاً)

وہ پہاڑی علاقوں میں محصور ہو گئے ہیں جہاں زندگی سخت مشکل ہے۔ اسی کے ساتھ ان کی مسجدیں، ان کے مدرسے، ان کے اسلامی مراکز سب جلا کر خاک کر دئے گئے ہیں۔ بوسنیا کی کامل تباہی کے بعد اس کی فوری مدد کے لئے ۱۲۰ بلین ڈالر کی ضرورت ہے اور یہ اتنی بڑی رقم ہے جس کی فراہمی ناممکن ہے (وهو مبلغ يستحيل توفيره)

الدعوہ نے آخر میں لکھا ہے کہ بوسنیا کے مسلمانوں نے جب آزادی کا اعلان کیا ۴۲ ملکوں نے اس کا اعتراف کر لیا تھا۔ مگر کسی بھی مسلم یا غیر مسلم ملک نے بوسنیا میں اپنا سفارتخانہ نہیں کھولا۔ (صفحہ ۱۰)

یہی حال آج دنیا کے اکثر حصوں میں مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔ ہر جگہ اسلام کے نام پر سیاسی تحریکیں اٹھ رہی ہیں۔ کہیں مسلح اور کہیں غیر مسلح۔ مگر ہر جگہ ان کا نتیجہ صرف تباہی کی صورت میں اور حاصل شدہ مواقع کی بربادی کی صورت میں نکل رہا ہے۔

صحیح تحریک وہ ہے جو نتائج کو سامنے رکھ کر شروع کی جائے۔

۲۰ فروری ۱۹۹۳

ابوذر غفاری ایک پاکستانی صحافی ہیں۔ جنوری ۱۹۹۲ میں وہ افغانستان گئے۔ واپسی کے بعد انھوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا: "ظاہر شاہ کو جولائی ۱۹۷۲ میں سردار داؤد نے اقتدار پر قبضہ کرکے شاہ کو جلا وطن کر دیا تھا۔ شاہ نے ۱۹۳۳ سے ۱۹۷۳ تک حکومت کی۔ اکثر افغانیوں نے مجھے بتایا کہ اس دوران افغانستان میں امن و امان رہا۔ لیکن شاہ کی جلا وطنی کے بعد افغانستان جہنم بن گیا۔ ساری افغان قوم تباہ و برباد ہوگئی ہے۔ لاکھوں افغان شہید ہوئے اور لاکھوں زخمی اور اپاہج ہوگئے ہیں۔ جب کہ لاکھوں دربدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ اس طرح ظاہر شاہ کو جلا وطن کرنے کی افغان قوم کو خوفناک سزا بھگتنی پڑی ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ روسیوں کے جانے کے بعد اب افغان ہی ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مستقبل اس سے بھی زیادہ خوفناک نظر آرہا ہے۔ افغان مجاہدین کی جماعتوں کے رہنما ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں۔ کوئی مرکزی قیادت نہیں۔ خطرہ یہ ہے کہ قوم تو تباہ و برباد ہوئی ہے اب ملک کا اتحاد بھی پارہ پارہ ہو جائے گا۔ شمالی افغانستان پر تاجکوں اور ازبکوں کا غلبہ ہو رہا ہے۔ مغربی اور وسطی افغانستان پر ایران کا سایہ پڑ رہا ہے۔ اور مشرقی افغانستان پختونوں کے درمیان اقتدار کی جنگ کا اکھاڑہ بن رہا ہے۔" نوائے وقت، لاہور، ۸ فروری ۱۹۹۲)

۲۱ فروری ۱۹۹۳

ایک عربی جریدہ میں ایک مضمون پڑھا۔ اس کا عنوان تھا: هٰذا كتاب الله رمز فلاحنا (اللہ کی کتاب میں ہمارے لئے فلاح ہے) مضمون نگار نے بڑے جذباتی انداز میں یہ بات کہی تھی کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو قرآن کی طرف لوٹنا چاہئے۔ کیوں کہ اسی میں ان کی فلاح و کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔

اس قسم کے مضامین اس مفروضہ پر لکھے جاتے ہیں کہ ابھی مسلمانوں نے قرآن کو نہیں پکڑا حالاں کہ واقعہ اس کے خلاف ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے بہت بڑے پیمانہ پر قرآن کو پکڑا ہے۔ مثلاً اخوان المسلمون کی پوری تحریک قرآن کے نام پر چلائی گئی۔ مگر وہ

ناکام رہی۔ جماعت اسلامی کی تحریک مکمل طور پر قرآن کے نام پر چلی وہ بھی ناکام ہوگئی۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں بہت بڑی بڑی تحریکیں قرآن کے نام پر اٹھیں۔ مگر ملت کی تباہی کا علاج نہ ہوسکا۔

میں سمجھتا ہوں کہ محض قرآن کا نام لینا کافی نہیں ہے۔ بلکہ قرآن کے اجتہادی فہم کی ضرورت ہے۔ موجودہ زمانہ کی تقریباً تمام تحریکوں نے قرآن کو سیاست اور جہاد کی کتاب کے طور پر لیا۔ اور اسی اعتبار سے اس کو پھیلایا۔ یہ بنیادی طور پر غلط تھا۔ آج قرآن کو دعوت کی کتاب کے طور پر لینا تھا اور اسی اعتبار سے اس کو مسلمانوں کے ذہن کا جزء بنانا تھا۔ مگر یہ کام نہ ہوسکا۔ یہی خاص سبب ہے جس کی بنا پر قرآن کے نام پر تحریکیں اٹھانے کے باوجود قرآنی نتائج حاصل نہ ہوسکے۔

۲۲ فروری ۱۹۹۳

مسٹر احمد رشید شیروانی نے قطب مینار کے آگے ڈی ایل ایف کالونی میں اپنا گھر بنایا ہے۔ وہاں ایک کلب ہے جس میں دو بڑے بڑے لان ہیں۔ شیروانی صاحب نے مجھ کو اور نانا صاحب دیشمکھ اور ڈاکٹر مہیش شرما کو دوپہر کے کھانے پر وہاں بلایا تھا چنانچہ ہم تینوں آدمی وہاں گئے۔ کھانے کے دوران ملک کے موجودہ حالات پر کافی باتیں ہوئیں۔

نانا صاحب دیشمکھ (۷۷ سال) آر ایس ایس کے خاص لوگوں میں سے ہیں۔ مگر وہ آج کی پالیٹکس سے بہت بیزار ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پولٹیکل لیڈروں نے اب اپنا اعتماد کھودیا ہے۔ عوام کو ان پر کوئی بھروسہ نہیں رہا۔ یہ صورت حال ہم کو ایک موقع دے رہی ہے کہ ہم غیر سیاسی انداز میں لوگوں کے اندر انسانی اور اخلاقی بیداری لانے کا کام کریں۔ اگر بے غرض لوگ اس کام کے لئے آگے بڑھیں تو ان کو عوام کی طرف سے یقیناً کافی رسپانس ملے گا۔ یہ طے ہوا کہ مل کر اس رخ پر کام کیا جائے۔ یہ سلسلہ انشاء اللہ اسلام کے مثبت تعارف کے لئے بہت مفید ہوگا۔

۲۳ فروری ۱۹۹۳

سویڈن کے سفارتخانہ کے منسٹر جان نارلینڈر (Jan Nordlander) آج ملاقات کے

لئے آئے۔ اس سے پہلے ۹ فروری کو امریکی سفارت خانہ کی خاتون فرسٹ سکریٹری مارسیا برنیکاٹ (Ms Marcia Bernicat) آئی تھیں۔ ان لوگوں نے ہندستانی مسلمانوں کے مسئلہ پر گفتگو کی۔ خاص طور پر ۶ دسمبر کے بعد پیش آنے والے حالات پر۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ گفتگو میں نہایت سنجیدہ تھے۔ مگر عجیب بات ہے کہ اسی قسم کی سنجیدگی مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ میں نظر نہیں آتی۔ حالاں کہ یہ خود مسلمانوں کا مسئلہ ہے اور مسلمانوں ہی کو اس معاملہ میں سب سے زیادہ سنجیدہ ہونا چاہئے۔

۲۴ فروری ۱۹۹۳

آج رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ کی پہلی تاریخ ہے۔ روزہ کے مہینہ میں میں اس طرح داخل ہو رہا ہوں کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے دل میں ہندوؤں کی بے پناہ محبت ڈال دی گئی ہے۔ روزہ کے پہلے دن میرے دل سے جو کیفیت بھری ہوئی دعا نکلی وہ یہ تھی کہ خدایا، تو ہندوؤں کو ہدایت کی توفیق دے۔ خدایا، تو ہندوؤں کے لئے جنت کے دروازے کھول دے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس بار رمضان کی آمد پر میرے دل سے جو پہلی دعا نکلی وہ یہی تھی۔

۲۵ فروری ۱۹۹۳

آج روزہ کا دوسرا دن ہے۔ ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ روزہ شاید اسی لئے فرض کیا گیا ہے کہ آدمی کو یہ احساس ہو کہ رزق کتنی بڑی نعمت ہے۔ نعمت کا جتنا زیادہ احساس ہو اتنا ہی زیادہ شکر آدمی کے اندر ابھرے گا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے روزہ سے زیادہ مؤثر کوئی طریقہ نہیں۔

کھانا اور پانی انتہائی غیر معمولی نعمتیں ہیں۔ مگر عام حالات میں آدمی کو اس کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ رزق کی فراوانی ہے۔ ایک غریب آدمی بھی اپنے لئے کسی نہ کسی طرح کھانا اور پانی حاصل کر لیتا ہے۔ اگر روزہ رکھنے کا طریقہ نہ ہو تو بہت کم لوگوں کو بھوک اور پیاس کا وہ طویل تجربہ ہو جو کھانا اور پانی کی غیر معمولی اہمیت سے آشنا کرنے کے لئے ضروری ہے۔

۲۶ فروری ۱۹۹۳

۲۵ فروری کو بھارتیہ جنتا پارٹی کی ریلی کا دن تھا۔ اس کا اعلان تھا کہ وہ پانچ لاکھ آدمیوں کو بوٹ کلب (نئی دہلی) میں جمع کرے گی۔ لیکن گورنمنٹ نے پولیس کا غیر معمولی انتظام کرکے ریلی کو ناکام بنا دیا۔ آنے والے بیشتر لوگ دہلی کی سرحد پر روک کر لوٹا دئے گئے۔ ایک لاکھ آدمی گرفتار کرلئے گئے۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۶ فروری) کی پہلی سرخی یہ تھی :

Rally flops

انڈیا کی سطحی سیاست اب جلوس اور ریلی کی شکل اختیار کرگئی ہے۔ ہندستان ٹائمس (۲۲ فروری) میں راجیو دھون نے درست طور پر لکھا تھا کہ پرانا مثل تھا کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اب سیاست کی دنیا میں یہ مثل اس طرح ہوگئی ہے کہ جس کی ریلی اس کا راج :

Indian politics drifts into rally-raj.

سیاسی زندگی میں جب ٹکراؤ آجائے تو اس کے بعد اس کو روکنا ممکن نہیں ہوتا، یہاں تک کہ وہ اپنے آخری انجام تک پہنچ جائے۔ ایسی حالت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ انڈیا کے مستقبل کی مثبت تعبیر کس طرح کی جاسکے گی۔

۲۷ فروری ۱۹۹۳

سید حامد آئی اے ایس (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) کا ایک مضمون بعنوان "کچھ اپنے بارہ میں" قومی آواز (۲۶ فروری) میں شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ "کئی سال ہوئے میں نے ایک انگریزی اخبار کی مہم کو لے کر سارا ملک چھان ڈالا ۔ افسوس اس بات کا ہے کہ مسلم عوام وخواص نے اخبار کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔ اور جو مالی مدد انھوں نے دی وہ بہت ناکافی تھی"۔ واضح ہو کہ انگریزی اخبار کی اس تحریک میں مولانا ابوالحسن علی ندوی اور دوسرے بہت سے لوگ شریک تھے۔ اس کے باوجود اس کا یہ حال ہوا۔

دوسری طرف اسی ملک میں کچھ لوگ شوسینا کے مقابلہ میں آدم سینا اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے مقابلہ میں اسلامی سیوک سنگھ بنانے کا اعلان کرتے ہیں تو مسلم اصحاب خیر ان کو کروڑوں

روپیہ دے دیتے ہیں۔

اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنی سوچ کے اعتبار سے ماضی میں جی رہے ہیں۔ وہ شعوری طور پر ابھی زمانہ جدید میں داخل نہیں ہوئے۔ اسی بنا پر ایسا ہے کہ وہ مسلح جہاد کی اہمیت کو تو سمجھ لیتے ہیں۔ مگر علمی جہاد کی اہمیت ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

۲۸ فروری ۱۹۹۳

رات ناگپور سے عبدالسلام صاحب اور محمد حنیف صاحب کا ٹیلیفون آیا۔ انھوں نے کہا کہ جبل پور کی ملاقات میں آپ نے تین نکاتی فارمولا کو روک دیا تھا۔ مگر بمبئی جا کر آپ نے اس کو پریس میں دے دیا۔

اصل یہ ہے کہ پہلے میں اجودھیا کے معاملہ کو صرف تحفظ ملت کے نقطۂ نظر سے دیکھتا تھا۔ مگر بعد کو اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کئے کہ وہ دعوت اسلام کے حق میں ایک breakthrough بن گیا۔ سہ نکاتی فارمولا نے اس معاملہ میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔ اگر میں اس فارمولا کو پیش نہ کرتا تو یہ breakthrough ہرگز ممکن نہ ہوتا۔

سہ نکاتی فارمولا موجودہ حالات میں ایک پر امن بم ثابت ہوا ہے۔ اس کے بعد انڈیا میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ ہندو تعلیم یافتہ طبقہ کی نظر میں کسی مسلمان کا نقطۂ نظر ایک قابل سماعت نقطۂ نظر بن گیا ہے۔ وہ سمجھنے لگا ہے کہ مسلمان بھی کوئی sensible بات کہہ سکتا ہے۔ اور اس کی بات کو بھی دھیان کے ساتھ سننا چاہئے۔ اس سے پہلے مسلمانوں کی اپیل صرف ہندوؤں کے پست طبقہ تک ہوتی تھی۔

اس تبدیلی نے دعوت کے غیر معمولی نئے امکانات کھول دئے ہیں۔ ہندو اجتماعات میں مجھ کو مسلسل بلایا جانے لگا ہے، جب کہ پہلے اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کوئی مسلمان اس سے پہلے اگر کسی ہندو اجتماع میں بلایا جاتا تھا تو وہ صرف مسلم سیٹ کو پر کرنے کے لئے ہوتا تھا نہ کہ حقیقۃً اس کے نقطۂ نظر کو جاننے اور سمجھنے کے لئے۔ ہندی، انگریزی وغیرہ اخبارات میں کثرت سے مضامین چھپ رہے ہیں۔

ان روابط کے نتیجہ میں بہت سے نئے دروازے کھلے ہیں۔ مثلاً ایک ہندو سوامی تقریباً

دس دن میرے ساتھ رہے۔ وہ Hinduism in daily life کے نام سے ۳۰۰ صفحہ کی ایک کتاب مختلف زبانوں میں چھپوا رہے ہیں۔ ان کا اب اصرار ہے کہ آپ بھی ایک کتاب Islam in daily life کے نام سے ۳۰۰ صفحہ کی تیار کیجئے۔ اس کو ہم دس زبانوں میں چھاپ کر ساری دنیا میں پھیلائیں گے۔ ان صاحب کے مراکز ۲۷ مغربی ملکوں میں قائم ہیں۔

یکم مارچ ۱۹۹۳

آج رات کو ایک عجیب خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میں سوامی چید انند کے آشرم (نئی دہلی) کے باہر ہوں۔ وہاں ایک چار پائی بچھی ہوئی ہے۔ اس پر میں اور سوامی جی اور ان کے دو شاگرد بیٹھے ہوئے ہیں۔ اتنے میں ایک لڑکا آتا ہے۔ وہ چار پائی کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے کہ یہاں گونگا کون ہے۔ میں چپ رہا۔ سوامی جی نے جواب دیا کہ یہاں کوئی گونگا نہیں۔ لڑکا بار بار یہی سوال کرتا ہے اور سوامی جی بار بار یہی کہتے ہیں کہ یہاں کوئی گونگا آدمی نہیں۔

اس کی تعبیر غالباً یہ ہے کہ ایک شخص جس کو اب تک آنند والا مذہب ملا ہوا تھا، اب اس کو غم والا مذہب ملے گا۔ ایک شخص جو بولنے والا مذہب پائے ہوئے تھا، اب اس کو ایسا مذہب ملنے والا ہے جس کے بعد وہ محسوس کرے گا کہ میں تو گونگا ہو گیا ہوں۔ سوامی جی نے غالباً حال کے اعتبار سے جواب دیا، اور لڑکا مستقبل کے اعتبار سے ہونے والے واقعہ کی پیشگی خبر دے رہا تھا۔

۲ مارچ ۱۹۹۳

مکہ کے عربی ہفت روزہ العالم الاسلامی کا شمارہ ۲۱ فروری ۱۹۹۳ دیکھ رہا تھا۔ اس کے صفحہ ۳ پر ایک سرخی ہے: اسلام ۱۵۱۸ فی السعودیۃ۔ یعنی سعودی عرب میں ۱۵۱۸ لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ ان نومسلموں میں فلپین، سری لنکا، انڈیا، تھائی لینڈ، امریکہ، مصر، اریٹیریا کے لوگ شامل ہیں۔ انھوں نے شیخ عبد العزیز بن باز کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔

اس طرح قبول اسلام کی خبریں برابر اخبارات میں آتی رہتی ہیں۔ مگر اس کی وجہ سے

موجودہ دنیا میں اسلام کی حالت میں کوئی قابل ذکر فرق پیدا نہیں ہو رہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ اسلام قبول کرنے والے زیادہ تر نچلے طبقے کے لوگ ہوتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اوپر کے طبقہ میں اسلام کو پھیلایا جائے۔ جب تک اوپر کا طبقہ اسلام قبول نہ کرے حالات میں کوئی تبدیلی آنے والی نہیں۔

۳ مارچ ۱۹۹۳

ہندستان ٹائمس (۳ مارچ) میں ایرک گانسالویز (Eric Gonsalves) کا آرٹیکل چھپا ہے۔ موصوف اس سے پہلے منسٹری آف اکسٹرنل افیرس میں سکریٹری کے عہدہ پر رہ چکے ہیں۔ انھوں نے شکوہ کیا ہے کہ انڈیا کی عالمی تصویر اچھی نہیں۔ اور اس کا حل یہ بتایا ہے کہ انڈیا کو دوسرے ملکوں سے دو طرفہ بنیاد پر اپنے مسائل حل کرنا چاہئے:

Bilateral solutions are the best solutions.

یہ محض کہنے کی ایک بات ہے۔ دو طرفہ بنیاد پر صرف چھوٹے چھوٹے معاملات طے کئے جا سکتے ہیں۔ بڑے معاملات جن پر قوموں کے مستقبل کا انحصار ہوتا ہے وہ کبھی دو طرفہ بنیاد پر طے نہیں ہوتے۔ ایسے معاملات میں اس اعلیٰ حوصلگی کی ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی وقتی یا قریبی مفاد کو نظر انداز کرکے یک طرفہ طور پر معاملہ کو ختم کر سکے۔ اس معاملہ میں زیادہ صحیح اصول یہ ہے کہ:

Unilateral settlement is the best settlement.

۴ مارچ ۱۹۹۳

ایک صاحب نے کہا کہ آپ موجودہ مسلم لیڈروں کے خلاف لکھتے رہتے ہیں۔ حالاں کہ انھوں نے بھی ایک کام کیا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو جگایا ہے۔ میں نے کہا کہ میں آپ کی بات میں ایک لفظ کی ترمیم کروں گا۔ ان مسلم لیڈروں نے مسلمانوں کو جگایا نہیں ہے، انھوں نے مسلمانوں کو بھڑکایا ہے۔

عجیب معاملہ ہے کہ یہی بات ہندو حلقہ میں بھی کہی جاتی ہے۔ ہندو دانشور یہ کہہ رہے ہیں کہ ہندو سویا ہوا تھا، آڈوانی اور جوشی جیسے لیڈروں کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے ہندوؤں کو جگا دیا۔ مگر یہاں بھی وہی بات ہے۔ ان انتہا پسند لیڈروں نے ہندو قوم کو جگایا نہیں

ہے۔ انھوں نے ہندو قوم کو بھڑکا دیا ہے۔
جس دیش کا یہ حال ہو کہ وہاں کے لوگ جگانے اور بھڑکانے کا فرق نہ سمجھتے ہوں وہ دیش ترقی کس طرح کرے گا، اس سوال کا جواب مجھے نہیں معلوم۔

۵ مارچ ۱۹۹۳

دور اول کے مسلمانوں نے رومن ایمپائر سے لڑ کر اس کا خاتمہ کیا۔ مسلم مصنفین کی کتابوں میں اس واقعہ کو پڑھا جائے تو وہاں یہ لکھا ہوا ملے گا کہ شر کے اوپر خیر کی فتح تھی۔ مگر مشہور انگلش مورخ ایڈورڈ گبن (۹۴ ۱۷-۳۷ ۱۷) نے لکھا ہے کہ رومن ایمپائر کا سقوط دراصل وحشت اور مذہب کی جیت تھی:

The triumph of barbarism and religion.

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں کس طرح ایک ہی واقعہ کی دو مختلف انداز سے توجیہہ کی جاسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر قیامت نہ آئے تو اس دنیا کی ہر بات لوگوں کے لئے لامعلوم رہ جائے گی۔

۶ مارچ ۱۹۹۳

ایک انگریزی کتاب میں ایک مقولہ پڑھا۔ اس میں حوالہ نہیں لکھا تھا۔ مگر بات نہایت درست تھی۔ وہ یہ کہ ——— خدا فخر پسند کی مخالفت کرتا ہے اور متواضع کو اپنی رحمت عطا کرتا ہے:

God opposes the proud,
but gives grace to the humble.

۷ مارچ ۱۹۹۳

سنڈے آبزرور (۷ مارچ) میں ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے ایک ذمہ دار نے اعتراف کیا کہ ۶ دسمبر کو اجودھیا میں جو کچھ کیا گیا اس سے ملک کے باہر اور ملک کے اندر دونوں جگہ بھارتیہ جنتا پارٹی کی تصویر خراب ہوئی ہے۔ اس نے کہا:

چنانچہ اس واقعہ کے بعد بھارتیہ جنتا پارٹی کا ایک وفد مسٹر سکندر بخت کی قیادت میں باہر بھیجا گیا۔ اس نے امریکہ، برطانیہ، جرمنی اور کناڈا کا دورہ کیا اور وہاں کے ذمہ داروں سے مل کر صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

اس طرح کے مختلف اسباب ہیں جن کی بنا پر میرا خیال ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی اب اجودھیا کے بعد کسی دوسری مسجد کا مسئلہ نہیں چھیڑے گی۔ کیوں کہ انھوں نے اپنی مقبولیت بڑھانے کے لئے ایسا کیا تھا۔ جب کہ عملی نتیجہ یہ نکلا کہ بابری مسجد کو ڈھانے کے بعد ان کی مقبولیت گھٹ گئی۔

۸ مارچ ۱۹۹۳

ایک صاحب نے صبر کے اصول پر اعتراض کیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کا اعتراض اس لئے ہے کہ صبر آپ کو انفعالیت یا بے عملی دکھائی دیتا ہے۔ حالانکہ صبر سب سے بڑا عمل ہے۔ میں نے کہا کہ ——— کسی صورتحال کا ایموشنل رسپانس (emotional response) دینا بے صبری ہے۔ اور صورتحال کا سوچا سمجھا رسپانس (considered response) دینا صبر۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ صبر اعلیٰ ترین دانشمندی اور اعلیٰ ترین بہادری ہے۔

۹ مارچ ۱۹۹۳

لاہور کے اخبار نوائے وقت (یکم مارچ ۱۹۹۳) کے صفحہ اول پر پاکستان کے وزیر اعظم محمد نواز شریف کے ایک خطاب کی رپورٹ ہے جو انھوں نے سینٹ کے اجلاس سے کیا تھا۔ انھوں نے کہا:

" پاکستان کا شمار شرح خواندگی کے لحاظ سے دنیا کے بدترین ممالک میں ہوتا ہے۔ ہماری درسگاہیں اور یونیورسٹیاں کتابوں کے بجائے اسلحہ سے بھر گئی ہیں۔ اگر کسی کو کلاشنکوف کلچر دیکھنا ہو تو وہ یہاں کے یونیورسٹی کیمپس میں چلا جائے۔

ایک طرف پاکستان میں تعلیم کی یہ حالت ہے۔ دوسری طرف وہاں کے تمام نام نہاد لیڈر ۴۵ سال سے اسلامی قانون کے نفاذ کی باتیں کر رہے ہیں۔ حالاں کہ مذکورہ حالت میں

ہیں اسلامی قانون کا مطالبہ کرنا سراسر مضحکہ خیز ہے۔ موجودہ حالت میں سب سے پہلا کام مسلمانوں کی جہالت کو دور کرنا ہے نہ کہ ان کے اوپر قبل از وقت شریعت کے نفاذ کی بے فائدہ مہم چلانا۔ اس قسم کی تحریک لیڈری ہے نہ کہ اصلاح۔

۱۰ مارچ ۱۹۹۳

ایک ہندو لیڈر سے بات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو دیش سے پیار نہیں۔ یہی ہندو مسلم جھگڑے کا اصل سبب ہے۔

میں نے کہا کہ دیکھئے۔ پیار دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو بیوپاری کو اپنے گاہک کے ساتھ ہوتا ہے۔ دوسرا وہ جو ماں کو اپنے بیٹے سے ہوتا ہے۔ آپ نے کبھی کسی بیوپاری کو اپنے گاہک کے لئے روتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا۔ مگر ماں اپنے بیٹے کے لئے روتی ہے۔ یہ فرق ہے دونوں کے پیار میں۔

پھر میں نے کہا کہ مجھے یقین نہیں کہ آپ جیسے لیڈر کبھی دیس کے لئے روتے ہوں گے۔ مگر میرا حال یہ ہے کہ میں دیش کی خاطر اتنا زیادہ رویا ہوں کہ اگر میرے آنسوؤں کو اکھٹا کیا جائے تو وہ میرے اور آپ دونوں کے اشنان کے لئے کافی ہو۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مجھ کو دیش سے کتنا زیادہ پیار ہے۔ پھر بھی میں کہتا ہوں کہ آپ لوگ ہندتو کے نام سے جو اندولن چلا رہے ہیں وہ دیش کے انٹرسٹ میں نہیں ہے۔ یہ اندولن اگر اسی طرح جاری رہا تو وہ دیش کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔

۱۱ مارچ ۱۹۹۳

کالی مسجد میں فجر کی نماز پڑھ کر نکلا تو ایک صاحب میرے ساتھ چلنے لگے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اور میرے کچھ ساتھیوں نے ایک خط لکھ کر آپ کے دفتر میں دیا تھا، کیا وہ آپ تک پہنچا۔ میں نے پوچھا کہ اس خط میں کیا بات تھی۔ انھوں نے کہا کہ بابری مسجد کے مسئلہ پر وہ خط تھا۔ مگر ہم نے اس پر اپنا نام نہیں لکھا تھا۔ میں نے کہا کہ جن خطوط پر مکتوب نگار کا نام نہ ہو ان کو میں نہیں پڑھتا۔ انھوں نے کہا کہ ایسا کیوں۔ آپ کو پڑھنا چاہئے۔ میں نے کہا کہ بہر حال میرا مسلک یہی ہے۔ کیوں کہ تحریر لکھنے والا جب اس میں اپنے آپ کو اتنا بھی شامل نہیں کرنا چاہتا کہ وہ اس پر اپنا

نام لکھے تو ایسی تحریر کو میں کیوں پڑھوں۔

میری زبان سے "مسلک" کا لفظ سن کر انھوں نے کہا کہ یہ کون سی مسلک کی بات ہے۔ مسلک تو حنفی، شافعی وغیرہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد میں نے ان کو کوئی جواب نہیں دیا۔ تعجب ہے کہ جو لوگ "مسلک" کے معنی بھی نہیں جانتے وہ ملی مسائل پر بے محابا تبصرہ کرتے ہیں۔ اس قسم کا مزاج ملی ہمدردی نہیں ہے بلکہ سرکشی ہے۔

۱۲ مارچ ۱۹۹۳

جناب رحمٰن نیر صاحب سہارن پور گئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ۶ دسمبر کے بعد ایک روز مسلم علاقہ کی ایک دکان میں کسی نے آگ لگا دی۔ عام حالات میں اس طرح کے واقعات پر ہندو مسلم فساد شروع ہو جاتا تھا۔ کیوں کہ اس کے بعد مسلمان ہندو کی دکانوں کو جلاتے۔ پھر ہندو اور بھی بڑے پیمانہ پر مسلمانوں کو مارتے اور لوٹتے۔ یہاں تک کہ پورا شہر تباہ کر دیا جاتا۔

مگر اس بار ایسا ہوا کہ صبح کے وقت جب لوگوں نے دکان میں آگ لگنے کے واقعہ کو دیکھا تو فوراً طے کیا کہ یہ نہیں کہنا ہے کہ ہندو نے آگ لگائی ہے۔ انھوں نے سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت یہ مشہور کیا کہ یہ بجلی سے لگنے والی آگ ہے شارٹ سرکٹ کی وجہ سے لگ گئی۔ اس کا نام دانش مندی ہے۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے واقعہ نے پہلی بار مسلمانوں کو یہ دانشمندی سکھائی ہے۔

اس دنیا میں چھوٹا شر لازماً پیش آتا ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ چھوٹے شر پر راضی ہو جائے تاکہ وہ بڑے شر سے بچ سکے۔ اس دنیا میں "ایک دکان" کے جلنے کو ہر حال برداشت کرنا ہے۔ یہی برداشت واحد طریقہ ہے جس کے ذریعہ بقیہ ہزاروں دکانوں کو جلنے سے بچایا جا سکتا ہے۔

۱۳ مارچ ۱۹۹۳

آج ۱۸ واں روزہ ہے۔ صبح کو فجر کی نماز کے بعد اچانک ذہن میں آیا کہ ۱۹۴۷ کے مسلم کش فساد سے لیکر ۱۹۹۳ کے بھیانک فسادات تک جس طرح ہندستانی مسلمانوں کو مارا جا رہا ہے اور تباہ کیا جا رہا ہے، وہ کسی انسان کے بس کی چیز نہیں۔ یہ یقیناً خدا کی طرف سے ہے۔ اور وہ صرف اس لئے ہے کہ مسلمان چپ ہو جائیں۔ اس کو ایک قسم کا آپریشن سائلنس

(operation silence) کہا جاسکتا ہے۔

مسلمانوں کا چپ ہونا دعوت کے مواقع کا کھلنا ہے۔ موجودہ مسلمانوں کی پُرفخر نفسیات اس میں مانع تھی کہ ان کو دلیل کے ذریعہ چپ کیا جاسکے۔ اس لئے خدا نے طاقت کے ذریعہ ان کو چپ کرنے کا انتظام فرمایا۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد بمبئی، سورت، وغیرہ میں ہونے والے بھیانک فسادات کے بعد مسلمان کافی حد تک چپ کی روش اختیار کر چکے ہیں۔ تاہم ابھی وہ مکمل طور پر چپ نہیں ہوئے ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو آخری طور پر اور پورے طور پر چپ کرنے کے لئے یہ ہوگا کہ اگلے الکشن میں بھارتیہ جنتا پارٹی کو کامیابی ملے گی۔ وہ کئی ریاستوں میں اور سنٹر میں اپنی حکومت بنالے گی۔ اس کے بعد مسلمان مکمل طور پر چپ ہو جائیں گے۔ اور پھر اسلام کی دعوت واشاعت کا عمل بھی یہاں تیزی کے ساتھ جاری ہو جائے گا۔

۱۴ مارچ ۱۹۹۲

میں دہلی میں اپنی رہائش گاہ کی چھت کے بارجہ پر تھا۔ سامنے کی سڑک پر ایک نوجوان چلتا ہوا نظر آیا۔ اچانک خیال ہوا کہ اس نوجوان کا سڑک پر چلنا کوئی سادہ واقعہ نہیں۔ یہ ایک عظیم واقعہ ہے۔ آدمی اس بارے میں سوچے تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ وہ حمد خداوندی کے احساس میں سرشار ہو جائے۔

زمین کی سطح پر چلنے کے لئے اس نوجوان کو زمین کی کشش درکار ہے جو پیشگی طور پر وہاں موجود ہے۔ ضرورت ہے کہ ہر قدم پر اس کو آکسیجن مل رہی ہو اور وہ بھی ہوا کے ذریعہ مسلسل اس کو پہنچائی جا رہی ہے۔ پھر ضرورت ہے کہ اس کے سامنے روشنی ہو تاکہ وہ اپنے راستہ کو دیکھ سکے۔ سورج یہ کام بہت بڑے پیمانہ پر مفت انجام دے رہا ہے۔ وغیرہ۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے نوجوان کو چلتے ہوئے دیکھ کر میں اپنے لئے ایک ربانی خوراک حاصل کر رہا ہوں۔ پھر سوچتے ہوئے خیال آیا کہ یہی شاید وہ چیز ہے جس کو قرآن میں رزق رب کہا گیا ہے۔ رزق کی ایک قسم وہ ہے جس کو مادی رزق کہا جاسکتا ہے۔ آدمی اناج، سبزی، پھل وغیرہ کھا کر یہ رزق اپنے لئے حاصل کرتا ہے۔ اور دوسرا روحانی رزق ہے۔

اس رزق کو آدمی بذریعہ حواس پاتا ہے۔ یعنی دیکھ کر، سن کر، پڑھ کر اور سوچ کر اسے حاصل کرتا ہے۔ اسی دوسرے رزق کے بارے میں قرآن میں یہ الفاظ ہیں کہ ورزق ربك خير وابقى۔

۱۵ مارچ ۱۹۹۳

نانی پالکھی والا انڈیا کے مشہور قانون داں ہیں۔ وہ معاشیات کے بھی ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ دبئی میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف چارٹرڈ اکاؤنٹس کے زیر اہتمام ایک میٹنگ میں انھوں نے تقریر کی۔ انڈیا کے بجٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ انڈیا کے موجودہ (۹۴ - ۱۹۹۳) میں تعلیم پر خرچ صرف تین فیصد رکھا گیا ہے۔ جب کہ سنگاپور کے موجودہ بجٹ میں تعلیم کا خرچ ۱۸٫۵ فیصد ہے۔ اور جنوبی کوریا کے موجودہ بجٹ میں تعلیم کا خرچ ۱۹ فیصد ہے (قومی آواز ۱۰ مارچ ۱۹۹۳)

اکثر مبصرین اسی قسم کی بات کرتے ہیں۔ مگر زیادہ غور طلب بات یہ ہے کہ ہمارے بجٹ میں تعلیم کے لئے جتنی رقم رکھی جاتی ہے، عملی نتیجہ اس سے بہت کم حاصل ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زیادہ اہم مسئلہ رقم کی کمی نہیں ہے بلکہ کیرکٹر کی کمی کا ہے۔ ہمارے یہاں بھرشٹاچار، اور کرپشن ہر شعبہ میں آخری حد تک گھس گیا ہے۔ اس کی موجودگی میں ہر رقم ناکافی ہے۔ ایسی حالت میں رقم میں اضافہ صرف کرپشن میں اضافہ کا باعث ہوگا۔ اس کی کھلی ہوئی مثال ڈیفنس بجٹ ہے۔ ڈیفنس بجٹ میں غیر معمولی اضافہ نے ڈیفنس کے شعبوں میں اتنا زیادہ اضافہ کیا کہ ڈیفنس منسٹر اور پرائم منسٹر تک اس میں ملوث ہو گئے، جیسا کہ بوفورس اسکینڈل سے واضح ہوتا ہے۔

۱۶ مارچ ۱۹۹۳

ابوالدرداءؓ کی ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے بارہ میں سب سے زیادہ جس چیز سے ڈرتا ہوں وہ گمراہ کرنے والے لیڈر ہیں (انی اخوف ما اخاف علیکم الائمۃ المضلون) مسند الامام احمد ۶/۴۴۱

الائمۃ المضلون پہلے بھی امت کا خطرناک عنصر تھے، موجودہ زمانہ میں پریس اور میڈیا کے

ظہور نے ایسے لوگوں کے خطرہ کو بہت زیادہ بڑھادیا ہے۔ پہلے زمانہ کے 'دجال' کی آواز صرف اس کے قریب کے لوگ سن سکتے تھے۔ آج کا 'دجال' جب چیختا ہے تو اس کی آواز مشرق و مغرب میں سنائی دیتی ہے۔

۱۷ مارچ ۱۹۹۳

لاہور کے روزنامہ وفاق (۱۰ مارچ ۱۹۹۳) میں ایک مضمون نظر سے گزرا۔ اس کا عنوان ہے: سیاسی و جنگی حکمت عملی کا ثمرہ ــــ فتح مکہ

مضمون میں بتایا گیا ہے کہ بنو خزاعہ اور بنو بکر کی آپس کی قبائلی جنگ میں قریش نے اپنے حلیف بنو بکر کا ساتھ دیا۔ یہ معاہدہ حدیبیہ کے خلاف تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان ۸ ھ میں دس ہزار صحابہ کے ساتھ مکہ پر چڑھائی کر دی اور مکہ کو فتح کر لیا۔

اس لمبے مضمون میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ یہ دس ہزار صحابہ آئے کہاں سے۔ یہ پہلو مذکورہ مضمون میں سرے سے حذف ہے۔ اس پہلو کو شامل کیا جائے تو مضمون کا عنوان ہوگا" فتح مکہ دعوتی حکمت عملی کا ثمرہ" مگر اس پہلو کو حذف کرنے کے بعد اس کا عنوان بن گیا: فتح مکہ جنگی حکمت عملی کا ثمرہ۔

۱۸ مارچ ۱۹۹۳

لاہور کے روزنامہ وفاق (۱۰ مارچ ۱۹۹۳) کے صفحہ اول پر افغانستان کے حزب اسلامی کے سربراہ اور افغانستان کے نئے نامزد وزیر اعظم گلبدین حکمت یار کی وہ تقریر چھپی ہے جو انھوں نے مدینہ میں کی۔ اس تقریر کا خلاصہ اس کے اس عنوان میں ہے: غیر مسلم طاقتیں اسلام کی تباہی کے لئے متحد ہو گئی ہیں۔ یہی بات لکھنؤ کے عربی ماہنامہ البعث الاسلامی (ذوالقعدہ ۱۴۱۳ ھ کے افتتاحیہ میں" مستقبل المسلمین فی العالم" کے عنوان کے تحت ان لفظوں میں کہی گئی ہے: یبدو ان القوی المعادیة بجمیع قطاعاتها ومعسكراتها وانظمتها مكبة على إبادة المسلمين في العالم كله (صفحہ ۲)

آج ساری مسلم دنیا میں تمام لکھنے اور بولنے والے مسلمان اسی قسم کی باتیں لکھنے اور بولنے میں مصروف ہیں۔ سب کے سب یہ اعلان کر رہے ہیں کہ غیر اسلامی طاقتیں اسلام اور مسلمانوں کی

تباہی کے لئے متحد ہو گئی ہیں۔ یہ باتیں مجھے اتنی بے معنی معلوم ہوتی ہیں کہ ان کو پڑھتے ہوئے بھی مجھ کو شرم آتی ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ لکھنے اور بولنے والوں کو آخر اس پر شرم کیوں نہیں آتی۔

۱۹ مارچ ۱۹۹۳

۲۷ جنوری ۱۹۹۲ کو کشمیر کے غلام نبی ہارون ایڈوکیٹ آئے۔ ان کے ساتھ ان کے اسسٹنٹ محمد امین بھی تھے۔ دونوں نے متفقہ طور پر کہا کہ ہندستان سے علٰحدگی کے بعد جو کشمیر بنے گا ، انشاء اللہ وہ کشمیر ہوگا۔

میں نے کہا کہ یہ سب نادانی کی باتیں ہیں۔ اس دنیا میں کسی نظام کو بنانے میں حقائق فیصلہ کن بنتے ہیں نہ کہ کسی کی خوش فہمیاں۔ میں نے کہا کہ حقائق کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہندستان سے علٰحدہ ہو کر جو آزاد کشمیر یا پاکستانی کشمیر بنے گا وہ ایک برباد کشمیر ہوگا۔ موجودہ حالات میں کشمیریوں کے لئے جو الٹس ہندستانی کشمیر یا پاکستانی کشمیر میں نہیں ہے، بلکہ ہندستانی کشمیر اور برباد کشمیر میں ہے۔

۲۰ مارچ ۱۹۹۳

آج شام ظفر الاسلام سلمہ کے یہاں مولانا شفیق احمد ندوی سے ملاقات ہوئی۔ وہ ریاض جامعۃ الملک میں استاد ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جب بابری مسجد ڈھائی گئی تو اس کے بعد وہاں کے تمام سعودی ہندستانی ، پاکستانی ہندوؤں کی سخت مذمت کرنے لگے۔ ہندوؤں کے خلاف ہینڈبل تیار کر کے تقسیم کئے گئے۔ سب کا مطالبہ تھا کہ ہندوؤں کو عرب سے نکال دیا جائے۔

۶ دسمبر کے بعد جب پہلا جمعہ آیا تو تمام مسجدوں میں امام کے خطبہ کا یہی موضوع تھا۔ شفیق صاحب نے ریاض کی جس مسجد میں نماز پڑھی وہاں امام نے اپنے آدھ گھنٹہ کے خطبہ میں ہندوؤں کو بہت زیادہ برا کہا۔ امام نے پرجوش طور پر کہا کہ گائے اور بتوں کو پوجنے والوں کو جزیرہ عرب سے نکال دو اور ان کو ان کی محتاجی کی طرف لوٹا دو (اطردوا عَبَدَةَ البقرۃ والاوثان من جزیرۃ العرب وردّوھم الی فقرھم) اس کے بعد سارے ریاض میں ہر آدمی کی زبان پر یہی جملہ تھا۔

چند دن اس قسم کی دھوم رہی۔ یہاں تک کہ ایک اسٹور میں ایک پاکستانی مسلمان آیا۔ ایک شخص کو دیکھ کر اس نے اس کا نام پوچھا۔ اس نے اپنا نام بتایا تو پاکستانی مسلمان بولا کہ اچھا، تم ہندو ہو۔ اس کے بعد چھرا نکال کر اس کے پیٹ میں بھونک دیا۔

اس کے بعد شاہ فہد کی تقریر ریڈیو پر آئی۔ انھوں نے کہا کہ آجکل ایسی باتیں کہی جا رہی ہیں جس سے لوگوں میں اشتعال پیدا ہو۔ اگر کسی کو کوئی شکایت ہے تو اس کو چاہئے کہ ہم سے آکر براہ راست کہے۔ سڑکوں پر یا عوام کے درمیان اشتعال انگیز باتیں نہ پھیلائی جائیں۔ اس تقریر کے فوراً بعد ہر آدمی خاموش ہوگیا۔ اگلے جمعہ کو ائمہ نے خطبہ دیا تو ان کی زبان بالکل بدلی ہوئی تھی۔ اب صرف اخلاق اور آخرت کی باتیں تھیں۔ اب نہ بابری مسجد کا کوئی ذکر تھا اور نہ انڈیا کے ہندوؤں کا۔

۲۱ مارچ ۱۹۹۲

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ زانی کو کوڑے مارو اور چور کا ہاتھ کاٹ دو، مگر تمام علماء اور فقہاء متفق ہیں کہ اس حکم کا تعلق حکومت سے ہے نہ کہ عوام سے۔ ٹھیک اسی طرح جہاد کرو، یا قتال کرو کا حکم بھی ایک قائم شدہ حکومت سے تعلق رکھتا ہے۔ عام مسلمان اگر اٹھ کر مار کاٹ کرنے لگیں تو وہ شرعی معنوں میں جہاد وقتال ہرگز نہیں ہوگا۔

والنوع الثالث من الفروض الكفائية ما يشترط فيه الحاكم مثل الجهاد واقامة الحدود (الہداية السابق، فقہ السنة ۳۰/۲)

اور تیسری قسم فرض کفایہ کی وہ ہے جس میں حاکم کا ہونا شرط ہے، جیسے کہ جہاد اور حدود کا نفاذ

موجودہ زمانہ میں کشمیر اور دوسرے بہت سے مقامات پر مسلمان حکومت کے بغیر جہاد وقتال میں مصروف ہیں۔ یہ تمام سرگرمیاں حقیقةً سرکشی ہیں نہ کہ جہاد اسلامی۔

۲۲ مارچ ۱۹۹۲

ایک میٹنگ میں مسٹر مدھو ہتا نے کہا کہ وی پی سنگھ نے اپنی سرکار کے زمانہ میں دیش کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا۔ سوامی چید انند نے فوراً اس میں اضافہ کیا، اس سے بھی زیادہ نقصان جتنا مسلمانوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں ہزار سال میں پہنچایا تھا۔

ہندوؤں کے بڑے طبقہ میں اس قسم کے معاندانہ خیالات پائے جاتے ہیں۔ اس کو دور کرنے کے لئے مسلمان اب تک دفاع کا انداز اختیار کرتے رہے ہیں۔ وہ مسلم عہد حکومت کو بہتر عہد حکومت ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ مگر ہندوؤں کی غلط فہمی میں ایک فیصد بھی کمی نہ ہوسکی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ کا حل دفاع نہیں ہے بلکہ اعتراف ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ صاف طور پر کہہ دیں کہ ہندستان کے مسلم حکمراں اسلام کے نمائندہ نہ تھے۔ حکمرانوں کے عمل سے اسلام کو جانچنا نہیں چاہئے بلکہ اسلام کے ذریعہ حکمرانوں کو جانچنا چاہئے۔ یہی وہ روش ہے جو ہندوؤں کے دل سے اسلام اور مسلمانوں کی نفرت کو نکال سکتی ہے۔

۲۳ مارچ ۱۹۹۳

۱۷ مارچ ۱۹۹۳ کو میں ناگپور میں تھا۔ وہاں میری ملاقات ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے ہوئی۔ وہ مہاراشٹر کی اسٹیٹ ٹریبونل کے چیرمین ہیں جو پوری ریاست کے تمام سرکاری ملازمین کے مقدمات کی سماعت کے لئے مقرر ہے۔ اس کا صدر دفتر بمبئی میں ہے اور شاخیں مہاراشٹر کے کئی شہروں میں قائم ہیں۔ ان کا رینک ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کا ہے۔ ان کو تقریباً بارہ ہزار روپیہ ماہوار ملتے ہیں۔ رہائش گاہ، ایر کنڈیشنڈ کار وغیرہ اس کے علاوہ ہیں۔ ۱۹۹۲ میں وہ جج کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے تھے۔ جنوری ۱۹۹۳ سے ان کا تقرر موجودہ سرکاری عہدہ کے لئے ہوا ہے۔

گفتگو کے دوران وہ ایک گھنٹہ تک مسلمانوں کے خلاف ظلم اور تعصب کی شکایت کرتے رہے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمان ہریجن بنا کر رکھ دئے گئے ہیں۔ سرکاری ملازمتوں سے ان کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ وغیرہ۔ خود انھیں جو اعلیٰ عہدہ حاصل ہے اس کا شکر انھوں نے ایک بار بھی نہیں کیا۔

یہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا عام انداز ہے۔ ان کی سوچ تمام تر منفی واقعات پر مرتکز رہتی ہے۔ مثبت واقعات پر وہ کبھی غور نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے تمام مسلمان شکر کے جذبہ سے خالی ہو گئے ہیں۔ وہ صرف شکایت کے جذبہ سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

۲۴ مارچ ۱۹۹۳

۱۲ مارچ ۱۹۹۳ کو بمبئی میں کچھ مسلمانوں نے تیرہ مقامات پر بم دھاکہ کیا۔ بڑی بڑی بلڈنگیں کھنڈر ہوگئیں۔ تین سو سے زیادہ آدمی مارے گئے۔ ایک ہزار سے زیادہ زخمی ہوگئے۔ ۱۸ مارچ کو ناگپور میں محمد حنیف صاحب اور عبد السلام صاحب سے اس پر گفتگو ہوئی۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بہت اچھا ہوا۔ اب ہندو ٹھیک ہو جائیں گے۔ ان لوگوں نے مزید کہا کہ اب بی جے پی کا مستقبل اس ملک میں ختم ہوگیا۔ ان کے لئے اب حکومت بنانے کا کوئی چانس نہیں۔

میری رائے اس کے برعکس تھی۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں کی طرف سے اس طرح بمبئی میں اور دوسرے مقامات پر بم بلاسٹ کے بعد اب تقریباً یقینی ہوگیا ہے کہ اگلے الکشن میں بھارتیہ جنتا پارٹی جیتے گی اور سنٹر میں حکومت بنائے گی۔

۲۵ مارچ ۱۹۹۳

جماعت اسلامی ہند کے تحت ایک سہ ماہی مجلہ "تحقیقات اسلامی" علی گڑھ سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے شمارہ اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۸۸ میں ایک مقالہ ابن تیمیہ کے مسلک کے بارہ میں چھپا ہے۔ اس میں درج ہے کہ "خروج حسین کے بارہ میں ان کا مسلک یہ ہے کہ یزید بن معاویہ کی بیعت کے انعقاد کے بعد کسی کے لئے بھی حکومت وقت کے خلاف خروج کرنا جائز نہیں تھا۔ وہ اصولی طور سے شورش وخروج، انقلاب وبغاوت اور تشدد آمیز طریقوں سے تبدیلی حکومت کو حرام قرار دیتے ہیں۔ کیوں کہ اس کے سبب فوائد کے بجائے نقصانات اور تعمیر کی جگہ تخریب عموماً پیدا ہوتی ہے (صفحہ ۴۸)

اسی اصول کو میں نے سید قطب اور سید ابو الاعلیٰ مودودی پر منطبق کیا تو الاخوان المسلمون اور جماعت اسلامی دونوں میرے دشمن ہوگئے۔ کسی بات کو اصولی طور پر بیان کیا جائے تو لوگ غصہ نہیں ہوتے لیکن اگر اس اصول کو ان کی محبوب شخصیتوں پر چسپاں کیا جائے تو فوراً وہ مشتعل ہوجاتے ہیں۔ اسی کا نام شخصیت پرستی ہے۔

۲۶ مارچ ۱۹۹۳

السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا (۶۔ ۱۲ مارچ) میں ایل کے ایڈوانی اور جے دو باشی کے انٹرویو

چھپے ہیں۔ ایڈوانی نے بھارتیہ جنتا پارٹی کے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ہم کلچرل نیشنلزم کی حمایت کرتے ہیں :

We will advocate cultural nationalism

مسٹر جے دوباشی نے اسی بات کو ان لفظوں میں کہا کہ —— انڈیا میں قومی تشخص صرف ہندو ہوسکتا ہے :

In India, the national identity can only be Hindu. (p. 30)

مسلمان اس قسم کی باتوں کو سن کر یا پڑھ کر مشتعل ہو جاتے ہیں اور اس کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے نزدیک اس کا واحد موثر جواب، حضرت عمر کے الفاظ میں یہ ہے کہ اس کا کوئی جواب نہ دیا جائے (امیتو الباطل بالصمت عنه)

۲۷ مارچ ۱۹۹۳

اس دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں دن بھی آتا ہے اور رات بھی۔ یہ گویا ایک بے حسی کی علامت ہے جو یہ بتاتی ہے کہ اس دنیا کا خدا ایک مہربان خدا ہے۔ جب آدمی کے اوپر رات کا اندھیرا چھائے تو اس کو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ کیوں کہ خدا اگر رات لاتا ہے تو اسی کے ساتھ اس نے اس کا بھی لازمی انتظام کر رکھا ہے کہ رات کے بعد یہاں روشن صبح آدمی کے اوپر نمودار ہو۔ اس دنیا میں اگر ایک دن گرمی کا موسم ہے تو اس کے بعد یہاں برسات کی ٹھنڈی ہوائیں بھی اس کے ساتھ چلی آرہی ہیں —— فطرت کا یہ نظام بتاتا ہے کہ یہ دنیا امیدوں کی دنیا ہے۔ یہ مایوسیوں کی دنیا نہیں۔

۲۸ مارچ ۱۹۹۳

ایک عیسائی خاتون نے اسلام قبول کرلیا ہے۔ ان کا موجودہ نام زرینہ ہے۔ وہ گل مہر پارک (نئی دہلی) میں رہتی ہیں۔ ان کا ٹیلیفون نمبر یہ ہے : 668568 وہ مسلمانوں کی اخلاقی حالت سے بیزار ہیں۔ مگر اسلام کی اصولی حیثیت سے متاثر ہو کر انھوں نے عیسائیت کو چھوڑا اور اسلام کو اختیار کرلیا۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ ایک شخص مسلمانوں کا انکار کرسکتا ہے۔ مگر وہ اسلام کا انکار نہیں کرسکتا۔

You can deny Muslims,
but you cannot deny Islam.

۲۹ مارچ ۱۹۹۳

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو اجودھیا کی بابری مسجد کو ہندوؤں کے ایک ہجوم نے ڈھا دیا تھا۔ اس کے بعد ساری مسلم دنیا میں فریادی مضامین شائع کئے گئے۔ ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ ۲۳ دسمبر ۱۹۹۲ میں اس کے اڈیٹر نے لکھا کہ اس وقت انڈیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بہت بڑے منصوبہ کے تحت ہو رہا ہے۔ اس کی حد بابری مسجد کو ڈھانا نہیں ہے۔ حتی کہ تین ہزار مسجدیں بھی نہیں۔ اس کا آخری نشانہ یہ ہے کہ برصغیر ہند سے اسلامی وجود کو مٹا دیا جائے:

مايحدث فی الهند اليوم هومخطط كبير ليست نهايته هدم البابری ا وحتیٰ ثلاثة آلاف مسجد آخر تنتظر الهدم ولٰكن الهدف وهو الوجود الاسلامی فی القارة الهندية كلها۔

میں جب اس قسم کی باتیں پڑھتا ہوں تو مجھ کو یہ حدیث یاد آتی ہے کہ: من کان یؤمن باللّٰہ و الیوم الآخر فلیقل خیراً او لیصمت۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کو بولنا نہیں آتا۔ اس کے باوجود وہ چپ رہنے کے لئے بھی تیار نہیں۔

۳۰ مارچ ۱۹۹۳

قرآن میں ہے کہ عسر کے ساتھ یسر ہوتا ہے۔ یعنی مسئلہ کے ساتھ ہمیشہ حل بھی موجود رہتا ہے۔ ایسی حالت میں زیادہ بڑی بات یہ نہیں کہ آگ جلاتی ہے۔ اس سے زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ یہاں پانی ہے جس سے ہم آگ کو بجھا سکتے ہیں۔ زیادہ بڑی بات یہ نہیں کہ جسم کو زخم لگتا ہے۔ زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ جسمانی نظام زخم کا اندمال کرتا ہے۔ زیادہ بڑی بات یہ نہیں کہ درخت کے پتے جھڑتے ہیں۔ زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ اس میں دوبارہ نئی پتیاں نکل آتی ہیں۔ یہاں مسئلہ کا ہونا زیادہ بڑی بات نہیں، زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ ہر مسئلہ کے ساتھ اس کا حل بھی ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ دنیا مسائل کا مجموعہ ہے مگر اہم تر بات یہ ہے کہ ہر مسئلے کا حل بھی پیشگی طور پر یہاں رکھ دیا گیا ہے۔

۳۱ مارچ ۱۹۹۳

ایک مسلمان بزرگ نے کہا کہ آپ اپنے رسالہ میں اکثر صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ آخر یہ صبر کب تک۔ میں نے کہا کہ اس کا جواب دینے سے پہلے میں خود آپ سے ایک سوال کرتا ہوں۔ اسلام میں پانچ وقت نماز پڑھنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ ایک شخص آپ سے کہے کہ آخر یہ پانچ وقت کی نماز کب تک، تو آپ اس کو کیا جواب دیں گے۔ انھوں نے کہا کہ میں ایسے شخص سے کہوں گا کہ نماز تو ایک عبادت ہے۔ اس کو ساری زندگی ادا کرنا ہے، یہاں تک کہ آدمی کی موت آجائے۔

میں نے کہا کہ آپ کے سوال کے بارہ میں میرا یہی جواب ہے۔ صبر بھی ایک عبادت ہے۔ ہر آدمی کو اسے آخر وقت تک انجام دینا ہے۔ موت سے پہلے یہ حکم کسی سے رفع نہیں ہوتا۔ آدمی جس طرح نماز اللہ کے لئے پڑھتا ہے اسی طرح وہ صبر بھی اللہ کے لئے کرتا ہے۔ قرآن میں نماز کے لئے جس طرح ہے کہ فَصَلِّ لِرَبِّكَ، اسی طرح قرآن میں صبر کے لئے ہے کہ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ

یکم اپریل ۱۹۹۳

پہلی جنگ عظیم کے زمانہ میں جب ترکی کی عثمانی خلافت ختم ہو رہی تھی تو اس کے بچانے کے لئے برصغیر ہند میں زبردست قسم کی جذباتی تحریک شروع کی گئی۔ یہ کہا جانے لگا کہ اگر عثمانی سلطنت ختم ہوئی تو اس کے بعد ملت اسلامیہ کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اسی زمانہ میں شبلی نعمانی نے کہا تھا:

زوال دولت عثماں زوال شرع وملت ہے — عزیز و فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک

اس کے تقریباً ۸۰ سال بعد دوبارہ یہی الفاظ اجودھیا کی بابری مسجد کے بارہ میں بولے جانے لگے۔ تمام مسلمان یہ کہنے لگے بابری مسجد ملت اسلامیہ ہند کے وجود وبقاء کی علامت ہے۔ اگر بابری مسجد نہ رہی تو اس ملک میں مسلم ملت بھی باقی نہ رہے گی۔ مگر مسلمانوں کے تمام شور وغوغا کے باوجود ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد ڈھادی گئی۔

ترکی کی عثمانی خلافت کے خاتمہ کے بعد بھی ملت اسلامیہ باقی رہی اور اجودھیا کی بابری مسجد کے خاتمہ کے بعد بھی ملت اسلامیہ باقی ہے۔ یہ واقعہ ثابت کرتا ہے موجودہ زمانہ کے

مسلمان لیڈر ایک ایسے کام کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے جس کے لئے وہ سراسر نااہل تھے۔

۲ اپریل ۱۹۹۳

ایک ندوی ریاض کی جامعۃ الامام میں اردو شعبہ کے استاد ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جب اجودھیا کی بابری مسجد ڈھادی گئی تو اس کے بعد آنے والے پہلے جمعہ (۱۱ دسمبر) کو ریاض کی مسجدوں میں وہاں کے اماموں نے جمعہ کے خطبوں میں پرجوش تقریریں کیں۔ مذکورہ ندوی نے ریاض کی جس مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی اس کے امام نے اپنے خطبہ میں ۶ دسمبر کے واقعہ کی شدید مذمت کرتے ہوئے ہندوؤں کے بارہ میں کہا: اطردوا عَبَدَۃ البقرۃ و الاوثان من جزیرۃ العرب و ردوھم الی فقرھم (گائے اور بتوں کے پوجنے والوں کو جزیرہ عرب سے بھگادو اور ان کو ان کی غریبی کی طرف لوٹادو۔)

چند دن اس قسم کی باتوں کا ریاض میں خوب چرچا رہا۔ ہر مجلس میں، ہر ملاقات میں لوگ یہی باتیں کر رہے تھے۔ اس کے بعد شاہ فہد کی تقریر ٹی وی پر آئی۔ انھوں نے کسی کا نام لئے بغیر یا براہ راست اس کا حوالہ دئے بغیر کہا کہ اگر لوگوں کو کچھ شکایتیں ہیں تو وہ آکر مجھ سے اپنی شکایتیں بتائیں۔ اِدھر اُدھر کا چرچا کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس تقریر کے فوراً بعد تمام لوگوں کی زبانیں بند ہوگئیں۔ اگلے جمعہ کے خطبہ میں اس کا کوئی ذکر نہ تھا۔ اماموں نے حسب معمول اخلاق اور آخرت کی باتیں کیں اور اس کے بعد تمام نمازی خاموشی سے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

میں نے کہا کہ مسلمان جس طرح سعودی عرب میں ایڈجسٹ کرکے رہتے ہیں، اسی طرح اگر انڈیا میں ایڈجسٹ کرکے رہنے لگیں تو یہاں کل ان کو اسی طرح امن حاصل ہو جائے جس طرح انھیں سعودی عرب میں امن ملا ہوا ہے۔

۳ اپریل ۱۹۹۳

۳ اپریل کو میں بمبئی میں تھا۔ ایک صاحب جو بابری مسجد ایکشن کمیٹی میں شریک تھے، انھوں نے میرے تین نکاتی فارمولا پر تنقید کی۔ انھوں نے کہا کہ اس سے مسئلہ ختم ہونے والا نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ جیسے لوگ ڈبل اسٹنڈرڈ ہیں۔ آپ بابری مسجد تحریک کو بھیڑ سے ناپتے

ہیں اور میرے فارمولا کو رزلٹ سے ناپ رہے ہیں۔ آپ کو چاہئے کہ آپ دونوں ہی کو رزلٹ کے پیمانہ سے ناپیں۔ اس کے بعد آپ دونوں کے بارہ میں منصفانہ رائے قائم کر سکیں گے۔

۱۴ اپریل ۱۹۹۳

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۲۱ جنوری ۱۹۹۳) میں اس کے مدیر کے قلم سے ادارتی نوٹ بمبئی کے حالیہ فساد کے بارہ میں ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ گائے کو پوجنے والے ہندوان مسلمانوں پر مجرمانہ حملے کر رہے ہیں جن کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ کلمۂ توحید کا اقرار کرتے ہیں۔ (ان عباد البقرمن الهندوس قاموا بحملة اجرامية لتطهير بومباي ..... من اهلها وشعبها الذي يقول: لا اله الا الله محمد رسول الله)

مسلم اخبارات ورسائل اکثر اسی قسم کی بات لکھتے رہتے ہیں، مگر وہ سراسر غلط ہے۔ ہندوؤں کو جو کچھ عناد ہے وہ مسلمانوں سے ہے نہ کہ اسلام سے۔ اگر کوئی قوم محض کلمۂ توحید کی بنا پر کسی گروہ کو ستانا چاہے تو وہ ستانے پر قادر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ قرآن سے ثابت ہے کہ سچے ایمان والے کبھی اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں زیر نہیں ہو سکتے۔

۱۵ اپریل ۱۹۹۳

ریاض کے عربی ماہنامہ الفیصل (مارچ ۱۹۹۳) میں مصر کے ایک یہودی کے قبول اسلام کا قصہ چھپا ہے۔ اس کا نام زکی عُریبی تھا۔ وہ عربی زبان سے واقف تھا۔ اس نے سیرت رسول پر عربی کتابیں پڑھیں۔ ان سے متاثر ہو کر اس نے اپریل ۱۹۶۰ میں اسلام قبول کر لیا (صفحہ ۶۴ - ۶۵)

اسی طرح اور کئی افراد نے اسلام قبول کیا ہے جو یہودی خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ مثلاً لیوپولڈ اسد اور مریم جمیلہ وغیرہ۔ ان افراد نے کسی تبلیغ کے بغیر تمام تر ذاتی مطالعہ کی بنیاد پر اسلام قبول ہے۔

مسلمان عام طور پر یہودیوں سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ وہ ان کو اسلام کا ابدی دشمن سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر پیدا ہونے والا پہلے انسان ہے۔ اس کے بعد وہ یہودی یا کچھ اور ہے۔ جب کسی تبلیغ کے بغیر اتنے یہودی نے اسلام قبول کر لیا تو یقینی ہے کہ اگر تبلیغ

کی جاتی تو ان میں سے بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہو جاتے اور عین ممکن ہے کہ اس کے بعد فلسطین کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا۔

۱۶ اپریل ۱۹۹۳

نیشنل بک ٹرسٹ (نئی دہلی) کی طرف سے ایک خط موصول ہوا ہے۔ اس پر اس کے ڈائرکٹر مسٹر اروند کمار کا دستخط ہے۔ اس میں ۸ اپریل کی ایک میٹنگ میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ اس میٹنگ میں اس تجویز پر غور ہوگا کہ اسپریچول ریڈر (Spiritual Reader) کے نام سے ایک کتاب تیار کی جائے جو ہائی اسکول کے طلبہ کو دی جاسکے۔

کتاب کا یہ نام (اسپریچول ریڈر) مجھے بہت پسند آیا۔ مذکورہ کتاب سرکاری انداز میں تیار کی جائے۔ میرا خیال ہے کہ میں اسی نام سے ایک دعوتی کتاب انشاء اللہ تیار کروں۔ اس میں اسلامی نقطۂ نظر سے روحانی انسان بنانے کے مسئلہ پر گفتگو کی گئی ہو۔

۱۷ اپریل ۱۹۹۳

دہلی کے مسٹر ششی بھوشن (Tel. 666071) نے بتایا کہ یکم اپریل ۱۹۹۳ کو رام نومی کا جلوس دہلی میں نکلا۔ وہ ترکمان گیٹ پر پہنچا جو مسلمانوں کا علاقہ ہے۔ وہاں جلوس میں شامل ہندو نوجوان اشتعال انگیز نعرے لگانے لگے۔ مثلاً:

جب کٹوے کاٹے جائیں گے وہ رام رام چلائیں گے

جلوس والے اپنے ہاتھ میں ہاکی اور ڈنڈے لئے ہوئے تھے۔ بظاہر وہ مسلمانوں کو مشتعل کرنا چاہتے تھے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ مسلمان مشتعل ہو کر کوئی جارحانہ کارروائی کریں گے پھر انھیں فساد کرنے کا موقع مل جائے گا۔ مگر مسٹر ششی بھوشن نے دیکھا کہ مسلمان اس قسم کے نعروں کو سن کر مسکرا رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلوس ختم ہوگیا اور کوئی فساد نہیں ہوا۔

میں نے کہا کہ فرقہ وارانہ فساد کو روکنے کا یہی سب سے زیادہ کارگر طریقہ ہے۔ یعنی اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہونا۔ جو فساد ایک مسکراہٹ سے ٹل سکتا ہو اس پر غصہ ہونے اور ٹکراؤ کرنے کی کیا ضرورت۔

۸ اپریل ۱۹۹۳

کے آر ملکانی (وائس پریسیڈنٹ بھارتیہ جنتا پارٹی) کا ایک مضمون ٹائمس آف انڈیا (۸ فروری ۱۹۹۳) میں چھپا تھا۔ اس کے جواب میں میرا ایک مضمون اسی اخبار کے شمارہ ۲۵ مارچ ۱۹۹۳) میں شائع ہوا۔ اب آج کے ٹائمس آف انڈیا میں مسٹر ملکانی کا ایک خط چھپا ہے جس میں انھوں نے دوبارہ میرا جواب دیا ہے۔

مسٹر ملکانی نے کامن سول لا (Common Civil Law) کی حمایت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ــــ اس کے علاوہ مسلم قانون ہندو سماج پر بھی مضر اثرات ڈالنے کا سبب بن رہا ہے۔ ایسے واقعات ہیں کہ ہندوؤں نے صرف اس لیے اسلام قبول کرلیا تاکہ وہ اپنے لئے دوسری بیوی حاصل کرسکیں :

> Besides, the Muslim law is not without its adverse effect on Hindu society. There have been cases of Hindus embracing Islam just to take a second wife.

مسٹر ملکانی کا یہ بیان بتاتا ہے کہ کامن سول کوڈ کے لئے ہندو صاحبان کا اتنا زیادہ اصرار کیوں ہے۔ اس میں انھیں یہ خطرہ نظر آتا ہے کہ بہت سے ہندو صرف ازدواجی مقصد کے تحت اسلام قبول کرلیں گے۔ کیوں کہ دوسری بیوی کی اجازت ہندو قانون میں نہیں۔ جب کہ اسلامی قانون اس کی اجازت دیتا ہے۔

۹ اپریل ۱۹۹۳

تبلیغی جماعت کے کچھ لوگ آئے۔ انھوں نے کسی قدر پر فخر لہجہ میں کہا کہ ہم نے دس آدمیوں کی ایک جماعت قیامت تک کے لئے نکالی ہے۔ وہ پیدل چلتی رہے گی۔ ان میں سے کوئی آدمی جب کم ہوگا تو دوسرا آدمی ان کے ساتھ شامل ہوجائے گا۔ اس طرح وہ قیامت تک چلتی رہے گی۔

مجھے یہ بات لغو معلوم ہوئی۔ اس پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ تبلیغی جماعت کا کام ایک مفید کام ہے۔ مگر وہ عوام کی اصلاح کا ایک کام ہے۔ اس طرح کا کام قیامت تک بھی چلتا رہے تو اس سے اسلام کی نئی تاریخ بننے والی نہیں۔ اسلام کی نئی تاریخ بنانے کے لئے خواص

میں کام کرنا ہوگا۔ مگر تبلیغی جماعت کا کام فضائل کی بنیاد پر چل رہا ہے جب کہ خواص کا معاملہ یہ ہے کہ وہ دلائل سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تبلیغ ابھی تک خواص میں نفوذ حاصل نہ کر سکی۔ میری یہ بات تبلیغ والوں کو پسند نہیں آئی۔ کیوں کہ وہ لوگ تبلیغ کو کلی کام سمجھ رہے ہیں۔

اس وقت جناب ثناء اللہ کشمیری بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ذہین ہیں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ تبلیغ والوں کے جانے کے بعد انھوں نے کہا کہ آپ نے خواص کی بات عوام میں کہی۔ ایسا انداز اختیار کرنے سے دو نقصان ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ آدمی کے اندر مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے لہجہ میں کرختگی آجاتی ہے۔

۱۰ اپریل ۱۹۹۳

مہاتما گاندھی کے ایک لڑکے نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ لڑکا کچھ بگڑ گیا تھا۔ گاندھی جی کو اس بارہ میں بتایا کہ ان کا تاثر پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: میں اسلام کا آبھاری رہوں گا اگر اسلام میرے ایک بگڑے ہوئے لڑکے کو سدھار دے۔

۱۱ اپریل ۱۹۹۳

اندرے گائڈ (Andre Gide) ایک فرانسیسی رائٹر ہے۔ وہ ۱۸۶۹ء میں ویلس میں پیدا ہوا اور ۱۹۷۰ء میں روم میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا ایک قول انگریزی میں اس طرح نقل کیا گیا ہے کہ ہر بات کہی جا چکی ہے۔ مگر چونکہ لوگ سنتے نہیں اس لئے ہم کو دوبارہ اسے کہنا چاہئے:

Everything has been said already; but as nobody listens, we must always begin again.

اکثر لوگوں کا دماغ پیشگی طور پر کچھ باتوں سے بھرا ہوتا ہے۔ وہ ان باتوں سے الگ ہو کر کسی بات کو سن نہیں پاتے اس لئے وہ کسی بات کو سمجھ بھی نہیں پاتے۔ کوئی اور بات ان کے شعور کا حصہ نہیں بنتی۔

۱۲ اپریل ۱۹۹۳

۱۱۔ ۱۲ اپریل کو میں پٹنہ میں تھا۔ ۱۲ اپریل کی شام کو جب میں وہاں سے روانہ

ہوا تو کچھ مسلمان جو میری آخری مجلس میں اکٹھا ہو گئے تھے، انھوں نے کہا کہ ہمارے لئے آپ کی نصیحت کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میری نصیحت یہ ہے کہ ہندو سے محبت کیجئے۔ ہندو کی بھلائی کے لئے دعا کیجئے۔ ہندو کو آپ نے بٹوارہ کر کے غصہ دلایا ہے، اس لئے اگر آپ کو محسوس ہو کہ ہندو کوئی زیادتی کر رہا ہے تب بھی اس کو نظر انداز کر دیجئے۔ یک طرفہ طور پر اس کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کیجئے۔ یہ بات مسٹر ایم ٹی خان کے مکان پر ہوئی۔

۱۳ اپریل ۱۹۹۳

الرابطة الاسلامية الكويتية کی طرف سے ایک عربی مجلہ منبر الحرية شائع ہوتا ہے۔ اس کے شمارہ ۲۰ رجب ۱۴۱۳ھ (۲۵ جنوری ۱۹۹۳) میں صفحہ ۱۸ پر ایک مضمون ہے جو اس کے مستقل کالم شئون المسلمين في العالم کے تحت چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے: هل من معتصم۔

اس میں بتایا گیا ہے کہ آج ساری دنیا میں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے۔ حتی کہ عورتوں کی بے حرمتی کی جا رہی ہے۔ ایک وقت تھا کہ ایک مسلم خاتون کو بے حرمت کیا گیا تو اس نے چلا کر کہا: یامعتصماه۔ اس کے جواب میں مسلمانوں کا لشکر اس کی مدد کے لئے دوڑ پڑا۔ آج دسیوں ہزار مسلم خواتین کو بے آبرو کیا گیا ہے، پھر کیا کوئی معتصم ہے (وهاقد انتهك عرض عشرات الآلاف منهن اليوم فهل من معتصم)

آجکل مسلمانوں کے تمام مجلات اسی قسم کی باتوں سے بھرے رہتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ ایسے مضامین کیوں لکھتے ہیں۔ اگر وہ اپنے کہنے میں سنجیدہ ہوں تو انھیں خود معتصم کا رول ادا کرنے کے لئے میدان عمل میں کود پڑنا چاہئے۔ اور اگر وہ کوئی عمل کرنے کے قابل اپنے کو نہیں سمجھتے تو اپنے گھر میں چپ رہ کر مسلمانوں کے حق میں دعا کریں۔

۱۴ اپریل ۱۹۹۳

برہمن واد کے مطابق، اونچ نیچ کا تعلق ذات سے ہے۔ بدھ ازم نے اس کے مقابلہ میں شخصی اوصاف پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ بادشاہ اس کو بنایا جائے جو اعلیٰ شخصی صلاحیت رکھتا ہو نہ کہ وہ چھتری خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔ اسی طرح مذہبی پیشوائی بھی برہمن

کا حصہ نہیں ہے بلکہ اعلیٰ اخلاقی اوصاف رکھنے والے کا حصہ ہے۔ انھوں نے برہمن ازم کے ورن کے تصور کو کمتر اخلاقی نظام (lower moral order) کہا اور اپنے تصور کو برتر اخلاقی نظام (higher moral order) بتایا (3/989)

چھٹی صدی عیسوی میں انڈیا کے برہمنوں نے یہاں کے راجاؤں کی مدد سے بدھزم کے خلاف زبردست تحریک چلائی۔ انھوں نے بدھسٹوں کو مارا۔ انھیں ملک سے بھگایا۔ ان کی عبادتگاہوں کو ڈھایا۔ ان کے ایک ایک نشان کو مٹانے کی کوشش کی (3/407) اس کا سبب یہ تھا کہ بدھزم اس ملک میں ذات کے خلاف مہم (anti-caste crusade) چلا رہا تھا۔ لیکن رزلٹ کے اعتبار سے دیکھئے تو اس کے بعد جو ہوا وہ یہ کہ بدھزم انڈیا سے نکل کر ایک عالمی مذہب بن گیا۔

۱۵ اپریل ۱۹۹۳

بھارتیہ جنتا پارٹی اور وشو ہندو پریشد کی قیادت میں دو لاکھ ہندو اجودھیا میں جمع ہوئے۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو انھوں نے بابری مسجد کو ڈھا دیا۔ اس کی ایک ایک اینٹ اٹھالے گئے۔ اور اس کی جگہ پر ایک عارضی مندر بنادیا جہاں روزانہ درشن اور پوجا ہو رہی ہے۔ مسلمانوں کا عام طور پر کہنا ہے کہ ہندوؤں کی جماعتیں، یوپی کی ریاستی حکومت اور خود دہلی کی مرکزی حکومت اس منصوبہ میں شریک تھی۔ سب کی ملی بھگت سے یہ کام انجام پایا ہے۔

ایسی حالت میں اگر بابری مسجد کے لئے کچھ کرنا ہے تو خود مسلمانوں کو کرنا ہے مگر عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کے نام نہاد قائدین دوبارہ حکومت کے نام مطالباتی بیانات جاری کرنے میں مشغول ہیں۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا ایک وفد دہلی میں جمع ہوا۔ ۵ اپریل ۱۹۹۳ کو وہ وزیر اعظم نرسمہا راؤ سے ملا۔ اس کی قیادت مولانا ابوالحسن علی ندوی کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے وزیر اعظم سے مطالبہ کیا کہ بابری مسجد دوبارہ اس کی سابقہ جگہ پر بنائی جائے۔

میں نے کچھ مسلمانوں سے کہا کہ یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ بابری مسجد کے مسئلہ میں اب مسلمانوں کے لئے دو میں سے ایک صورت باقی رہ گئی ہے۔ یا تو وہ صبر کرکے چپ ہو جائیں۔ یا اقدام کرکے اجودھیا میں داخل ہوں اور جان پر کھیل کر مندر کو توڑیں اور مسجد کو دوبارہ بنائیں۔ مطالبہ اور اخباری بیان تو ایک بے معنی بات ہے۔ مسلمانوں کے لئے یہاں دو میں سے ایک کا

آپشن (option) لینے کا موقع ہے۔ مگر وہ تھرڈ آپشن لینا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ تھرڈ آپشن محض ایک مسخرہ پن ہے۔ موجودہ صورت میں وہ سرے سے کوئی آپشن ہی نہیں۔

۱۶ اپریل ۱۹۹۳

اسلام کا ایک اصول یہ ہے کہ کوئی بظاہر اچھا کام بھی اس وقت نہیں کیا جائے گا جب کہ عملی طور پر اس سے ایک برا نتیجہ نکلنے والا ہو۔ یہ اصول قرآن کی سورۃ الانعام (آیت ۱۰۸) سے اخذ کیا گیا ہے۔

اِس اصول کے مطابق، کشمیر اور بوسنیا میں آزادی کی تحریک اٹھانا غیر اسلامی تھا۔ کیوں کہ اس کے نتیجے میں جو چیز ملنے والی تھی وہ آزادی نہیں تھی بلکہ جان و مال کی غیر معمولی تباہی تھی۔ اِس طرح مصر اور الجزائر میں اسلامی حکومت کی تحریک چلانا غیر اسلامی تھا۔ کیوں کہ اس تحریک سے اسلام کی حکومت قائم ہونے والی نہیں تھی بلکہ اس کا نتیجہ اس صورت میں نکلنے والا تھا کہ مسلم آبادی حکمراں طبقہ اور غیر حکمراں طبقہ میں بٹ کر آپس میں ایک دوسرے کو ہلاک کرنے لگیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمان ہر جگہ اسلام کے نام پر ایسے کام کر رہے ہیں جو ان کے لئے (Counter productive) ثابت ہو رہا ہے۔ یہ واضح طور پر اسلام کی خلاف ورزی ہے۔ جب ان کے نام نہاد اسلامی عمل کا الٹا نتیجہ سامنے آتا ہے تو اس کے بعد وہ مزید سرکشی یہ کرتے ہیں کہ اپنی غلطی کا اعتراف کر کے واپس نہیں لوٹتے بلکہ اس کو دوسروں کا ظلم بتا کر لفظی فریاد و احتجاج میں مشغول ہو جاتے ہیں جس کا دوبارہ کوئی نتیجہ ان کے حق میں نکلنے والا نہیں۔

۱۷ اپریل ۱۹۹۳

آج نئی دہلی (لا انسٹی ٹیوٹ) میں ہندو دانش وروں کی ایک میٹنگ میں شریک ہوا۔ اس کا مقصد "نیشن بلڈنگ" کے سوال پر غور کرنا تھا۔ کچھ لوگوں نے یہ کہہ کر مایوسی کا اظہار کیا کہ ہمارے پاس آج گاندھی اور جے پرکاش جیسا کوئی آدمی نہیں۔

میں نے کہا کہ گاندھی اور جے پرکاش کی زندگی کے دو حصے تھے۔ گاندھی کی زندگی کا ایک حصہ وہ ہے جو ۱۹۴۷ سے پہلے کا ہے۔ اس وقت انھوں نے اینٹی برٹش تحریک چلائی۔ دوسرا حصہ وہ ہے جب کہ ملک آزاد ہو گیا اور دیش میں کانگرس کی حکومت قائم ہو گئی۔ واقعات بتاتے ہیں کہ پہلے مرحلہ میں گاندھی کی ہر طرف دھوم تھی مگر دوسرے مرحلہ میں گاندھی تنہا

اور بے سہارا ہو کر رہ گئے۔

یہی بات جے پرکاش کے ساتھ پیش آئی۔ انھوں نے جب اینٹی کانگرس تحریک چلائی تو ان کے ساتھ بھیڑ کی بھیڑ جمع ہو گئی۔ مگر اس کے بعد جب جنتا پارٹی کی حکومت بن گئی تو جے پرکاش لوگوں سے کٹ کر رہ گئے۔

میں نے کہا کہ موجودہ کام کا تقابل گاندھی اور جے پرکاش کے مرحلۂ اول سے نہ کیجئے بلکہ ان کے مرحلۂ ثانی سے کیجئے تو آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اصل مسئلہ لیڈر کا نہ ہونا نہیں ہے بلکہ خود یہ کام ہی کٹھن ہے۔ یہ وہ کام ہے جس میں گاندھی اور جے پرکاش بھی تنہا ہو گئے تھے۔ پھر اگر ہمیں بھی اسی قسم کا تجربہ ہو تو اس پر مایوسی کی کیا ضرورت۔

۱۸ اپریل ۱۹۹۳

عربی مجلہ الازہر (قاہرہ) کے شمارہ شوال ۱۴۱۲ھ (اپریل ۱۹۹۲) میں 'قبس من انوار النبوۃ' کے تحت نقل کیا ہے کہ بعض علماء نے کہا کہ غیبت ایک ظلم ہے اور اس کا کفارہ یہ ہے کہ تم نے جس آدمی کی غیبت کی ہے اس کے حق میں تم مغفرت کی دعا کرو۔ (قال بعض العلماء: إن الغيبة مظلمة وكفارتها الاستغفار لصاحبها الذي اغتبته)

اس کی وجہ یہ ہے کہ غیبت بدخواہی کے جذبہ کے تحت نکلتی ہے اور دعا خیر خواہی کے جذبہ کے تحت۔ غیبت کے بعد جب آدمی کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور وہ اس کے حق میں نیک دعا کرتا ہے تو گویا وہ بدخواہی کو خیر خواہی سے دھو رہا ہے، وہ برائی کو بھلائی کے ذریعہ پاک کر رہا ہے۔

۱۹ اپریل ۱۹۹۳

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد ڈھائے جانے کے بعد میوات میں مسلم اکثریت کے علاقہ میں دو درجن مندروں کو توڑا گیا۔ ایک میواتی مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا کہ مسلمان اس دیش میں اس طرح رہنا چاہتے ہیں جیسے کہ وہ بھارت نہیں ہے بلکہ پاکستان ہے۔ اگر مسلمانوں کو اسی طرح رہنا تھا تو آخر انھوں نے پاکستان کیوں بنوایا۔

انھوں نے کہا کہ وہ تو ہمارے لڑکوں نے کیا تھا۔ میں نے کہا کہ اگر لڑکوں نے کیا، تب بھی

بڑوں پر اس کی ذمہ داری ہے۔ حدیث میں ہے کہ کل مولود یولد علی الفطرة فابواہ یھود انہ وینصرانہ ویمجسانہ۔ اس حدیث کے مطابق، یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ لڑکے پیدائش کے اعتبار سے امن پسند پیدا کئے گئے تھے۔ مگر ان کے گھر اور ان کے معاشرہ نے ان کو تشدد اور نفرت میں مبتلا کر دیا۔ اس کا ایک مظاہرہ مذکورہ صورت میں پیش آیا۔

٢٠ اپریل ١٩٩٣

١٩ اپریل کو تمام اخباروں کی سب سے نمایاں خبر یہ تھی کہ صدر پاکستان غلام اسحاق خاں نے مسٹر نواز شریف کی منتخب حکومت کو ڈسمس کر دیا۔ اس کا سبب کوئی نیشنل یا انٹرنیشنل پالیسی کا معاملہ نہیں تھا۔ اس کا سبب صرف ذاتی اختلاف تھا، جیسا کہ اخباروں نے لکھا ہے۔ پاکستان کے دستور کے تحت اس کے بعد تین ماہ کے اندر نیا الکشن ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ انھوں نے اعلان کیا ہے کہ اگلا الکشن ١٤ جولائی ١٩٩٣ کو ہوگا۔

صدر کے لئے اس قسم کا مطلق اختیار جنرل ضیاء الحق نے پاکستان کے دستور میں آٹھویں ترمیم کے ذریعہ شامل کیا تھا۔ اس کے تحت ضیاء الحق نے ١٩٨٤ میں پاکستان کے اسلام پسند لیڈروں کی حمایت سے ذوالفقار علی بھٹو کی منتخب وزارت کو ختم کیا تھا۔ اس کے بعد ١٩٨٨ میں ضیاء الحق نے محمد خاں جونیجو کی وزارت کو اچانک برخاست کر دیا۔ ١٩٩٠ میں صدر اسحاق خاں نے نظیر بھٹو کی وزارت کو نواز شریف کی حمایت سے برخاست کیا جو اس وقت اپوزیشن میں تھے۔ اب بے نظیر کی باری تھی۔ ان کا ساتھ لے کر غلام اسحاق خاں نے نواز شریف کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

ہندستان ٹائمس (٢٠ اپریل) نے اپنے ایڈیٹوریل میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دنیا کی ترقیوں سے غیر متاثر پاکستان ابھی سیاسی بدویت (political primitivism) کے دور میں ہے (٢٦ مئی ١٩٩٣ کو پاکستان کی سپریم کورٹ نے صدر اسحاق خاں کے حکم کو کالعدم قرار دیا اور اسمبلی کو اور نواز شریف حکومت کو دوبارہ بحال کر دیا)

٢١ اپریل ١٩٩٣

بابری مسجد کے کیس کے بگڑنے کی ذمہ داری تمام تر مسلمانوں کی نام نہاد قیادت پر ہے نہ کہ ہندوؤں پر۔ حقیقت یہ ہے کہ مشترک خاندان سے مشترک سماج تک ہر جگہ نزاعی مسائل

پیدا ہوتے ہیں۔ ان نزاعات کے ساتھ خوش تدبیری کا معاملہ کیا جائے تو وہ حل ہو جائیں گے۔ اور اگر بدتدبیری کا معاملہ کیا جائے تو وہ بگڑ جائیں گے۔

بابری مسجد کا تالا کھلنے کے بعد ۱۹۸۶ میں میں نے یہ تجویز رکھی کہ آربیٹریشن (ثالثی) کے اصول پر اس کو طے کیا جائے۔ ہندو اس پر راضی تھے۔ مگر پرجوش مسلمانوں نے میری مخالفت کی۔ اس وقت سید شہاب الدین نے میرے خلاف مہم کی قیادت کی۔ یہاں تک کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد ڈھا دی گئی۔

۶ دسمبر کے بعد میں نے تین نکاتی فارمولا پیش کیا۔ اس کو بھی ہندوؤں کے درمیان غیر معمولی قبولیت حاصل ہوئی۔ لیکن دوبارہ پرجوش مسلمان اس کے راستہ میں حائل ہو گئے اس بار میری مخالفت کی مہم کی قیادت مولانا ابوالحسن علی ندوی فرما رہے ہیں۔ سید شہاب الدین کی مہم نے ہندو انتہا پسندوں کو متحد کر دیا تھا۔ اب مولانا ابوالحسن ندوی کی مہم ان ہندو انتہا پسندوں کو حکومت کی کرسی تک پہنچانے کا کارنامہ انجام دے گی۔

بھاجپا کے لیڈر مرلی منوہر جوشی نے کہا ہے کہ ۱۹۸۴ میں لوک سبھا میں ہمارے پاس صرف دو سیٹیں تھیں۔ ۱۹۹۱ میں لوک سبھا میں ہماری سیٹ ۱۲۰ تک پہنچ گئی۔ اب اگلے الکشن میں لوک سبھا میں ہمارے ممبروں کی تعداد ۳۷۰ ہوگی۔

۲۲ اپریل ۱۹۹۳

ٹائمس آف انڈیا (۲۲ اپریل) میں مسٹر گری لال جین کا ایک آرٹیکل چھپا ہے۔ اس میں انھوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اگلے الکشن میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی کامیابی کے امکانات بہت روشن ہیں۔ انھوں نے مزید لکھا ہے کہ مسلم قیادت کی احمقانہ روش بھی بھارتیہ جنتا پارٹی کے حق میں نہایت مفید ثابت ہو رہی ہے۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:

> As it is, Muslim leaders have been making an impossible demand on the government—construction of a mosque at the old site in Ayodhya—and thereby reinforcing the community's alienation from the Congress in disregard of the fact that in the process they are facilitating the BJP's task... With such opponents, the BJP hardly needs friends except perhaps to rescue its leaders from their own fears and complexes. (p. 10)

یہ تبصرہ بالکل درست ہے۔ ۱۹۷۷ء کے الکشن میں انھیں مسلم قائدین کی نادانی سے کانگرس کی جگہ جن سنگھ برسراقتدار آگئی تھی۔ اب دوبارہ انھیں نام نہاد قائدین کی نادانی سے یہ ہونے والا ہے کہ کانگرس کے بجائے بھارتیہ جنتا پارٹی اقتدار پر قابض ہو جائے۔ یہ لوگ زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ سیکولر طاقتوں کے ہاتھ مضبوط کرنا چاہئے۔ مگر عملاً وہ غیر سیکولر عناصر کو طاقت پہنچانے کا ذریعہ بن رہے ہیں۔

۲۳ اپریل ۱۹۹۳

کچھ لوگوں سے صبر کے موضوع پر بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ صبر کا پہلا ذاتی فائدہ یہ ہے کہ صبر آپ کے ذہن کو ڈسٹرب ہونے سے بچاتا ہے۔ اگر آپ کے اندر صبر کا مادہ نہ ہو تو کوئی خلاف مزاج بات پیش آتے ہی آپ مشتعل ہو جائیں گے، اور جو آدمی مشتعل ہو جائے وہ فوراً ہی درست طور پر سوچنے کی صلاحیت کھو دیتا ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی مشتعل نہ ہو وہ اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ پیش آمدہ معاملہ میں ایسا فیصلہ لے سکے جس میں اس کی ذہنی صلاحیت پوری طرح استعمال ہوئی ہو۔

۲۴ اپریل ۱۹۹۳

کاشف العلوم (بنگلہ والی مسجد، نظام الدین) کے دو طالب علم ملاقات کے لئے آئے۔ ان میں سے ایک طالب علم الور (راجستھان) کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے الور میں تقریباً ۱۲۰ مسجدیں تھیں۔ ۱۹۴۷ کے ہنگامہ میں سب کی سب مسمار کر دی گئیں۔ اب مسجد کی جگہ کہیں پارک ہے۔ کہیں دکان اور اسکول ہے۔ ایک مسجد کی بابت انھوں نے بتایا کہ اس کی عمارت میں ترمیم کر کے اس کو مندر بنا دیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے خود اس مسجد کو دیکھا ہے۔

اسی طرح ہزاروں مسجدیں ہیں جو ۱۹۴۷ کے ہنگامہ میں تباہ کر دی گئیں۔ ان مسجدوں کی بابت تمام علما نے خاموشی کا طریقہ اختیار کیا۔ مولانا حسین احمد مدنی سے لے کر مولانا ابوالحسن علی ندوی تک کسی نے بھی ان کے معاملہ میں کوئی ایجی ٹیشن نہیں چلایا۔ میں کہتا ہوں کہ بابری مسجد کے بارہ میں بھی اسی اصول کو اختیار کیا جائے۔ اس کے سوا میرا کچھ اور کہنا نہیں ہے۔ پھر کیسے عجیب

ہیں میرے وہ مخالفین جو اس قسم کی روش کے باوجود مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کے معتقد بنے ہوئے ہیں، اور عین اسی روش بنا پر مجھ کو مطعون کرتے ہیں۔

۲۵ اپریل ۱۹۹۳

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے ایک صاحب سے کہا کہ اس دور میں مسلمانوں نے اپنے پولٹیکل ایمپائر کو کھو دیا۔ اس کے بعد ٹھیک یہی واقعہ انگریزوں کے ساتھ پیش آیا۔ انھوں نے بھی اپنے پولٹیکل ایمپائر کو کھو دیا۔ لیکن انگریز آج بھی دنیا میں باعزت جگہ حاصل کئے ہوئے ہیں جبکہ مسلمان ہر جگہ ذلیل وخوار ہو رہے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزوں نے اگرچہ پولٹیکل ایمپائر کو کھویا تھا مگر اس کے بعد بھی انڈسٹریل ایمپائر ان کے پاس موجود رہا۔ جب کہ مسلمان کا معاملہ یہ ہے کہ پولٹیکل ایمپائر کھونے کے بعد انھوں نے سب کچھ کھو دیا۔ اس کے بعد کوئی اور چیز نہ تھی جس پر وہ اپنے وجود کو دوبارہ قائم کرسکیں۔

۲۶ اپریل ۱۹۹۳

میں نے قرآن کی عربی تفسیروں کا کثرت سے مطالعہ کیا ہے۔ اب بھی برابر ان کو دیکھتا رہتا ہوں۔ مگر جب بھی میں کسی تفسیر کو دیکھتا ہوں تو فوراً یہ احساس ہوتا ہے کہ پوری تاریخ میں شاید کوئی بھی تفسیر اس مقصد کے تحت نہیں لکھی گئی کہ اس کو پڑھ کر لوگوں کے اندر قرآنی ذہن بنے تقریباً تمام تفسیروں کے بارہ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان میں ہر چیز ہے، مگر ان میں ذہن سازی کا کوئی سامان نہیں۔

موجودہ زمانہ میں شاید پہلی بار مولانا سید ابو الاعلیٰ نے ایسی تفسیر (تفہیم القرآن) لکھی جو ذہن سازی کے انداز میں تیار کی گئی تھی۔ مگر وہ پچھلی تفسیروں سے بھی زیادہ غیر مفید بن گئی۔ کیوں کہ تفہیم القرآن نہایت غلط طور پر قاری کے اندر سیاسی طرز فکر پیدا کرتی ہے۔ اس اعتبار سے وہ تحریف القرآن ہے نہ کہ تفہیم القرآن۔ اس کے اندر کچھ مفید اجزاء کا موجود ہونا اس کو صحیح تفسیر نہیں بناتا۔ اس قسم کے جزئی طور پر مفید اجزاء تو قادیانیوں کی تفسیر میں بھی پائے جاتے ہیں۔

۲۷ اپریل ۱۹۹۳

نئی دہلی کے انگریزی اخبار پائنیر (۲۷ اپریل) میں صفحۂ اول پر یہ خبر ہے کہ فائننس منسٹر من موہن سنگھ نے لوک سبھا میں بتایا کہ اجودھیا کے حادثہ (٦ دسمبر ۱۹۹۲) کے نتیجہ میں چار مہینوں کے اندر گورنمنٹ کو مالیات کی وصولی (revenue receipts) میں پانچ ہزار کروڑ روپیہ کا نقصان ہوا ہے۔ اس سے پہلے قومی آواز (۲۳ اپریل) میں بتایا گیا تھا کہ ٦ دسمبر ۱۹۹۲ سے مارچ ۱۹۹۳ تک مختلف صورتوں میں جو مالی نقصان ہوا ہے، اس کی مجموعی مقدار بیس ہزار کروڑ روپیہ ہے۔

اس طرح کے مختلف نقصانات جو ٦ دسمبر کو بابری مسجد ڈھانے کے بعد پیش آئے ہیں وہ مانع عوامل (deterrent factors) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مانع عوامل نے اب اس کو ناممکن بنا دیا ہے کہ بابری مسجد کے بعد کسی اور مسجد کا چیپٹر کھولا جائے۔ اس قسم کی تخریبی سیاست کے لئے بابری مسجد کا انہدام ایک فل اسٹاپ تھا۔ تخریب کاروں نے اس کو آغاز سمجھا۔ مگر قانون فطرت نے اس کو اختتام بنا دیا۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کی نیشنل کانفرنس بنگلور میں ۱۸ - ۲۰ جون ۱۹۹۳ کو ہوئی۔ اس میں پارٹی نے رام مندر کا اشو ہی ختم کر دیا۔ پارٹی کا نیا نعرہ ہے ——— سماجی نشأۃ ثانیہ (social renaissance)

۲۸ اپریل ۱۹۹۳

صحیح روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب میری امت میں تلوار داخل ہوگی تو وہ قیامت تک اٹھائی نہیں جائے گی (مشکاۃ المصابیح ۲/ ۱۴۸۴) تاریخ اس پیغمبرانہ پیشین گوئی کی تصدیق کرتی ہے۔

اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ حکومت واقتدار کو اسلام نے بطور ضرورت اختیار کیا تھا۔ بعد کے لوگوں نے نظریہ سازی کے ذریعہ حکومت واقتدار کو مقصد بنا لیا۔ اور جب حکومت واقتدار کو مقصد سمجھ لیا جائے تو اس کے بعد جنگ وجدال کا پیش آنا لازمی ہو جاتا ہے۔

اسلام میں جنگ دفاع کے لیے ہے نہ کہ سیاسی دائرے کی توسیع کے لیے۔

۲۹ اپریل ۱۹۹۳

ایک مسلم صحافی سے بات کرتے ہوئے کہا کہ ہندستان میں اگر دو بات ہو جائے تو اس کے بعد مسلمانوں کے مسئلہ کو حل کرنے میں دو دن کی بھی تاخیر نہیں ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ وہ دو بات کیا ہے۔ میں نے کہا کہ ایک تو یہ کہ مسلمانوں کے تمام اخبارات بند کر دئے جائیں۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے تمام لیڈر خاموشی اختیار کرلیں۔

میں نے کہا کہ یہ کوئی شاعری نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے۔ وہ یہ کہ انسان کے لئے سب سے بڑی گائڈ اس کا نیچر ہوتا ہے۔ اِس وقت زرد صحافت اور زرد قیادت اس نیچر کو دبائے ہوئے ہے۔ یہ دونوں چیزیں ختم ہو جائیں تو اس کے بعد نیچر کو اپنا کام کرنے کا موقع مل جائے گا، اور نیچر کی رہنمائی کبھی غلط نہیں ہوتی۔

۳۰ اپریل ۱۹۹۳

ٹائمس آف انڈیا (۳۰ اپریل) میں مسٹر بدرالدین طیب جی کا ایک مضمون چھپا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس وقت میری عمر ۸۵ سال ہے۔ پچھلے ۲۰ سال سے میں رمضان کے روزے نہیں رکھتا اس سے پہلے میں برابر روزہ رکھتا تھا۔

انھوں نے لکھا ہے کہ ۱۹۲۵ میں میں سرگودھا میں اسسٹنٹ کمشنر تھا۔ رمضان کے مہینہ میں میں اپنے انگریز ڈپٹی کمشنر جیمس ریڈ کے ساتھ دورہ پر تھا۔ اس کو معلوم ہوا کہ اس گرمی کے موسم میں میں روزہ رکھے ہوئے ہوں، اس نے طے کیا کہ وہ شام کو ۵ بجے کی چائے چھوڑ دے اور شام کو میرے ساتھ افطار میں شریک ہو:

> I was on tour with my deputy commissioner, James Read, an English eccentric, somewhat choleric, gentleman. Sensing that I was fasting in the rather grim summer conditions, he decided to forgo his own 5 o'clock tea breaks and join me for Iftar at sunset, hours later. I appreciated his gesture.

۱۹۴۷ سے پہلے ہمارے علماء نے انگریزوں کے خلاف اس قدر نفرت پھیلائی کہ انگریزوں کو مکمل طور پر برا سمجھنا اور ان سے نفرت رکھنا گویا عقیدہ کا جزء بن گیا۔ میں خود نوجوانی کی عمر میں انھیں جذبات کا شکار رہا۔ حالاں کہ انگریز بھی انسان تھا، اس کے اندر بھی فطرت

اسی طرح موجود تھی جس طرح کسی دوسرے آدمی میں ہوتی ہے۔

مسلم علما کو انگریزوں سے سیاسی اختلاف تھا۔ مگر انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ صرف ان کی سیاست پر تنقید کی جائے۔ نہ کہ ان کے پورے وجود کو قابل نفرت ظاہر کیا جائے۔

یکم مئی ۱۹۹۳

فرانس کے ایک بادشاہ کو شکار کا بہت شوق تھا۔ وہ ہر روز شکار کے لئے جایا کرتا تھا اور روزانہ کچھ نہ کچھ شکار کرتا تھا۔ ایک روز وہ کوئی جانور شکار نہ کر سکا۔ اس روز اس نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ کچھ نہیں (nothing)

میرا معاملہ یہ ہے کہ مجھے دریافتوں کا شوق ہے۔ اللہ کے فضل سے ہر روز کوئی نہ کوئی نئی چیز میرے علم میں آتی ہے۔ اگر بالفرض کسی دن کوئی نئی بات میرے علم میں نہ آئے تو میں اپنی ڈائری میں فرانس کے بادشاہ کی طرح یہ نہیں لکھوں گا کہ آج کوئی شکار نہیں ملا۔ اس کے بجائے میں یہ لکھوں گا کہ آج کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوئی۔

۲ مئی ۱۹۹۳

پروفیسر بپن چندر (Bipin Chandra) کی ایک کتاب ۱۹۹۲ میں ہر آنند پبلی کیشنز نئی دہلی سے چھپی ہے۔ اس کا نام یہ ہے:

Essays on contemporary India

اس کتاب کا ایک حصہ ہندستان ٹائمس (۲ مئی) کے سنڈے سکشن میں چھپا ہے۔ اس میں وہ فرقہ واریت کے سنگین مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فرقہ واریت کا بہتر مقابلہ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ ملک کی تمام سیکولر طاقتوں کو اس کے خلاف متحد کیا جائے:

Communalism can best be countered by combining all the secular forces.

یہ بات میں پچھلے چالیس سال سے سنتا اور پڑھتا رہا ہوں۔ یہ بات اس مفروضہ پر کہی جاتی ہے گویا کہ ابھی سیکولر طاقتوں کو فرقہ واریت کے خلاف استعمال نہیں کیا گیا۔ حالاں کہ ۴۷ ۱۹ کے بعد جو قومی لیڈر حکومت پر قابض ہوئے اور آج تک قابض ہیں۔ ان سب کا یہی نظریہ تھا۔ پریس سے لے کر حکومت تک کی پوری طاقت فرقہ واریت کے خلاف مسلسل استعمال کی جاتی رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اصل مسئلہ سیکولر طاقتوں کو استعمال نہ کرنے کا نہیں ہے بلکہ استعمال کے باوجود نتیجہ نہ نکلنے کا ہے۔ چوں کہ اس رخ پر ساری کوشش کے باوجود مطلوب نتیجہ نہیں نکلا۔ اس لئے سمجھا جا رہا ہے کہ اس تصور کو استعمال بھی نہیں کیا گیا۔

۲ مئی ۱۹۹۲

ٹائم میگزین (۳ مئی ۱۹۹۲) نے کشمیر کے بارہ میں ایک رپورٹ چھاپی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ پچھلے چار سال کی تحریک کے دوران ۱۲ ہزار کشمیری جوان مارے جا چکے ہیں۔ اس سے کئی گنا زیادہ زخمی ہوئے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ بڑی مقدار میں مال اور جائداد کا نقصان ہوا ہے۔ مگر کشمیریوں کا مکمل آزادی (complete freedom) حاصل کرنے کا جوش ابھی تک کم نہیں ہوا۔ ساری تباہی کے باوجود آج بھی سرینگر سڑکوں پر ایک ہی نعرہ سنائی دیتا ہے ——— ہم کو آزادی چاہئے:

We want freedom

۱۹۸۹ میں کشمیری جنگجوؤں نے سرینگر میں پہلی بار بم مارے۔ یہاں سے کشمیر کی مسلم تحریک آزادی شروع ہوئی۔ اس سے پہلے میں کئی بار کشمیر گیا ہوں۔ ۱۹۸۹ سے پہلے وہاں مکمل امن تھا۔ مگر مکمل آزادی کے فریب نے مکمل امن کا خاتمہ کر دیا۔

کشمیر کی فضاؤں میں مجھ کو فکری بلندی اور روحانی آزادی کا سبق ملتا تھا۔ وہاں کے خوبصورت قدرتی مناظر میں ربانی غذاؤں کا اتھاہ سمندر ابلتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ فطرت کی یہ دنیا آدمی کو اتنی بڑی چیز دے رہی ہے جس کے آگے ہر دوسری چیز حقیر بن جاتی ہے۔ کشمیری اپنے ماحول سے یہ فکری غذا نہ لے سکے۔ البتہ وہ تباہ کن سیاسی لڑائی میں مشغول ہو گئے۔ موجودہ زمانہ کے فتنوں میں سے ایک فتنہ یہ ہے کہ شیطان نے سیاسی آزادی کے بارہ میں لوگوں کو بہت زیادہ حساس بنا دیا ہے۔ کشمیر اور دنیا کے اکثر مقامات کے مسلمان سیاسی آزادی کے نام پر حکمرانوں سے لڑ رہے ہیں اور نتیجہ میں مزید تباہ و برباد ہو رہے ہیں۔

جب کہ عین اسی وقت ایک اور زیادہ بڑی آزادی کے مواقع پوری طرح انھیں حاصل تھے۔ مگر ان کی بے شعوری نے ان کو اس سے محروم کر دیا۔

۴ مئی ۱۹۹۳

اسلام کے نام پر اٹھنے والی کسی تحریک کو جانچنے کا معیار صرف ایک ہے۔ یہ کہ اس نے اپنے متاثر افراد کو ربانی انسان بنایا یا نہیں بنایا۔ اس اعتبار سے جب میں دیکھتا ہوں تو موجودہ زمانہ میں اٹھنے والی تحریکوں میں سے کوئی تحریک بھی حقیقی اسلامی تحریک دکھائی نہیں دیتی۔

ان تحریکوں کا حال یہ ہوا ہے کہ ان میں سے کسی تحریک نے اپنے متاثرہ افراد کو زندہ یا مردہ اکابر سے جوڑا۔ کسی نے مسلمانوں کو ان کی تاریخی عظمت میں گم کیا۔ کسی نے دوسروں کو غیر قوم کی حیثیت دے کر ان سے لڑنا بھڑنا سکھایا۔ کسی نے اسلام کو لوگوں کے لئے ایک سیاسی آئیڈیالوجی بتایا۔

صحیح اسلام یہ ہے کہ آدمی کو اللہ کی معرفت حاصل ہو۔ اس کے اندر جوابدہی کا احساس جاگے۔ اس کی زندگی میں عبادت اور اخلاق کی روح پیدا ہو۔ وہ اللہ کی یادوں میں جینے لگے۔ وہ جہنم سے بھاگنے والا اور جنت کی طرف دوڑنے والا بن جائے۔ اس کے اندر وہ شخصیت پرورش پائے جو جنت کی نفیس دنیا میں بسانے کے قابل ہو۔

۵ مئی ۱۹۹۳

ایک صاحب سے میں نے گفتگو کے دوران کہا کہ رزق اس دنیا میں ہر ایک کا حق ہے اللہ تعالیٰ نے ہر پیدا ہونے والے کے لئے یہ ذمہ لیا ہے کہ وہ اس کو سامان حیات دے۔ مگر اقتدار کا معاملہ اس سے الگ ہے۔ اقتدار کسی کا بھی لازمی حق نہیں۔ اقتدار مصلحتِ امتحان کے تحت کبھی ایک کو ملتا ہے اور کبھی دوسرے کو۔

مسلمان خدا کی اس اسکیم پر راضی نہیں۔ وہ اقتدار کو بھی اپنا ذاتی حق سمجھتے ہیں۔ اللہ نے اس دنیا کو امتحان گاہ بنایا تھا۔ مگر مسلمانوں نے اس کو اپنے لئے حکومت گاہ سمجھ لیا۔ یہی موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا اصل مسئلہ ہے۔ سوچ کی اسی غلطی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر جگہ مسلمانوں کا رویہ غیر حقیقت پسندانہ ہو کر رہ گیا ہے۔

۶ مئی ۱۹۹۳

حضرت صالح نے اپنی قوم پر تبلیغ کا حق ادا کر دیا۔ مگر وہ نہیں مانے۔ آخر میں حضرت

صالح نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم، میں نے تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور میں نے تم کو نصیحت کی، مگر تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ (وقال یا قوم لقد ابلغتکم رسالة ربی ونصحت لکم ولٰکن لا تحبون الناصحین) الاعراف ۷۹

اس سے معلوم ہوا کہ انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو ناصح کو مبغوض سمجھے۔ دوسرا وہ جو ناصح کو محبوب سمجھے۔ جو لوگ اپنی ذات یا قوم کو برتر سمجھیں، ان کی نظر میں ناصح ایک مبغوض شخص بن جائے گا۔ اور جو لوگ حق کو برتر مقام دیں، وہ ناصح کو محبوب سمجھیں گے۔ کیوں کہ ناصح ان کو ایک ایسی چیز کی طرف رہنمائی کر رہا ہے جس کے متعلق وہ خود چاہتے ہیں کہ اس کی رہنمائی انھیں ملے۔

۷ مئی ۱۹۹۳

قومی آواز (۷ مئی) میں مولانا اخلاق حسین قاسمی کا ایک مضمون چھپا ہے۔ اس میں میرے بارہ میں کہا گیا ہے کہ میں "فلسفۂ پسپائی" کا مبلغ ہوں۔ یہی میرے تمام مخالفین کا حال ہے۔ آجکل میری مخالفت بہت زور پر ہے۔ مگر ہر لکھنے اور بولنے والا یہی کہہ رہا ہے کہ میں مسلمانوں کو بزدلی اور پسپائی سکھا رہا ہوں۔

جو لوگ ماہنامہ الرسالہ پڑھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ الرسالہ میں جو بات بتائی جا رہی ہے وہ صبر و اعراض ہے نہ کہ بزدلی اور پسپائی۔ اس لئے مخالفین کو یہ کہنا چاہئے کہ الرسالہ فلسفۂ صبر کا مبلغ ہے۔ یہ کہنا سراسر خلاف واقعہ ہے کہ الرسالہ فلسفۂ پسپائی کی تبلیغ کر رہا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ ان مخالفین کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ میں نے کہا کہ ایسے مخالفین کا کیا جواب دیا جائے جن کے اندر اتنی ہمت (courage) بھی نہیں کہ وہ میری اصل بات کو لے کر اس پر اعتراض کریں۔ وہ خود ساختہ طور پر ایک بات میری طرف منسوب کرتے ہیں اور اس خود ساختہ الزام کو بنیاد بنا کر اپنے اعتراض کی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خود ہی اپنے غلط ہونے کا اقرار کئے ہوئے ہیں، پھر ان کی غلطی کو مزید ثابت کرنے کی کیا ضرورت۔

۸ مئی ۱۹۹۳

ایک مسلم پرچہ میں ایک مضمون پڑھا۔ مضمون یہاں سے شروع ہوا تھا ـــــ "آج کل مسلمان نہ صرف ہندستان میں بلکہ ساری دنیا میں غیظ و غضب کا نشانہ بنے ہوئے ہیں"۔ یہی

بات تمام اردو، عربی، انگریزی کے مسلم پرچوں میں چھپی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ وہی بات ہے جو یہود کے بارہ میں لکھی ہوئی ہے —— میں تم کو قوموں کے حوالے کر دوں گا، وہ تم کو جنگلی جانوروں کی طرح بھبھوڑیں گے۔ پھر میں تمہارے اوپر رحم نہیں کروں گا۔

یہ تمام تر خدائی معاملہ ہے نہ کہ انسانی معاملہ۔

۹ مئی ۱۹۹۳

کچھ مسلمانوں سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اقتدار ان کا وراثتی حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں وہ تمام قوموں سے لڑ رہے ہیں تاکہ ان سے اقتدار چھین کر دوبارہ اس پر قابض ہو جائیں۔

میں نے کہا کہ اقتدار کسی کا بھی ابدی حق نہیں ہے۔ اقتدار امتحان کا پرچہ ہے جو باری باری مختلف قوموں کو دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ لڑائی صاحب اقتدار قوموں سے نہیں ہے، وہ خود خدا سے ہے۔ وہ خدا کی اسکیم سے لڑ کر اس کو بدلنا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ کسی کے بس میں نہیں کہ وہ خدا کی اسکیم کو بدل سکے۔

۱۰ مئی ۱۹۹۳

جمیل اختر صاحب مدینہ میں کام کرتے ہیں۔ آجکل چھٹی پر آئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے ایک مولوی صاحب کو آپ کی کتاب "تجدید دین" پڑھنے کے لئے دی۔ اس کو پڑھنے کے بعد میں نے ان کا تاثر پوچھا۔ انھوں نے کہا: سب ہفوات ہے۔ یہ شخص تو مجھے دشمنان اسلام کا ایجنٹ معلوم ہوتا ہے۔

میں نے کہا کہ میرے مخالفین اکثر اسی قسم کا تبصرہ کرتے ہیں۔ وہ بلا دلیل محض الزامی الفاظ بولتے ہیں۔ اس طرح کسی کو مطعون کرنے کی اسلام میں اجازت نہیں۔ کسی مومن کی عزت پر حملہ کرنا اسلام میں ناجائز ہے۔ اور اس قسم کے تبصرے بلاشبہ عزت پر حملہ کے ہم معنی ہیں۔

اختلاف جائز ہے مگر دشنام طرازی بلاشبہ حرام ہے۔

۱۱ مئی ۱۹۹۳

نئی دہلی کے سہ ماہی مجلہ "اسلام اور عصر جدید" کے شمارہ اکتوبر ۱۹۹۲ میں ڈاکٹر سید عابد حسین پر ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں ہندستانی مسلمان کے بارہ میں ان کے ایک مضمون کے کچھ حصے نقل کئے گئے ہیں۔ اس کا ایک جملہ یہ ہے: "اکثریت کے دل میں بے تعصبی، رواداری اور محبت کا ہونا اقلیت کے لئے سب سے بڑا تحفظ ہے۔" (نئی روشنی، ۱۶ جون ۱۹۴۸)

یہ نہایت درست بات تھی جو ڈاکٹر سید عابد حسین نے ۱۹۴۸ میں کہی تھی۔ مگر نہ مسلمانوں نے اس کو قبول کیا اور نہ خود سید عابد حسین اس کو مستقل مشن کے طور پر مسلمانوں میں جاری رکھ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک صحیح آواز صدا بصحرا ہو کر رہ گئی۔

۱۲ مئی ۱۹۹۳

مولانا مختار احمد قاسمی سے ملاقات ہوئی۔ وہ کوپاگنج کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو اجودھیا کی بابری مسجد ڈھائی گئی تو ہمارے قصبہ کے کچھ مسلم نوجوان رات کو تلوار لے کر نکلے۔ ایک سڑک پر ایک بوڑھا ہندو اکیلا چل رہا تھا، اس کو مار کر اس کا سرتن سے جدا کر دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک اور ہندو پر حملہ کیا۔ وہ زخمی ہو کر اسپتال میں داخل ہوا اور وہیں مرگیا۔ اس کے بعد پولیس نے سخت وحشیانہ کارروائی کی۔ وہ ۵۰ سے اوپر مسلمانوں کو پکڑ کر لے گئی اور ان کو اتنا مارا کہ ہاتھ پاؤں توڑ ڈالا۔ اب یہ لوگ مقدمات میں ملوث ہیں اور جائداد بیچ کر مقدمہ لڑ رہے ہیں۔

مسلم نوجوان اس طرح کا وحشیانہ جرم کیوں کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ مسلم معاشرہ ہندو نفرت کا کارخانہ بن گیا ہے۔ ایک مسلمان لڑکا گھر سے لے کر مندر تک ہر جگہ ہندو نفرت کی باتیں سنتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ ہندو اتنے برے ہیں کہ ان کے خلاف جو بھی کرو سب جائز ہوگا۔ یہ بلاشبہ ناقابل معافی جرم ہے۔ اور اس جرم میں پورا مسلم معاشرہ شریک ہے۔

۱۳ مئی ۱۹۹۳

روزنامہ قومی آواز (۱۳ مئی) میں مسٹر شمیم اختر کا ایک مضمون (خود شناسی کا سفر) چھپا ہے۔

اس میں وہ اپنا ایک ذاتی واقعہ اس طرح لکھتے ہیں: میری بھتیجی نے مجھے بتایا کہ اس کے دفتر میں ایک صاحب نے از راہ ہمدردی کہا کہ بی جے پی والوں سے بچ کر رہنا کیوں کہ ان کا اصول ہے کہ ایک مسلمان لڑکی کو خراب کرنے سے سو گائے دان کرنے کا ثواب ملتا ہے۔

موجودہ مسلم معاشرہ میں ہندو کے خلاف باتیں اس طرح ہوتی رہتی ہیں جیسے شہد کی مکھی کے چھتے میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کے دل میں ہندو کے خلاف نفرت بھر گئی ہے۔ یہ بلاشبہ ایک سنگین جرم ہے جو موجودہ مسلمان ہر روز اپنے درمیان کر رہے ہیں۔ اس جرم کے مجرم صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو براہ راست اس میں ملوث دکھائی دیتے ہیں۔ وہ لوگ بھی اس جرم میں پوری طرح شریک ہیں جو اس کو ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں مگر وہ اس کو نہیں روکتے۔

۱۴ مئی ۱۹۹۳

قومی آواز (۱۴ مئی) میں ایک صاحب نے لکھا ہے کہ —— ایک بزرگ مسلم خاتون نے مجھ کو بڑے فخر سے بتایا کہ جب وہ پاکستان سے ہندستان واپس آ رہی تھیں تو امرتسر کے ریلوے اسٹیشن پر مسافروں کی تلاشی شروع ہوگئی۔ مذکورہ خاتون فوراً پلیٹ فارم پر قرآن شریف کی تلاوت کرنے بیٹھ گئیں۔ سپاہی نے انھیں بوڑھی اور نیک عورت سمجھ کر چھوڑ دیا۔ اور وہ اپنا سونا لانے میں کامیاب ہوگئیں۔ قرآن شریف کی افادیت پر ان کا ایمان پکا ہوگیا۔ (صفحہ ۳)

مذکورہ خاتون نے سونا کو بچانے کے لئے قرآن کو استعمال کیا جو کہ صرف ملکی قانون میں جرم ہے۔ مگر ہمارے موجودہ قائدین کو قرآن کو اپنی جھوٹی لیڈری قائم کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں جو بذات خود جرم ہے۔ یہ خوش نام قائدین مذکورہ بدنام عورت سے زیادہ بڑے مجرم ہیں۔

۱۵ مئی ۱۹۹۳

ایک ہندو بھائی نے کہا کہ مذہبی فرقوں کے درمیان ہم آہنگی لانے کی ایک ہی تدبیر ہے۔ وہ یہ کہ لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ تمام مذاہب مختلف ڈھنگ سے ایک ہی بڑی سچائی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ یہ بات اس مفروضہ پر کہہ رہے ہیں گویا کہ ابھی اس ڈھنگ کی کوشش نہیں

کی گئی۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ پچھلے کئی سو سال سے اس کی کوششیں جاری ہیں۔ شہنشاہ اکبر نے سیاسی طاقت کے ذریعہ اس کو لانے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر بھگوان داس نے مذاہب کے بارے میں اپنے انسائیکلو پیڈیائی علم کو اس کے حق میں استعمال کیا۔ مہاتما گاندھی نے اس کی حمایت میں نہایت طاقت ور عوامی تحریک چلائی۔ مگر یہ ساری کوششیں مکمل طور پر ناکام ہو کر رہ گئیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے اصل مسئلہ کوشش کے نتیجہ خیز نہ ہونے کا ہے نہ کہ خود کوشش نہ کرنے کا۔ ایسی حالت میں اب سوال سابقہ طرز کی ناکام کوشش کو زندہ کرنے کا نہیں ہے، بلکہ خود کوشش میں تبدیلی لانے کا ہے۔

۱۶ مئی ۱۹۹۳

۱۹۴۷ کے بعد بابری مسجد تحریک نے ہندستانی مسلمانوں کو جتنا نقصان پہنچایا ہے، کسی اور تحریک نے نہیں پہنچایا۔ ۱۹۸۷ میں میں نے اس مسئلہ کے حل کے لئے ثالثی (Arbitration) کا اصول پیش کیا تھا۔ اس وقت سید شہاب الدین اس معاملہ میں مسلمانوں کے قائد بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے میری تجویز کو رد کر دیا۔ اور اس کو چلنے نہیں دیا۔ ورنہ یہ مسئلہ نہایت باعزت طور پر حل ہو گیا تھا۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد نئے حالات کے مطابق میں نے تین نکاتی فارمولا پیش کیا۔ تمام سمجھ دار لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ فارمولا سب سے زیادہ معقول فارمولا ہے۔ مگر آج کل اس معاملہ میں مولانا ابوالحسن علی ندوی مسلمانوں کے قائد بنے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اس فارمولے کو رد کر دیا ہے۔ دوبارہ یہ اندیشہ ہے کہ اس کا نتیجہ ملّت کی تباہی کی صورت میں ظاہر ہو۔

۱۷ مئی ۱۹۹۳

دہلی میں میواتیوں نے بہت سی ویران مسجدوں کو آباد کیا ہے۔ بہت سی مسجدیں جو ۱۹۴۷ میں ہندوؤں کے قبضہ میں چلی گئی تھیں، ان کو دوبارہ واگذار کیا ہے۔ یہ میواتی جن کو اکثر 'میاں جی' کہا جاتا ہے، وہ ان مسجدوں میں رہتے بھی ہیں اور کئی مسجدوں میں نماز اقامت کے ساتھ مدرسے بھی چلاتے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ میواتی لوگ مسجدوں پر قبضہ کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ اگر

آپ کی بات مان لی جائے کہ یہ لوگ اپنے مفاد کے لئے مسجدوں پر قبضہ کر رہے ہیں تب بھی وہ مشہور مسلم قائدین سے بہت زیادہ بہتر ہیں۔ کیوں کہ یہ میواتی تو ذاتی فائدہ کے ساتھ مسجدوں کو آباد کرنے کا کام کر رہے ہیں۔ جب کہ مشہور مسلم قائدین نے صرف ملت کی تباہی و بربادی میں اضافہ کیا ہے۔

۱۸ مئی ۱۹۹۳

مولانا ابوالکلام آزاد کے مداح مولانا موصوف کے حافظہ کے بارے میں ایک قصہ بیان کرتے ہیں۔ مولانا آزاد سے م۔ اشرف کی ملاقات پہلی بار ۱۹۱۴ میں کلکتہ میں ہوئی۔ اس کے بعد ۴۰ سال تک ملاقات نہ ہو سکی۔ ۱۹۵۴ میں جبکہ مولانا آزاد وزیر تعلیم تھے۔ م اشرف دہلی آئے۔ اور مولانا آزاد سے ان کے سرکاری دفتر میں ملے۔ کہا جاتا ہے کہ جب م۔ اشرف مولانا آزاد کے دفتر میں داخل ہوئے تو مولانا نے برجستہ کہا۔ اشرف صاحب آئیے، بیٹھئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ واقعہ مولانا آزاد کے غیر معمولی حافظہ کا ثبوت ہے۔ کہ چالیس سال گزرنے کے باوجود انھوں نے اشرف صاحب کو نام کے ساتھ خطاب کیا۔

اطہر صدیقی صاحب حکومت ہند کے پرسنل اسٹاف میں ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہ بالکل سادہ سی بات ہے جس کو افسانہ بنا دیا گیا ہے۔ منسٹر سے کوئی شخص اس طرح نہیں ملتا کہ وہ آئے اور اچانک اس کے دفتر میں داخل ہو جائے۔ وہ پہلے ٹیلیفون کرتا ہے جس کو پرسنل اسٹاف کے لوگ ریسیو کرتے ہیں۔ ٹیلیفون پر اس کا پورا نام اور دیگر تفصیل لکھی جاتی ہے۔ اور پھر ٹیلیفون پر اس کو بتایا جاتا ہے کہ وہ فلاں وقت آکر ملاقات کریں۔ پرسنل اسٹاف کے لوگ ہر روز ایک پیپر تیار کرتے ہیں کہ آج کون کون لوگ منسٹر سے ملاقات کریں گے۔ یہ پیپر ہر روز منسٹر کی میز پر رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ ایک عام اور معروف روٹین ہے۔ چنانچہ م۔ اشرف صاحب جب مولانا آزاد کے دفتر میں آئے ہوں گے تو اس سے پہلے انھوں نے اپنی میز پر رکھے ہوئے پیپر سے انھوں نے جان لیا ہوگا کہ کون شخص ان سے ملاقات کے لئے آرہا ہے۔

۱۹ مئی ۱۹۹۳

آج ہولی فیملی (دہلی) میں ہرنیا کا آپریشن ہوا۔ مجھے کئی سال سے دائیں جانب

کچھ سوجن کی کیفیت محسوس ہوتی تھی۔ جو کم یا زیادہ ہوتی رہتی تھی۔ مگر میں نے اس کو کوئی اہمیت نہ دی۔ مگر تین ہفتہ پہلے دائیں پٹھے کے پاس ایک بڑا ابھار ظاہر ہوا اور اس میں درد رہنے لگا۔ کل میں نے ڈاکٹر سہدیو (ہومیو پیتھ) کو دکھایا۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو کھلا ہوا ہرنیا کا کیس ہے آپ فوراً کسی سرجن سے ملئے۔ کل ہی میں نے ہولی فیملی اسپتال میں ڈاکٹر ہیشوری کو دکھایا۔ انھوں نے بھی دیکھنے کے بعد کہا کہ یہ ہرنیا ہے۔ اور فوراً اسپتال میں داخل کر لیا۔ یہاں میں کمرہ نمبر ۱۲۲ میں تھا۔ ۱۹ مئی کی صبح کو آپریشن ہوا۔

جسم کے نظام میں جب بھی کوئی خرابی واقع ہوتی ہے تو نیچر مختلف شکلوں میں اس کا سگنل دینا شروع کرتی ہے۔ اگر آدمی فطرت کے اس ابتدائی انتباہ کو سمجھ لے تو بروقت احتیاطی تدبیر اختیار کر کے زیادہ بڑے نقصان سے بچ سکتا ہے۔

۲۰ مئی ۱۹۹۳

آپریشن کے سلسلہ میں میں تین دن اسپتال میں رہا۔ اس دوران میرے ذہن میں خیال آیا کہ مسلمانوں میں سرجن بہت کم ہوتے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر ظفر الاسلام سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں محنت کا مزاج نہیں۔ سرجن بننا بہت محنت کا کام ہے۔ تعلیم کے اعتبار سے بھی اور پیشہ کے اعتبار سے بھی۔ مسلمان زیادہ محنت کرنا نہیں چاہتے اس لئے وہ سرجری کی تعلیم میں بھی زیادہ نہیں جاتے۔

۲۱ مئی ۱۹۹۳

تاریخ کے عجیب واقعات میں سے ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ جب خالص صراط مستقیم کی طرف دعوت دی جائے تو بہت کم ساتھ دینے والے ملتے ہیں۔ مگر جو لوگ صراط مستقیم سے ہٹ کر کوئی بات کہتے ہیں یا کوئی منحرف فکر پیش کرتے ہیں تو ایسے لوگوں کو ہمیشہ بڑے بڑے ذہن مل جاتے ہیں جو ان کے ساتھ تعاون کریں۔

۲۲ مئی ۱۹۹۳

عراق اور کویت کے درمیان جنگ کے بعد فلسطینی تحریک بے جان ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کی وجہ مالیاتی بحران ہے۔ کویت اور دوسرے عرب ملکوں میں جو فلسطینی کام کرتے تھے، ان کے

ذریعہ فلسطین آنے والی تقریباً ۴۵ کروڑ ڈالر کی رقم بند ہوگئی۔ اس کے علاوہ خلیج کے ممالک فلسطینی تحریک کو جو امدادی رقم دیتے تھے وہ اب برائے نام رہ گئی ہے۔ کیوں کہ اس میں ۵۰ کروڑ ڈالر سالانہ کی کٹوتی کردی گئی ہے (قومی آواز ۲۲ مئی ۱۹۹۳)

فلسطینیوں نے خلیج کی جنگ میں عراق کا ساتھ دیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں یہ مالی نقصان ان کے حصہ میں آیا ہے۔ جو فلسطینی لیڈر حالات کو سمجھنے کے لئے اتنے زیادہ نا اہل ہوں، وہ کوئی کامیاب تحریک کس طرح چلا سکتے ہیں۔

۲۳ مئی ۱۹۹۳

ایک صاحب نے کہا کہ زندگی پتہ نہیں کب ختم ہوگی۔ ایک ایک لمحہ اس کا مصیبت معلوم ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تو بڑی ناشکری کی بات ہے۔ ایسی بات آدمی کو کبھی نہیں کہنا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زندگی کا ہر لمحہ ایک عظیم ترین نعمت ہے۔ کیوں کہ آج کے ہر لمحہ کی قیمت ہزاروں سال سے بھی زیادہ مدت تک ملنے والی ہے۔ فرض کیجئے کہ آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ "خدایا میری تخلیق کو بامعنی بنا دے"۔ یہ ایک چھوٹا سا جملہ ہے جس کو کہنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگتا۔ مگر وہ بے حد قیمتی ہے۔ اور یہ قیمتی جملہ کہنے کا موقع صرف موجودہ دنیا میں ہے۔ موجودہ دنیا کے بعد اس جملہ کو کہنے کا موقع کسی کو بھی دوبارہ ملنے والا نہیں۔

پھر میں نے کہا کہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ دن پر دن گزر رہے ہوں مگر کوئی معرفت کی بات آپ کے ذہن میں نہ آتی ہو۔ پھر بھی یہ دن بیکار نہیں گزر رہے ہوں گے۔ اس وقت آپ کا ذہن پراسس کے مرحلہ سے گزر رہا ہے۔ آئندہ کسی وقت آپ کو ایک عظیم معرفت کا تجربہ ہو سکتا ہے۔ بظاہر یہ تجربہ وقتی ہوگا۔ لیکن یہ پچھلے تمام ایام میں شامل ہونگے کیوں کہ انھیں ایام کے ذہنی عمل کے آخری نتیجہ کے طور پر یہ معرفت آپ کو حاصل ہوئی۔

۲۴ مئی ۱۹۹۳

دنیا میں تقریباً نو ہزار قسم کی چڑیاں پائی جاتی ہیں۔ انڈیا میں ۱۲ سو قسم کی چڑیاں ملتی ہیں اور دہلی میں تقریباً ڈھائی سو قسم کی چڑیاں شمار کی گئی ہیں۔ چڑیوں کا مشاہدہ کرنا

(bird watching) موجودہ زمانہ میں ایک مستقل فن ہے جس کو عام طور پر برڈنگ (birding) کہا جاتا ہے۔

حدیث میں ایک صحابی کی روایت ہے کہ ایک چڑیا بھی اگر فضا میں اپنے دونوں پروں سے اڑتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے ہمیں نصیحت کی یاددہانی فرماتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ برڈنگ ایک عین اسلامی عمل ہے۔ البتہ اسلامی برڈنگ نصیحت و تذکیر کے لئے ہوتی ہے نہ کہ محض تفریحی مشغلہ کے لئے۔

۲۵ مئی ۱۹۹۳

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے لوگوں کو حق کا پیغام دیا تو آپ کے مخالفین نے آپ کے ساتھ جو معاملہ کیا اس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے: وقال الذین کفروا لا تسمعوا لهذا القرآن والغوا فیه لعلكم تغلبون۔ یعنی قرآن کی باتوں پر دھیان نہ دو اور اس میں عیب نکالو، اس طرح تم اس پر غالب آجاؤ گے۔

آجکل میرے مخالفین بھی میرے ساتھ ٹھیک یہی معاملہ کر رہے ہیں۔ میں جو بات بھی کہتا ہوں قرآن و حدیث کی واضح دلیل کی بنیاد پر کہتا ہوں۔ مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ پیش کردہ دلائل پر دھیان نہیں دیتے اور نہ اس پر سنجیدگی سے غور کرتے۔ اس کے بجائے وہ یہ کرتے ہیں کہ خود ساختہ طور پر کوئی عیب کی بات نکالیں گے اور اس کو لوگوں میں پھیلانا شروع کر دینگے۔ یہ ایک غیر سنجیدہ روش ہے اور جو لوگ غیر سنجیدہ روش میں مبتلا ہوں وہ اخروی ہدایت کا راستہ نہیں پاتے۔

۲۶ مئی ۱۹۹۳

آدمی کی مدت حیات کا سب سے زیادہ سنگین لمحہ وہ ہے جس کو موت کہا جاتا ہے۔ موت ہماری زندگی کا خاتمہ نہیں، وہ اگلے مرحلۂ زندگی کا آغاز ہے۔ موت وہ لمحہ ہے جب کہ آدمی اس دنیا سے منتقل ہو کر اُس دنیا میں جاتا ہے۔ یہ عمل کے مرحلہ سے نکل کر انجام کے مرحلہ میں داخل ہونا ہے۔ مزید یہ کہ کسی کو بھی پیشگی طور پر نہیں معلوم کہ اگلی دنیا میں اس کے عمل کا انجام اسے کس صورت میں لوٹایا جانے والا ہے۔ معاملہ کی یہ نوعیت اس کو سنگینی کی اس آخری حد تک پہنچا دیتی

ہے جس کے بعد سنگینی کا مزید کوئی درجہ نہیں۔

۲۷ مئی ۱۹۹۳

الرسالہ کا شمارہ جولائی ۱۹۹۳ ایک خاص نمبر ہوگا۔ اس کا عنوان ہوگا علما اور دور حاضر۔ اس شمارہ میں پچھلے تین سو سال کے دوران علما کی ملّی سرگرمیوں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ موجودہ مسلمان تنقید سے بہت زیادہ بھڑکتے ہیں۔ حالاں کہ تنقید کے بغیر کوئی حقیقی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ اس پس منظر کی رعایت کرتے ہوئے جولائی کے شمارہ کے صفحہ اول کے لئے میں نے حسب ذیل مضمون لکھ کر دیا ہے:

مستقبل کی کامیاب منصوبہ بندی صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں
جو ماضی اور حال کا تنقیدی جائزہ لینے کا حوصلہ رکھتے ہوں

۲۸ مئی ۱۹۹۳

ہر چیز کا ایک کروڈ (crude) فارم ہوتا ہے۔ اور اس کا ایک ریفائنڈ (refined) فارم۔ کسی چیز کے کروڈ فارم میں امکانی طور پر اس کا ریفائنڈ فارم ہمیشہ چھپا ہوا ہوتا ہے جیسے کہ پہلے زمانہ کی بھدّی موٹر کار میں موجودہ زمانہ کی خوبصورت موٹر کار امکانی طور پر چھپی ہوئی تھی۔

دنیا اور آخرت کے معاملہ کو اسی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ دنیا گویا اسی چیز کا کروڈ فارم ہے جس کے ریفائنڈ فارم کو جنت کہا گیا ہے۔ موجودہ دنیا میں وہ ساری اعلیٰ چیزیں موجود ہیں جن کے مجموعہ کا نام جنت ہے۔ مگر آج وہ سب کی سب اپنی کروڈ فارم میں ہیں۔ آخرت میں ان چیزوں کو آخری ریفائنڈ صورت دے دی جائے گی۔ اس کے بعد ایک ایسی معیاری دنیا بنے گی جو لذت اور نفاست اور معنویت کی ابدی بہشت ہوگی۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس معیاری دنیا میں داخلہ کی ایک ہی لازمی شرط ہے۔ وہ یہ کہ آدمی اس معیاری شخصیت کا حامل ہو جو اُس معیاری دنیا میں بسائے جانے کی اہل ہو۔ اسی معیاری شخصیت کو قرآن میں نفس مُزکّی کہا گیا ہے۔

جنّت ایک پاک جگہ ہے اور صرف پاک روحیں وہاں بسائی جائیں گی۔

۲۹ مئی ۱۹۹۲

مولانا جلال الدین رومی کا شعر ہے کہ قدیم عمارت کو جب از سرنو آباد کرنا ہوتا ہے تو پہلے اس کی قدیم عمارت کو ڈھا دیا جاتا ہے :

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند   می نہ دانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

اس وقت ساری دنیا اور انڈیا میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ مجھے اسی نوعیت کا ایک عمل معلوم ہوتا ہے۔ یہ ان کے جمود کو توڑنا ہے۔ یہ اس لئے ہے تاکہ ملت مسلمہ کا جامد پانی دوبارہ متحرک ہو کر سیل رواں بن سکے۔

۳۰ مئی ۱۹۹۳

موجودہ زمانہ کے مسلم حکمرانوں کو میں دیکھتا ہوں اور ان کے احوال کو پڑھتا ہوں تو اکثر نہایت درد کے ساتھ یہ الفاظ میری زبان پر آجاتے ہیں :

یہ ظالم صرف اس پر بھی قانع نہیں کہ انھیں عیش و آرام کی زندگی حاصل ہو۔ اس کے ساتھ وہ سرکشی بھی کرنا چاہتے ہیں، خواہ اس کے نتیجہ میں پورا ملک تباہ و برباد ہو کر رہ جائے۔

۳۱ مئی ۱۹۹۳

۲۹ ۔ ۳۰ مئی ۱۹۹۳ کو میں اندور میں تھا۔ آج وہاں سے واپس آیا۔ وہاں ایک آل انڈیا سیمینار تھا جس میں بڑی تعداد میں تعلیم یافتہ ہندو جمع ہوئے۔ دو روزہ تقریروں کے بعد آخری دن ایک منتخب کمیٹی نے ایک تجویز (یا ڈیکلریشن) تیار کر کے اس کو آخری اجلاس میں پڑھا تو اتنا اختلاف ہوا کہ متعین بات ہی طے نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ لوگ کھانے کے لئے اٹھ گئے۔

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ موجودہ زمانہ میں ہماری تمام تحریکوں نے صرف بولنے والے افراد پیدا کئے ہیں۔ حالانکہ کسی حقیقی کام کو کرنے کے لئے ایسے افراد کی ضرورت ہے جو الفاظ رکھتے ہوئے چپ ہو جائیں، جو زبان رکھتے ہوئے نہ بولیں۔ اندور میں پہلی بار بابا آمٹے (پیدائش ۱۹۱۴) سے میری ملاقات ہوئی۔

یکم جون ۱۹۹۳

بمبئی کے ماہنامہ البلاغ (جون ۱۹۹۳) میں ایک مضمون نظر سے گزرا۔ اس میں دکھایا

گیا ہے کہ مسلمانوں کے لئے حصول اقتدار اور خلافت کا قیام ضروری ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر اسلامی احکام نافذ نہیں ہوسکتے۔ اس سلسلہ میں ایک دلیل یہ دی گئی ہے :

'صرف قانون بنا دینے، یا صرف وعظ ونصیحت سے برائیاں دور نہیں ہوتیں۔ قانون کے نفاذ کے لئے قوت نافذہ ضروری ہے اور قوت نافذہ سلطان (نظام خلافت) ہی ہوسکتا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ جو برائی قرآن سے دور نہیں ہوتی اسے اللہ تعالیٰ سلطان (حکومت) کے ذریعہ دور کر دیتا ہے۔ (القرآن والسلطان)

یہ غیر سنجیدہ استدلال کی ایک مثال ہے۔ صاحب مضمون اگر سنجیدگی کے ساتھ غور کرتے تو ان کی سمجھ میں آتا کہ حضرت عثمان کے پاس اقتدار تو اپنی کامل صورت میں موجود تھا۔ اس کے باوجود عین انھیں کے زمانہ میں نظام اسلامی میں اتنا خلل آیا کہ لاقانونیت کی صورت پیدا ہوگئی۔ اور حضرت عثمان خلیفہ ہونے کے باوجود اس پر قابو نہ پاسکے۔ صاحب مضمون اگر اس طرح غور کرتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ خلیفۂ سوم کا یہ قول محدود معنی (limited sense) میں ہے نہ کہ کلی مفہوم (absolute sense) میں۔ نیز اس میں یہ بات تو سرے سے موجود ہی نہیں کہ مسلمان سیاسی تحریک چلا کر اقتدار پر قبضہ کریں تاکہ وہ قوانین اسلامی کو نافذ کرسکیں۔

۲ جون ۱۹۹۳

حضرت عمر فاروق کا یہ حال تھا کہ جب رات ہوجاتی تو وہ اپنے پاؤں پر درہ مارتے اور اپنے آپ سے کہتے کہ تو نے آج کے دن کیا کام کیا۔ (عمر بن الخطاب کان یضرب قدمیہ بالدرّة اذا جن اللیل ویقول لنفسہ : ما ذا عملت الیوم۔ الوعی الاسلامی جون ۱۹۹۳، صفحہ ۵۰)

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حضرت عمر کوئی عمل نہیں کرتے تھے اور سارا دن یوں ہی گزار دیتے تھے۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ وہ سرتاپا عمل تھے۔ ان کی زندگی کا کوئی بھی دن بے عملی میں نہیں گزرا۔ ان کا مذکورہ طریقہ مومنانہ نفسیات کی بنا پر تھا نہ کہ عمل نہ کرنے کی بنا پر۔

اصل یہ ہے کہ مومن کی نظر ہمیشہ اپنے نہ کئے پر ہوتی ہے اور منافق کی نظر اپنے کئے پر۔ یہی وجہ ہے کہ مومن ہمیشہ اس احساس میں مبتلا رہتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ اس کے برعکس

منافق کے پاس اپنے اعمال کا لمبا دفتر موجود ہوتا ہے جس کو وہ ہر مجلس میں بیان کرتا رہے۔

۳ جون ۱۹۹۳

کویت کے عربی ماہنامہ الوعی الاسلامی (ذی الحجہ ۱۴۱۳ھ، جون ۱۹۹۳) میں صفحہ ۱۰۶ پر ایک رپورٹ چھپی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۹۱ - ۱۹۹۰ کی خلیجی جنگ میں عربوں کو جو نقصان ہوا اس کی مقدار ۶۷۶ بلین ڈالر ہے۔ (غزو الکویت کلف العرب خسارة ۶۷۶ بلیون دولار)

اس مالی خسارہ میں تقریباً نصف عراق کا حصہ ہے اور بقیہ نصف کویت کا۔ یہ صرف ایک ضیاع تھا۔ اس کا کوئی بھی فائدہ عربوں کو ملنے والا نہیں۔ اگر خلیجی جنگ سے پہلے عراق اور کویت سے کہا جاتا کہ ۶۷۶ بلین ڈالر کا فنڈ قائم کرکے ایک انٹرنیشنل دعوۃ سنٹر بناؤ تو بظاہر حالات وہ کبھی اس کے لئے تیار نہ ہوتے۔ جب کہ اس دوسری صورت میں اس رقم کا فائدہ اتنا زیادہ تھا کہ وہ موجودہ دور میں اسلام کی ایک نئی تاریخ ظہور میں لانے کا ذریعہ بن جائے۔

۴ جون ۱۹۹۳

بابا آٹے کو میں نے پہلی بار اندور میں دیکھا۔ دو دن تک ان کا ساتھ رہا۔ وہ نیم برہنہ حالت میں رہتے ہیں۔ ان کے جسم پر جگہ جگہ آپریشن کے نشانات تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے اوپر ۱۶ میجر آپریشن ہو چکے ہیں۔ مائنر آپریشن کی تعداد ان کے علاوہ ہے۔ ان کے سینہ پر ایک طرف ابھار دیکھ کر میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ پیس میکر (pace maker) ہے جو آپریشن کرکے کھال کے نیچے لگا یا گیا ہے۔ ایک ایکسیڈنٹ کے نتیجہ میں وہ بیٹھ نہیں سکتے۔ وہ یا لیٹے رہتے ہیں یا کھڑے رہتے ہیں اور چلتے رہتے ہیں۔ عمر میں وہ مجھ سے دس سال بڑے ہیں۔ اس وقت وہ بھی زیر علاج ہیں، اور ڈاکٹروں کے مشورہ کے خلاف اندور آئے تھے۔ ان سب کے باوجود میں نے دیکھا کہ وہ ہر وقت نشیط رہتے ہیں، ہر وقت چاق چوبند نظر آتے ہیں۔

دوسری طرف میرا یہ حال ہے کہ میرا ہرنیا کا آپریشن ۱۹ مئی ۱۹۹۳ کو ہوا۔ ہرنیا کا آپریشن ایک مائنر آپریشن یا روٹین کا آپریشن سمجھا جاتا ہے۔ مگر دو ہفتہ بعد بھی میرا یہ حال ہے کہ میں

نزار اور نڈھال بستر پر پڑا ہوا ہوں۔

میرے جیسے کمزور انسان کو خدا نے کیوں پیدا کیا۔ شاید مجھ سے زیادہ کمزور انسان دنیا میں اور کوئی نہیں۔ یہ سوچتے ہوئے خیال آیا کہ خدا نے دوسرے انسانوں کو اس طرح بنایا کہ وہ بباطن عاجز مگر بظاہر طاقت ور تھے۔ اس ظاہری حالت کی بنا پر ہر آدمی طاقت کے فریب میں رہا، وہ حقیقت عجز کا ادراک نہ کر سکا۔

پھر خدا نے میرے جیسے ایک انسان کو پیدا کیا جو بباطن بھی عاجز تھا اور بظاہر بھی عاجز۔ اس طرح خصوصی تخلیق کے ذریعہ خدا نے مجھے عجز کا تجربہ کرایا تاکہ میں خود بھی عجز انسانی کی معرفت حاصل کروں اور دوسروں کو اس حقیقت سے آگاہ کروں۔

۵ جون ۱۹۹۳

ایک صاحب نے کہا کہ لوگ آپ کو ایسا اور ایسا لکھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بتائیے کہ ہماری قوم میں کون وہ شخص ہے جس کو ایسا اور ایسا نہیں کہا گیا۔ اس قوم نے شاہ ولی اللہ کو زندیق کہا اور آج انھیں کو سب سے بڑا عالم سمجھا جاتا ہے۔ اس قوم نے سرسید کو انگریز کا ایجنٹ کہا۔ اور آج انھیں کو قوم کا سب سے بڑا محسن بتایا جاتا ہے۔ اس قوم نے اقبال کو انگریز کا نمک خوار کہا اور آج وہ مفکر اسلام کی فہرست میں نمبر ایک پر لکھے جاتے ہیں۔ اس قوم نے مولانا حسین احمد مدنی کو کانگرس کا پٹھو کہا اور آج وہ شیخ الاسلام قرار دئے جاتے ہیں۔ اس قوم نے مولانا ابوالکلام آزاد کو شو بوائے کہا اور آج وہ دور جدید کی سب سے بڑی اسلامی شخصیت شمار کئے جاتے ہیں۔ مسٹر محمد علی جناح کا انتقال ہوا تو ان کی تاریخ وفات "مرگیا مردود فاتحہ نہ درود" سے نکالی گئی۔ اور آج وہ قائد اعظم کا مقام حاصل کئے ہوئے ہیں۔ وغیرہ۔

میں نے کہا کہ یہ قوم زندہ کی بے قدری کرتی ہے اور مردہ کو پوجتی ہے۔ یہی سیکڑوں سال سے ہو رہا ہے۔ پھر میرے معاملہ میں استثناء کیوں کر ہو سکتا ہے۔

۶ جون ۱۹۹۳

اس وقت ساری مسلم دنیا میں نہایت تیزی کے ساتھ گن کلچر پھیل رہا ہے۔ مسلم اکثریت کے ملکوں میں اسلامی ریاست قائم کرنے کے نام پر، جیسے مصر، الجزائر، وغیرہ۔ اور مسلم اقلیت کے

ملکوں میں دفاع کے نام پر جس کی ایک مثال انڈیا ہے۔ یہ گن کلچر تقریباً ہر مسلم آبادی میں آچکا ہے۔ کہیں وہ فکری سطح پر ہے اور کہیں عملی سطح پر پہنچ چکا ہے۔

موجودہ زمانہ میں کچھ نام نہاد مسلم مفکر اٹھے جنھوں نے اسلام کی سیاسی تعبیر کی اور یہ بتایا کہ اسلام کا اصل نشانہ دنیا میں اسلامی قانون کی حکومت قائم کرنا ہے۔ یہ نظریہ انیسویں صدی کے نصف ثانی اور بیسویں صدی کے نصف اول کے حالات میں مسلمانوں کو کافی پسند آیا اور اس کی بنیاد پر بڑی بڑی تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مگر جو تحریکیں سیاسی اقتدار پر قبضہ کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہیں۔ اس سے متاثر لوگوں کا موجودہ ذہن یہ ہے کہ ہم نے اسلامی تحریک چلائی مگر ہم کامیاب نہیں ہوئے۔ پھر ہم نے انتخابات میں حصہ لیا تب بھی ہم کامیاب نہ ہو سکے۔ اب ان کے سامنے آخری ممکن راستہ تشدد کا ہے۔ چنانچہ اب وہ مسلم انقلاب کے نظریہ کو اپنا رہے ہیں۔

ہندستان جیسے ملکوں میں مسلمانوں کے نااہل لیڈروں اور جاہل دانشوروں نے یہی بتایا ہے کہ دستور اور قانونی نظام ان کے تحفظ میں ناکام ہو رہے ہیں۔ اس لئے اب انھیں خود اپنا دفاع کرنا ہے۔ اس طرح سلف ڈیفنس کا نظریہ اپنے حالات کے اعتبار سے گن کلچر کی طرف لے جا رہا ہے۔

یہ ذہن مسلمانوں کے لئے کسی بھی درجہ میں سودمند بننے والا نہیں۔ اس کا واحد انجام یہ ہوگا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تباہی اپنے آخری منطقی نتیجہ تک پہنچ جائے۔

خواہ مسلم اکثریت کا ملک ہو یا مسلم اقلیت کا ملک، دونوں جگہ مسلمانوں کے لئے صرف ایک راستہ ہے اور وہ ایک لفظ میں صبر ہے۔ یعنی ٹکراؤ کے راستہ کو ختم کر دینا اور حالات سے موافقت کر کے اپنے لئے ایک اسلامی زندگی کی تعمیر کرنا۔ اور یہ چیز مسلمانوں کے لئے ہر جگہ قابل حصول ہے۔ اس کو پانے کی راہ میں کہیں بھی کوئی رکاوٹ حائل نہیں۔ رکاوٹیں ناممکن کی طرف دوڑنے کی بنا پر ہیں۔ اگر ممکن کو اپنا نشانہ بنایا جائے تو مسلمانوں کو ہر جگہ عالیشان مواقع کھلے ہوئے نظر آئیں گے۔

یہی ایک لفظ میں زندگی کا راز ہے۔

۷ جون ۱۹۹۴

اب مجھ کو صرف سائنٹفک زبان پسند آتی ہے۔ ادبی اسٹائل والی زبان سے مجھے سخت بیزاری ہے۔ مگر ابتدائی دور میں ایسا نہ تھا۔ مدرسہ کی تربیت اور ماحول کے اثر سے، دوسرے اکثر لوگوں کی طرح، میں بھی ادبی اسٹائل والی زبان کو اہمیت دیتا تھا اور خود بھی اسی طرح لکھتا تھا۔

غالباً ۱۹۴۸ کی بات ہے۔ اس وقت میں اعظم گڑھ میں تھا۔ میں نے مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب "حیات شبلی" پر ایک تنقیدی مضمون لکھا اور اس کو نیاز فتحپوری کے ماہنامہ نگار (لکھنؤ) میں اشاعت کے لئے بھیجا۔ اس کا عنوان میں نے قائم کیا تھا ــــ اگر وہ مانیں۔ مضمون چھپ کر آیا تو نیاز فتحپوری نے اس کا عنوان اس طرح بنا دیا تھا: سید سلیمان ندوی کی حیات شبلی۔

اپنے پچھلے ذوق کے تحت ان کے اس تصرف پر غصہ آیا۔ میں نے ان کو خط لکھا کہ آپ نے میرے مضمون میں تحریف کر دی۔ اس کے جواب میں نیاز فتحپوری نے کارڈ پر ایک مختصر جواب دیا۔ اس کا مضمون یہ تھا: میں نے جو کچھ کیا وہ تحریف نہیں، تصحیف تھی جس کا ہر ایڈیٹر مجاز ہوتا ہے۔ (نیاز صاحب نے یہاں تصحیف کا لفظ ایڈیٹنگ کے معنی میں استعمال کیا تھا۔ حالاں کہ تصحیف کے یہ معنی نہیں۔ تصحیف دراصل distortion کے معنی میں آتا ہے۔

۸ جون ۱۹۹۴

اقبال نے بتایا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ترک مجاھد میرے ساتھ نماز پڑھنے گیا تو اس نے دیکھا کہ ہندی مسلمان بہت لمبا سجدہ کرتا ہے۔ اس نے پوچھا کہ اتنا لمبا سجدہ آپ لوگ کیوں کرتے ہیں۔ اقبال نے جواب دیا کہ غلاموں کے پاس اس کے سوا اور کام ہی کیا ہے:

کہا مجاہد ترکی نے مجھ سے بعد نماز   طویل سجدہ ہیں کیوں اس قدر تمہارے امام

طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے   ورائے سجدہ غریبوں کو اور کیا ہے کام

(غلاموں کی نماز، ضرب کلیم کلیات اردو، لاہور ۱۹۸۴، صفحہ ۶۱ – ۶۲)

اقبال شاید سجدہ کے نام سے صرف رسمی سجدہ کو جانتے تھے۔ اس تقابل میں انھیں آزادی اور حکومت جیسی چیزوں کے مقابلہ میں سجدہ بہت کم محسوس ہوا۔ اگر وہ جانتے کہ سجدہ اپنی حقیقت

کے اعتبار سے سب سے بلند انسانی مقام ہے۔ سجدہ کی حالت وہ حالت ہے جس میں انسان قربت خداوندی کا تجربہ کرتا ہے، تو وہ ایسا نہ کہتے۔ کیوں کہ قربت خداوندی سے زیادہ بڑی کوئی چیز انسان کے لئے نہیں ہو سکتی۔

۹ جون ۱۹۹۳

ایک مسلمان بزرگ نے کہا کہ آپ اپنے الرسالہ میں مسلمانوں کو ہمیشہ صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ صبر تو بزدلی ہے۔ کیا آپ تمام مسلمانوں کو بزدل بنا دینا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ صبر بزدلی نہیں، صبر ایک جنتی روش ہے۔ جس آدمی کا ذہن آخرت کی باتوں میں مشغول ہو، جو آخرت کی یاد میں صبح و شام بسر کرتا ہو اس کا حال یہی ہوگا کہ وہ دنیا کی ناخوشگوار باتوں کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دے گا۔ جس آدمی کی حساسیت آخرت کے بارہ میں زندہ ہو، اس کی حساسیت دنیا کے بارہ میں کم ہو جائے گی۔ اسی کا نام صابرانہ روش ہے۔

۱۰ جون ۱۹۹۳

ایک صاحب نے کہا کہ آجکل ہندوؤں میں "ہندو راشٹر" کی تحریک چل رہی ہے۔ اس ملک کو وہ لوگ ہندو اسٹیٹ بنا دینا چاہتے ہیں، پھر آپ اس کے خلاف کیوں نہیں لکھتے۔ میں نے کہا کہ مجھے اس کے خلاف لکھنے کی ضرورت نہیں۔ تاریخ نے پہلے ہی اس کے خلاف مجھ سے زیادہ طاقتور انداز میں لکھ رکھا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ میں نے کہا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے مہاتما گاندھی نے جو تحریک چلائی، اس میں ان کا کہنا تھا کہ آزادی کے بعد ہم بھارت میں رام راجیہ بنائیں گے۔ مگر ۱۹۴۷ میں جب بھارت آزاد ہوا تو یہاں رام راجیہ نہیں بنا بلکہ سیکولر راجیہ بنا۔ پھر آج جو لوگ ہندو راشٹریہ کی تحریک چلا رہے ہیں وہ کیسے اس میں کامیاب ہوں گے جبکہ وہ مہاتما گاندھی سے بہت چھوٹے لوگ ہیں۔

میں نے کہا کہ اس طرح کے معاملات میں ہمیشہ تاریخی قوتوں کو دیکھنا چاہئے نہ کہ کسی شخص یا کچھ اشخاص کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو۔ الفاظ منھ سے نکل کر ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ کسی ملک کے نظام کو جو چیز بتاتی ہے وہ تاریخ کی قوتیں ہیں نہ کہ نعرے اور الفاظ۔

۱۱ جون ۱۹۹۳

سولھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک خاص طور پر مسلمانوں کے سیاسی دبدبہ کا زمانہ رہا ہے۔ اس زمانہ میں عالمی سطح پر مسلمانوں کی حسب ذیل سلطنتیں قائم تھیں :

ترکی میں سنی عثمانیوں کی سلطنت	۱۹۱۹ — ۱۳۷۲ء
ہندستان میں مغلوں کی سلطنت	۱۸۵۸ — ۱۵۲۶ء
ایران میں شیعہ صفویوں کی سلطنت	۱۷۲۲ — ۱۵۰۰ء

عجیب بات ہے کہ یہی تین سو سال کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب کہ یورپ میں جدید سائنس پروان چڑھی۔ مگر مذکورہ مسلم سلطنتوں میں سے کسی ایک سلطنت نے اس کو اہمیت نہ دی۔ اس وقت کے مسلمان سیاسی اقتدار کو سب کچھ سمجھتے رہے۔ حالاں کہ زمانہ تیزی سے اس دور کی طرف جا رہا تھا جب کہ علمی اقتدار سب سے بڑی چیز بن جائے۔

۱۲ جون ۱۹۹۳

ہندستان میں جو مسلمان آئے وہ چار بڑی نسلوں سے تعلق رکھتے تھے ـــــ عرب، ترک، ایرانی، افغانی۔ ان لوگوں نے یہاں حکومتیں قائم کیں۔ انگریزوں نے جو تاریخیں لکھیں، ان میں اپنی آمد کو تو انگریزی آمد کہا، عیسائی کی آمد نہیں کہا۔ مگر مذکورہ نسلوں کی آمد کو انھوں نے "مسلمان کی آمد" کہا۔ اس سے ہندو مسلم نفرت پیدا ہوئی۔ اگر انگریزوں ہی کی طرح ان مسلمانوں کی آمد کو عربوں کی آمد، ترکوں کی آمد، ایرانیوں کی آمد اور افغانیوں کی آمد کہا جاتا تو یہاں مسلمانوں کے خلاف یا اسلام کے خلاف نفرت پیدا نہ ہوتی۔

۱۳ جون ۱۹۹۳

ڈاکٹر جلیل احمد خاں ملاقات کے لئے آئے۔ وہ رڑکی کے رہنے والے ہیں۔ آجکل وہ باغپت کے پبلک ہیلتھ سنٹر میں میڈیکل آفیسر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جب اجودھیا میں بابری مسجد ڈھائی گئی تو رڑکی میں تناؤ پیدا ہوا۔ پولیس نے شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی۔ اس کے باوجود بعض مقامی مسلم لیڈروں نے جوش دلایا۔ پولیس والوں نے مسلمانوں کو منع کیا کہ شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ ہے۔ آپ لوگ جلوس نہ نکالیں، مگر مسلمان نہیں مانے۔ انھوں نے

۸ دسمبر کو جلوس نکال دیا۔ نعرہ لگاتا ہوا یہ جلوس جب بازار میں پہنچا تو کچھ نوجوان تشدد پر اتر آئے۔ کسی نے ہندو حلوائی کی دودھ کی کڑھائی الٹ دی۔ کسی نے اور کچھ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس نے لاٹھی چارج کر دیا۔ بہت سے لوگ بری طرح زخمی ہوئے۔ ۱۰۵ مسلمان گرفتار کرلئے گئے۔ جن پر مقدمہ چل رہا ہے۔

مگر عین انھیں حالات میں رڑکی کے مجھی محلہ میں کچھ نہیں ہوا۔ یہ خالص مسلم محلہ ہے اور اس کے سرے پر گیٹ لگا ہوا ہے۔ دفعہ ۱۴۴ لگی تو مجھی محلہ کے مسلمانوں نے پولیس سے کہہ دیا کہ ہمارے محلہ کا کوئی آدمی جلوس میں شامل نہیں ہوگا۔ اگر ہمارا کوئی نوجوان آپ کو گیٹ کے باہر ملے تو آپ اس کو گولی مار سکتے ہیں۔ مگر آپ لوگ گیٹ کے باہر رہیں، گیٹ کے اندر داخل نہ ہوں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پولیس مجھی محلہ کے اندر داخل نہیں ہوئی۔ اندر اندر مسلمانوں کی ساری سرگرمیاں جاری رہیں۔ محلہ کی مسجد میں باقاعدہ نماز ہوتی رہی۔ محلہ کے اندر مکمل امن رہا۔ پولیس نے محلہ کے لوگوں پر کسی بھی قسم کا ظلم نہیں کیا۔ بلکہ ان کی روش پر ان کو مبارکباد دی۔

۱۴ جون ۱۹۹۳

ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ کے شمارہ مئی ۱۹۹۲ میں سورش کاشمیری کا ایک مضمون سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے بارہ میں چھپا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ شاہ صاحب کو انگریزوں سے سخت نفرت تھی۔ فرنگ دشمنی اور یورپ بیزاری میں وہ آخری حد تک پہنچے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی 'لعنت بر پدر فرنگ' کا نعرہ اس زور سے بلند کرتے کہ درو دیوار گونج اٹھتے۔ (صفحہ ۴۶)

یہی اس زمانہ کے علماء کا عام حال تھا۔ ان کے دلوں میں انگریزوں کے لئے نفرت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ دوسری طرف مسلم لیگ کے دو قومی نظریہ سے متاثر مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ یہود اور ہنود اسلام کے ازلی دشمن ہیں۔

یہی وہ منفی نفسیات تھی جس کی بنا پر مسلمانوں میں دعوت کا ذہن نہیں ابھرا۔ دعوت کا تقاضا ہے کہ آپ کے دل میں مدعو کے لئے محبت اور خیر خواہی کے جذبات ہوں۔ انگریزوں کے لئے آپ کی زبان سے 'رحمت بر فرنگ' کے الفاظ نکلیں اور ہنود کو آپ اپنے دوست کی نظر سے دیکھتے ہوں۔ جن لوگوں سے آپ پیشگی طور پر متنفر ہو جائیں ان کو آپ دین رحمت کا

مخاطب بنانے کے لئے بے چین نہیں ہو سکتے۔

بیرونی انگریز اور ملکی ہنود سے اس نفرت کا اصل سبب سیاست تھا۔ یہی یہ بات ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے ملک میں آزادی اور تقسیم ہند کے نام سے جو دو تحریکیں اٹھیں وہ دونوں کی دونوں غیر اسلامی تحریکیں تھیں۔ اسلامی تحریک وہ ہے جو اپنے متاثرین کے اندر مطلوب نفسیات کو ابھارے۔ جو تحریک لوگوں میں اسلام کی مخالف نفسیات پیدا کرے وہ صحیح اسلامی تحریک نہیں ہو سکتی۔

۱۵ جون ۱۹۹۳

پہلے زمانہ میں زیادہ بڑی ترقی کا حوصلہ صرف کچھ افراد کر سکتے تھے۔ اس لئے پہلے سے زیادہ بڑی خرابی بھی صرف کچھ افراد کے اندر پیدا ہوتی تھی۔ بیشتر لوگ اپنے حال پر قانع رہ کر پر امن زندگی گزارتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں صنعتی انقلاب کے بعد پیداشدہ حالات نے اعلیٰ ترقی کو ہر آدمی کا خواب بنا دیا۔ اب ہر آدمی اعلیٰ ترقی کی طرف دوڑنے لگا۔ اس لئے خرابیاں مقدار اور نوعیت دونوں کے اعتبار سے بہت بڑھ گئیں۔ پہلے اگر وہ ایک فیصد تھیں تو اب صد فیصد ہو گئیں۔

موجودہ زمانہ میں ڈیموکریسی کی وجہ سے ہر شخص یہ سمجھنے لگا کہ میں اقتدار تک پہنچ سکتا ہوں۔ اس کی وجہ سے عمومی پولٹیکل کرپشن پیدا ہوا۔ جدید ذرائع معاش کی وجہ سے ہر شخص کو دکھائی دینے لگا کہ وہ بڑا دولت مند بن سکتا ہے۔ اس بنا پر اقتصادی اکسپلائیٹشن عمومی فتنہ کی حیثیت اختیار کر گیا۔ جدید پریس کا دور آنے کی وجہ سے ہر شخص محسوس کرنے لگا کہ وہ بھی شہرت کا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔ اس طرح ایسا ہوا کہ کام کرنے کے بجائے شہرت حاصل کرنا بذات خود لوگوں کا مطلوب و مقصود بن گیا۔ ایسے دور میں اگر کوئی شخص فتنہ میں پڑنے سے بچ جائے تو وہ فانی بدایونی کے اس شعر کا مصداق ہوگا:

فریب جلوہ اور کتنا مکمل اے معاذاللہ　　بڑی مشکل سے دل کو بزم عالم سے اٹھا پایا

۱۶ جون ۱۹۹۳

۱۹۴۵ — ۱۹۵۵ کے درمیان میں اعظم گڑھ میں تھا۔ وہاں اکثر میں ڈی اے وی

کالج کا نام سنا تھا۔ جس کے ہندو پرنسپل ہمارے گھر "باقی منزل" کے عین سامنے سڑک کے دوسری طرف رہتے تھے۔ مگر ڈی اے وی کا مطلب آج سمجھ میں آیا جب کہ میں نے انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (۱۶ جون) میں صفحہ ۱۲ پر ایک رپورٹ پڑھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ ڈی اے وی (Dayanand Anglo-Vedic) موومنٹ کا مخفف ہے۔ یہ تعلیمی تحریک مہاتما ہنس راج نے چلائی جو پنجاب کے ایک گاؤں بجواری میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے ۲۹ سال تک کسی تنخواہ یا معاوضہ کے بغیر یہ خدمت کی۔ ۱۸۸۳ میں انھوں نے لاہور میں پہلا ڈی اے وی اسکول کھولا جس کے وہ خود ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ ترقی کرکے ۱۸۸۶ میں ڈی اے وی کالج بن گیا۔ اس طرح سارے ملک میں اس تحریک کے تحت ۵۵۰ تعلیمی ادارے قائم ہوئے جو اب تک چل رہے ہیں۔

برٹش دور میں ہندوؤں میں اس طرح کے بہت سے مصلح پیدا ہوئے جنھوں نے کثیر تعداد میں تعلیمی ادارے قائم کیے۔ اور ہر طرح کی کوشش کے ذریعہ ہندوؤں کو تعلیم میں آگے بڑھایا۔ موجودہ ہندستان میں ہندو ہر میدان میں مسلمانوں سے آگے ہیں۔ اس کی وجہ ان کا یہی تعلیمی تقدم ہے نہ کہ کسی قسم کا تعصب۔

۱۷ جون ۱۹۹۳

آجکل ہر آدمی یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے کہ مسلمانوں میں قیادت کا فقدان ہے۔ مگر مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں نتیجۂ قیادت کا فقدان ہے۔ نتیجۂ قیادت کے فقدان کو لوگ خود قیادت کے فقدان پر محمول کر رہے ہیں۔

۱۹۴۷ سے پہلے اور ۱۹۴۷ کے بعد مسلمانوں میں بہت بڑے بڑے قائدین ابھرے۔ لاکھوں اور کروڑوں مسلمانوں نے ان کا ساتھ دیا۔ انھوں نے وقتی طور پر بڑے بڑے ہنگامے کھڑے کیے۔ مگر جہاں تک نتیجہ کا تعلق ہے، ان قیادتی ہنگاموں کا کچھ بھی فائدہ ملت کو نہیں ملا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان اپنی جذباتیت اور عجلت پسندی کی وجہ سے صرف ان قائدین کے پیچھے دوڑتے رہے جو بڑے بڑے الفاظ بولتے ہوں۔ حالاں کہ ایسے قائدین کی قیادت قوم کو گڑھے میں گرانے کے سوا کوئی اور کارنامہ انجام نہیں دیتی۔

۱۹۴۷ سے پہلے بھی قوم کے اندر ایسے لوگ موجود تھے اور آج بھی موجود ہیں جو انھیں سنجیدہ رہنمائی دیتے ہوں مگر غلط قومی مزاج کی بنا پر ایسے لوگوں کو عمومی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ خلاصہ یہ ہے کہ آج ملت مسلمہ کا اصل مسئلہ فقدان مزاج ہے نہ کہ فقدان قیادت۔ لوگوں کے اندر صالح مزاج نہیں، اس لئے ان کے درمیان کوئی صالح قیادت بھی نہیں ابھرتی۔

۱۸ جون ۱۹۹۲

لارڈ ایکٹن (۱۹۰۲ – ۱۸۳۴) ایک مغربی مفکر ہے۔ وہ جرمنی میں پیدا ہوا۔ اور پھر انگلینڈ میں سکونت اختیار کرلی۔ اس کا قول ہے کہ اقتدار بگاڑتا ہے، اور کامل اقتدار تو بالکل ہی بگاڑ دیتا ہے:

Power corrupts, and absolute power corrupts absolutely.

جب تک اقتدار بگاڑتا تھا تو کسی سوسائٹی میں چند ہی لوگ بگڑتے تھے۔ مگر کم از کم ہندستان میں معاملہ اس سے بہت آگے جا چکا ہے۔ یہاں ہر وہ شخص بگڑ جاتا ہے جو سیاست کے میدان میں داخل ہوتا ہے۔ اس طرح یہاں بگڑنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ ہندستان کے لحاظ سے یہ کہنا درست ہوگا کہ سیاست بگاڑتی ہے اور ہندستانی سیاست تو بالکل بگاڑ دیتی ہے:

Politics corrupts, and Indian politics corrupts absolutely.

۱۹ جون ۱۹۹۳

قرآن میں ہے کہ اللہ نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔ کیا وہ خیال کرتا ہے کہ کوئی اس کے اوپر قادر نہیں۔ (البلد ۴ – ۵) اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مشقت میں پیدا کیا جانا ایک خاص مقصد کے لئے ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ آدمی ذاتی تجربہ کے ذریعہ اس حقیقت کو جان سکے کہ قادر مطلق خدا کے مقابلہ میں وہ صرف عاجز کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہی اصل حقیقت ہے۔ معرفت کا پچاس فیصد تعلق اس بات سے ہے کہ آدمی اس حقیقت واقعہ کا ادراک کر سکے۔ مگر اس حقیقت کا ادراک خالص نظری سطح پر کسی انسان کے لئے بے حد مشکل بلکہ شاید ناممکن ہے۔ اس لئے آدمی کو بار بار ایسی مشکلات کا تجربہ کرایا جاتا

ہے جس کے مقابلہ میں آدمی اپنے آپ کو بالکل بے بس کرے اور اس طرح وہ خود شناسی کے درجہ تک پہنچے۔

اس اعتبار سے انسان کو مشقت میں پیدا کرنا اس کے حق میں ایک رحمت ہے۔ کیوں کہ اگر ایسا نہ ہو تو آدمی ہمیشہ جھوٹے بھرم میں رہتا اور کبھی اپنی حیثیت واقعی کا ادراک نہ کر پاتا جبکہ اسی ادراک پر اس کی تمام ترقیوں کا دار و مدار ہے۔

۲۰ مئی ۱۹۹۳

لاہور کے روزنامہ نوائے وقت (جون ۱۹۹۳) کی ایک جلی سرخی یہ ہے: سعودی عرب نے اسرائیل سے کاروبار کرنے والی کمپنیوں کا بائیکاٹ ختم کر دیا۔ اس سرخی کے تحت جو خبر دی گئی ہے وہ یہ ہے:

ریاض سعودی عرب نے اپنی غیر ملکی تجارتی کمپنیوں کا بائیکاٹ ختم کر دیا ہے جو اسرائیل کے ساتھ کاروبار کرتی ہیں۔ کویت اس سے پہلے ہی ایسی کمپنیوں کا بائیکاٹ ختم کر چکا ہے۔ وائس آف امریکہ کے مطابق امریکہ کے ایک یہودی رہنما ہنری لک بین نے کہا ہے کہ سعودی عرب نے انھیں بتایا ہے کہ اس نے امریکی کمپنیوں کا بائیکاٹ ختم کر دیا ہے جو اسرائیل کے ساتھ کاروبار کرتی ہیں۔ امریکن جیوش کانگرس کے ایگزیکٹو ڈائرکٹر ہنری لک بین نے خبر رساں ایجنسی کو بتایا کہ سعودی عہدیداروں نے انکشاف کیا ہے کہ انھوں نے ثانوی بائیکاٹ ایک سال پہلے ختم کر دیا تھا۔ امریکی یہودی رہنما گزشتہ برس سعودی وزیر خارجہ شہزادہ سعود الفیصل سے ملاقات کے لئے ایک وفد لیکر ریاض گئے تھے۔ یاد رہے کہ کویت نے گزشتہ ہفتہ اعلان کیا تھا کہ وہ اب ان کمپنیوں کو بلیک لسٹ نہیں کرے گا جو اسرائیل سے تجارت کرتی ہیں۔

ہندستان کے علماء اور رہنماؤں میں سے کسی نے اس فیصلہ کے خلاف بیان نہیں دیا۔ ہندستانی مسلمانوں کو ہنود سے ہم آہنگی کا مشورہ دیا جائے تو یہ لوگ فوراً اعلان کرتے ہیں کہ یہ بزدلی ہے۔ مگر سعودی عرب اور کویت یہود سے ہم آہنگی اختیار کریں تو اس کے خلاف بولنے کی ان کے اندر جرأت نہیں۔ اسی دو عملی کا نام نفاق ہے۔

ہمارے تمام مسائل اسی تضاد کے پیدا کردہ ہیں۔

۲۱ جون ۱۹۹۳

اب میری عمر زیادہ ہوگئی۔ کمزوری کے علاوہ طرح طرح کے جسمانی عارضے لاحق ہونا شروع ہوگئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یہ جسمانی عارضے گویا ایک قسم کا سگنل ہیں جو بتاتے ہیں کہ دنیا سے رخصت ہونے کا وقت قریب آگیا۔ بڑھاپے کی عمر کے قریب جب آدمی کو ضعف یا بیماری کا تجربہ ہو تو اس کو آہ و فریاد نہیں کرنا چاہئے، بلکہ اس قسم کے تجربات کو چیتاونی کے مفہوم میں لینا چاہئے۔ آہ و فریاد کا کوئی فائدہ نہیں۔ لیکن اگر اس کو چیتاونی کے طور پر لیا جائے تو اس سے آدمی کا احساس جاگے گا، وہ آخرت کی تیاری میں زیادہ باہوش طور پر لگ جائے گا۔

۲۲ جون ۱۹۹۳

تبلیغی جماعت کے کچھ لوگوں نے سوال کیا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر بے حسی بہت زیادہ عام ہے، اس کا سبب کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کا جواب سورہ الحدید کی آیت نمبر ۱۶ میں ہے۔ اس آیت میں قوموں کے بارہ میں ایک فطری قانون بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ طول امد کے بعد ان کے افراد کے اندر قساوت (بے حسی) آجاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کا حل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کا حل یہ ہے کہ ان کی بے حسی توڑی جائے اور دوبارہ ان کے اندر زندہ ایمان پیدا کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ان میں فکری انقلاب لایا جائے۔

انھوں نے کہا کہ ہم فضائل اعمال کے ذریعہ یہی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ فضائل اعمال کا فکری انقلاب سے کوئی تعلق نہیں۔ فضائل اعمال کا طریقہ "اعمال" کے فضائل پر مبنی ہے نہ کہ "فکر" کے فضائل پر۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی کتاب میں اعمال ظاہری کے فضائل تو بیان کئے گئے ہیں مگر معرفت اور خشیت اور تدبر اور تقویٰ کے فضائل کا باب آپ کی کتاب میں موجود نہیں۔

۲۳ جون ۱۹۹۳

ایک مسلمان تاجر جو دلی میں تجارت کرتے ہیں۔ وہ مزید تجارتی مواقع کی تلاش میں دبئی گئے۔ ایک مہینہ قیام کے بعد پرسوں وہ وہاں سے واپس آئے ہیں۔ ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ دبئی میں بے پناہ تجارتی مواقع ہیں۔ وہاں فری زون ہے جس

ہیں آپ ایک پیسہ ٹیکس دیئے بغیر بے روک ٹوک ہر قسم کی تجارت کرسکتے ہیں۔ دفتروں میں دھڑا دھڑ کام ہوتا ہے۔ وہاں کے تجارتی حلقے مجھے انتہائی کوآپریٹیو نظر آئے۔ اب میں نے طے کیا ہے کہ دلی میں اپنا سارا اثاثہ فروخت کرکے دبئی چلا جاؤں اور وہیں پر بزنس کروں۔ میں نے کہا کہ انڈیا اور دبئی کے درمیان تجارتی مواقع کے اعتبار سے جو فرق آپ نے بتایا وہ بالکل درست ہے مگر دونوں ملکوں میں اس کے علاوہ ایک اور فرق بھی ہے، وہ یہ کہ دبئی میں دنیوی خوشحالی کا ٹکٹ ملتا ہے اور انڈیا میں آخرت کی جنت کا ٹکٹ۔

مزید وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ انڈیا میں مسلمانوں کو یہ شکایت ہے کہ ہندو ان کے ساتھ تعصب کرتا ہے، ہندو ان کے ساتھ زیادتی کرتا ہے۔ ہندو انھیں ظلم اور فساد کا شکار بناتا ہے۔ مگر اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو یہ مسلمانوں کے لئے جنت کا ٹکٹ ہے۔ ہندو آپ کے لئے مدعو کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور مدعو کی زیادتیوں پر صبر کرنا بلاشبہ جنت کا سب سے زیادہ یقینی ٹکٹ ہے۔

۲۴ جون ۱۹۹۳

مسٹر عبدالغنی ڈار کشیری (۳۷ سال) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ کشمیر کی تحریک آزادی کے علمبرداروں نے نومبر ۱۹۸۹ میں سرینگر میں دو بم دھاکہ کیا۔ ایک کافی ہاؤس میں اور دوسرا سینما گھر میں۔ یہ تحریک کشیریت کا آغاز تھا۔ اس کے بعد انھوں نے کوئی دھاکہ نہیں کیا۔ بلکہ پر امن مظاہرہ کا طریقہ اختیار کیا جو گاندھی جی کا طریقہ تھا۔ کشیری لوگ بے شمار تعداد میں سڑکوں پر نکل آئے۔ اس کے بعد فروری ۱۹۸۹ میں جماعت اسلامی کشمیر نے جہاد کا نعرہ دیا۔ تقریباً دس ہزار نوجوان ٹرکوں میں بھر کر وہ سرحد پار پاکستانی علاقہ میں لے گئے۔ وہاں انھیں گوریلا وار کی ٹریننگ دی گئی۔ اور پھر ہر نوجوان کو ایک ایک کلاشنکوف دے کر وادی میں بھیج دیا۔ ان تربیت یافتہ نوجوانوں نے مارچ ۱۹۸۹ میں تشدد کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کے جواب میں ہندستانی فوج نے بہت بڑے پیمانہ پر لوگوں کو مارنا شروع کر دیا۔

انھوں نے بتایا کہ میری ملاقات کشمیر میں ایک ہندو فوجی جنرل سے ہوئی۔ اس نے کہا کہ کشیری عوام جب پر امن مظاہرہ کر رہے تھے تو ہمارے لئے ان پر گولی چلانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

فروری میں ہم لوگوں کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں کہا گیا کہ اگر یہی حالات رہے تو ہم کو چند مہینے میں کشمیر چھوڑ دینا پڑے گا۔ مگر مارچ ۱۹۸۹ میں جب کشمیریوں نے گن اٹھائی تو ہم بہت خوش ہوئے کہ اب انھوں نے ہماری جیت کو یقینی بنا دیا۔

انھوں نے بتایا کہ انڈیا کی موجودہ اسکیم یہ ہے کہ کشمیری مسلمانوں کو اتنا خوف زدہ کردو کہ بڑی تعداد میں وہ کشمیر سے باہر چلے جائیں۔ اس کے بعد ہندوؤں کو لاکر وہاں بسانا شروع کر دیا جائے۔ کشمیر کے ہندو مہاجرین ساڑھے تین لاکھ ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً چار لاکھ اور کشمیری ہندو ہیں جو پہلے آکر انڈیا میں آباد ہو گئے۔ ان سب کو وہ وادی میں واپس لے جائیں گے۔ نیز کچھ اور ہندوؤں کو بھی۔ جب وہ دیکھیں گے کہ وادی میں پچاس فیصد سے زیادہ ہندو آبادی ہو گئی ہے تو وہ خود اعلان کر دیں گے کہ ریفرینڈم کرالو۔

۲۵ جون ۱۹۹۳

حدیث خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم کے مطابق قرون مشہود لہا بالخیر صرف تین ہیں ـــــ عہد رسالت، عہد صحابہ، عہد تابعین۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض دینی چیزوں کے ساتھ جو غیر معمولی اعتنا رچرتھے دور، تبع تابعین کے زمانہ میں شروع ہوا اور پھر بڑھتا گیا، وہ پچھلے تین دوروں میں موجود نہ تھا۔ مثلاً فقہ اور حدیث۔

مذکورہ حدیث کو معیار ماننے کے بعد یہ کہنا صحیح ہوگا کہ امت کے لئے نمونہ صرف ابتدائی تین دور ہیں۔ ان تینوں زمانوں میں کسی چیز کے ساتھ جتنا کم یا زیادہ اعتنا کا ثبوت ملے، اتنا ہی کم یا زیادہ اعتنا اس کے ساتھ کیا جانا درست ہے۔ تبع تابعین کے زمانہ میں یا اس کے بعد کے زمانہ میں اس سے مختلف جو نمونے ملتے ہیں وہ انحراف دین کی مثالیں ہیں نہ کہ پیروی دین کی مثالیں۔

۲۶ جون ۱۹۹۳

ریڈرس ڈائجسٹ (جون ۱۹۹۳) میں ایک مضمون چھپا ہے۔ اس میں کامیابی کا راستہ (route of success) کا راز بتایا گیا ہے۔ مضمون نگار کا کہنا ہے کہ آدمی کسی اعتبار سے طاقت ور ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ کئی پہلوؤں سے وہ بے طاقت بھی ہوتا ہے:

Every strength you have, you always possess a multitude of non-strengths.

مضمون نگار نے یہ مشورہ دیا ہے کہ آدمی کو اپنی کمزوریوں کی اصلاح میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہئے بلکہ اپنی طاقت کو عمل میں لاکر کامیابی حاصل کرنا چاہئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ کمزوری (Weakness) کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے اخلاقی کمزوری اور دوسری ہے نیچرل کمزوری۔ نیچرل کمزوری کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص پیدائشی اعتبار سے لٹریری صلاحیت رکھتا ہو مگر وہ تجارتی صلاحیت سے خالی ہو۔ ایسے آدمی کو تاجر بننے کی کوشش نہیں کرنا چاہئے بلکہ لٹریری میدان میں اپنی صلاحیتوں کو لگانا چاہئے۔ دوسری کمزوری وہ ہے جس کو اخلاقی کمزوری کہا جاسکتا ہے مثلاً اشتعال کی باتوں پر مشتعل ہوجانا۔ اس قسم کی کمزوری کو دور کرنا بہت ضروری ہے۔ کیوں کہ ایسی کمزوری کے ساتھ آدمی کسی بھی میدان میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

۲۷ جون ۱۹۹۳

جاہلی دور کے ایک شاعر کا شعر ہے کہ اگر تم دوسروں کو نفع نہیں پہنچا سکتے تو تم ان کو نقصان پہنچاؤ، کیوں کہ جوان مرد سے یہی توقع کی جاتی ہے کہ وہ یا تو نفع پہنچائے گا یا نقصان پہنچائے گا:

اذا انت لم تنفع فضُرَّ فانما يرجى الفتى كيما يضر وينفعا

مولانا علی میاں نے ۶۷ - ۱۹۶۶ کے الکشن کے زمانہ میں فلسفۂ ضرر دریافت کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمان اس ملک میں ہندو حکمرانوں کو نقصان پہنچا کر اپنے لئے زندگی کا حق وصول کریں۔ اس کی عملی صورت انھوں نے یہ تجویز کی کہ مسلمان اپنے ووٹوں کو متحد کرکے حکمراں پارٹی (کانگرس) کو شکست دیں۔ اس طرح ملک کے حکمراں ان کے بارہ میں محتاط ہوجائیں گے۔ اور ان کے حقوق کو صحیح طور پر ادا کرنے لگیں گے۔

یہ بلاشبہ ایک لغو نظریہ تھا۔ کیوں کہ قرآن میں نفع بخش بننے کی تلقین کی گئی ہے نہ کہ ضرر رساں بننے کی۔ مولانا موصوف کے اس نظریہ کا ماخذ مذکورہ جاہلی شعر ہوسکتا ہے مگر قرآن ہرگز اس کا ماخذ نہیں۔

۲۸ جون ۱۹۹۳

اہل دین کی سب سے زیادہ بری حالت وہ ہے جب کہ ان کے یہاں دین کے نام پر سرگرمیاں جاری ہوں۔ مگر حقیقی دین ان کے درمیان سے غائب ہو گیا ہو۔ اس حالت کو ایک لفظ میں دینی انحراف کہا جا سکتا ہے۔ یہ دینی انحراف اس وقت پیش آتا ہے جب کہ دین میں فوکس (مرکز توجہ) کو بدل دیا جائے۔

مثلاً یہ کہ اساسات دین کے بجائے جزئیاتی مسائل پر زور دیا جانے لگے۔ اسی طرح روح دین کے بجائے ظواہر دین، حقیقت کے بجائے الفاظ، فرد کے بجائے سسٹم، روحانیت کے بجائے سیاست، آخرت کے بجائے دنیا، داخلی عمل کے بجائے خارجی دھوم، اصلاح خویش کے بجائے احتجاج غیر، زور اور تاکید کا موضوع بن جائیں۔ یہ وہی چیز ہے جس کو انگریزی میں (shift in emphasis) کہا جاتا ہے۔ یعنی اصل اہمیت والی چیز کو پس پشت ڈال دینا۔ اور جو چیز محض ضمنی حیثیت رکھتی ہے اس کو ساری اہمیت دے دینا۔ یہ حالت جس گروہ کی ہو جائے اس کے درمیان بظاہر دین دکھائی دے رہا ہوگا، مگر اصل دین اس کے یہاں سے غائب ہو چکا ہوگا۔

۲۹ جون ۱۹۹۳

دہلی کے کچھ تعلیم یافتہ مسلمانوں نے ایک تعلیمی سوسائٹی قائم کی ہے۔ اس کا نام فرینڈس آف ایجوکیشن (Friends of Education) ہے۔ اس سوسائٹی نے ملکی سطح پر مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا سروے کرایا ہے۔ اس کی رپورٹ ٹائمس آف انڈیا (۲۹ جون ۱۹۹۳) میں چھپی ہے۔ اس سے معلوم ہوا ہے کہ ۱۹۹۳ میں مختلف ریاستوں اور اردو میڈیم اسکولوں میں دسویں اور بارھویں میں پانچ لاکھ طلبہ امتحان میں بیٹھے۔ ان میں سے تقریباً ۷۰ فیصد طلبہ فیل ہو گئے:

> Nearly 70 per cent of the five lakh students who took the class X and XII examinations in Urdu medium this year have failed. (p. 16)

میں نے اخبار میں اس خبر کو پڑھا تو اتنا شدید تاثر ہوا کہ میرے دل میں اختلاج کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ طلبہ سب کے سب مسلمان تھے۔ میں نے سوچا کہ مسلمانوں کی تعلیمی

حالت اتنی زیادہ گرگئی ہے کہ وہ اردو میڈیم اسکولوں میں بھی کامیاب نہیں ہوسکتے جہاں تمام ٹیچر اور پوری انتظامیہ مسلمانوں کی ہوتی ہے تو پھر وہ دوسرے اسکولوں میں اور دوسرے تعلیمی شعبوں میں کس طرح کامیابی حاصل کرسکیں گے۔

مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے ہر روز مسلمانوں کے خلاف غیر مسلموں کے فساد کا رونا روتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعلیمی گراوٹ تمام فسادوں سے زیادہ بڑا فساد ہے۔ حتی کہ یہی تعلیمی پستی تمام فسادوں کی اصل جڑ ہے۔

۳۰ جون ۱۹۹۳

قومی آواز (۳۰ جون) میں ایک دلچسپ قصہ چھپا ہے۔ ایک ہندو پروڈیوسر نے ایک پکچر بنائی۔ اس کی کہانی نکاح و طلاق پر مبنی تھی۔ چنانچہ اس کا نام "طلاق طلاق طلاق" رکھا گیا تھا۔ جس زمانہ میں وہ فلم سینما ہاؤس میں دکھائی جا رہی تھی، ایک مسلمان عورت نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ فلاں ہال میں کون سی پکچر چل رہی ہے۔ مرد نے کہا "طلاق طلاق طلاق" مقامی حنفی مولوی کو پتہ چلا تو اس نے فتویٰ دے دیا کہ دونوں میں طلاق پڑ گئی۔ اور اب وہ عورت اس کے شوہر کے لئے حرام ہے۔ اس کے بعد پروڈیوسر نے فلم کا نام بدل کر "نکاح" رکھ دیا۔

تطلیقات ثلاثہ کے معاملہ میں احناف بلاشبہ غلطی پر ہیں۔ قرآن کے مطابق، طلاق تین مہینہ میں مکمل ہوتی ہے۔ اگر کسی شخص نے پہلی ہی مجلس میں طلاق طلاق طلاق کہہ دیا تو رسول اللہؐ اور ابو بکر صدیقؓ نے پھر بھی اس کو ایک طلاق قرار دیا۔ عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں بھی ابتداً اسی پر عمل رہا۔ اس کے بعد بعض اشخاص کے تین طلاق کو تین قرار دیتے ہوئے آپ نے علیحدگی کرادی۔ تاہم گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو حضرت عمر کا یہ فعل محض ایک ایگزیکیٹو حکم تھا، وہ کوئی شرعی مسئلہ نہ تھا۔ چنانچہ اس کے باوجود تینوں فقہی مکاتب نے اس کی بنا پر شرعی مسئلہ کو نہیں بدلا۔

مگر حنفی فقہ کا ایک مخصوص مزاج ہے۔ اس میں نیت سے زیادہ فارم کو اہمیت دیدی گئی ہے۔ اپنے اس مزاج کی بنا پر احناف نے تین طلاق کو تین طلاق قرار دے دیا۔ یہ کام انھوں نے اصلاً اپنے مزاج کی بنا پر کیا تھا۔ مگر حضرت عمرؓ کے مذکورہ استثنائی فعل میں چوں کہ انھیں اپنی تائید مل رہی تھی، اسی لئے انھوں نے اس کو بطور دلیل لے لیا۔ حالاں کہ حضرت عمر کا فعل یقینی

طور پر ایک ایگزیکٹیو حکم تھا جو وقتی طور پر کسی متعین فرد کے لئے دیا جاتا ہے۔ اگر کسی کو اصرار ہو کہ وہ ایک شرعی مسئلہ کے طور پر تھا تب بھی قرآن و سنت کو دیکھتے ہوئے اسے ایک اجتہادی خطا کہا جائے گا، اور اجتہادی خطا قابل تقلید نہیں ہوتی۔

یکم جولائی ۱۹۹۳

نظام الدین میں ہمارے مکان کے سامنے نصف درجن اشوک کے درخت لگائے گئے تھے۔ درخت تیزی سے لمبے ہو گئے۔ مگر ان کا تنہ پتلا تھا۔ تیز ہوا چلتی تو درخت اس طرح جھک جاتے جیسے وہ ٹوٹ جائیں گے۔ ایک مالی نے بتایا کہ اشوک کے درخت شروع میں کئی سال تک کاٹے جاتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے ہر درخت کا اوپر کا نصف حصہ کٹوا دیا۔ اس طرح اب تک غالباً چار بار کاٹا جا چکا ہے۔ کل پھر مالی نے اوپر کا آدھا درخت کاٹ دیا۔ اب تنے موٹے دکھائی دے رہے ہیں۔

یہ قدرت کا ایک قانون ہے۔ کبھی بڑھوتری کو روکا جاتا ہے تاکہ استحکام کا مقصد حاصل ہو سکے۔ استحکام (consolidation) کے بغیر توسیع (expansion) کا کوئی فائدہ نہیں۔

۲ جولائی ۱۹۹۳

انڈیا ٹوڈے کے ایڈیٹر مسٹر شیکھر گپتا نے اسلام آباد میں وزیر اعظم پاکستان مسٹر نواز شریف کا انٹرویو لیا جو انڈیا ٹوڈے کے شمارہ ۳۰ جون ۱۹۹۳ میں چھپا ہے۔ ایک سوال یہ تھا کہ انڈیا اور پاکستان کے تعلقات میں بہتری کیوں نہیں آ رہی ہے۔ مسٹر نواز شریف نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ دونوں ملکوں کو اب اپنا رجحان بدلنا چاہئے۔ انڈیا اور پاکستان کو اب صرف اقتصادیات کے میدان میں لڑنا چاہئے۔

India and Pakistan should fight only in the field of economy (55).

اپنے حریف کو تخریب کے میدان سے نکال کر تعمیر کے میدان میں لانا بہت اچھا تخیل ہے۔ مگر اس کے لئے کچھ قربانی دینا پڑے گی۔ قربانی کے بغیر ایسا ہونا ممکن نہیں۔ بدقسمتی سے اس قربانی کے لیے نہ پاکستان کے لیڈر تیار ہیں اور نہ ہندستان کے لیڈر۔

۳ جولائی ۱۹۹۳

مسلمان اس پر فخر کرتے ہیں کہ وہ خاتم الرسل کی امت ہیں۔ مگر خاتم الرسل کی امت ہونا ایک

جان لیوا ذمہ داری کا معاملہ ہے نہ کہ فخر کا معاملہ۔ میں اس کو ایک مجرمانہ فعل سمجھتا ہوں کہ خاتم الانبیاء کی امت ہونے پر فخر کیا جائے اور خاتم الانبیاء کی امت ہونے کی ذمہ داری کو ادا نہ کیا جائے۔ یہ ذمہ داری دعوتی ذمہ داری ہے۔ ختم نبوت کے بعد مسلمان مقام نبوت پر ہیں۔ اب ان کو انذار و تبشیر کی ذمہ داری کو ادا کرنا ہے جس کے لئے پیغمبر مبعوث ہوتے تھے۔ یہ ذمہ داری اتنی شدید ہے کہ اگر اس کا واقعی احساس ہو تو آدمی اپنے آپ کو احساس تقصیر میں مبتلا پائے گا نہ کہ احساس فخر میں۔

۴ جولائی ۱۹۹۲

سنڈے آبزرور (۴ جولائی) میں ایک رپورٹ پڑھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ہندو خاندانوں میں یہ ذہن بہت بڑھ رہا ہے کہ لڑکیوں کو پیٹ ہی میں ختم کر دیا جائے۔ اس کے لئے جدید سائنٹفک آلات سے مدد لی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لڑکیوں کی شادی کے لئے ماں باپ کو بہت زیادہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ بڑی ڈاوری کے بغیر اچھا شوہر ملنا ناممکن ہو گیا ہے۔ چنانچہ کہا جانے لگا ہے کہ آج پانچ سو روپیہ خرچ کرو اور پانچ لاکھ روپیہ بعد کو بچا لو:

Spend Rs. 500 now and save Rs. 5 lakh later.

۵ جولائی ۱۹۹۳

۱۸۵۷ تک مسلمان برصغیر ہند میں حاکم کی حیثیت رکھتے تھے، اس کے بعد برٹش دور آیا۔ نئے نظام میں ان کو ہندو فرقہ کے مقابلہ میں برابر کی حیثیت دی گئی۔ ۱۹۴۷ کے بعد سیکولر دستور کے تحت انھیں اقلیت کی حیثیت ملی۔ مگر مسلمان تینوں دور میں اپنی ذمہ داری پورا کرنے میں ناکام رہے۔

مسلمان جب اس ملک میں حاکم کی پوزیشن میں تھے تو انھوں نے ہندوؤں کو حقیر سمجھا حالاں کہ وہ ان کے لئے مدعو قوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ برٹش دور میں جب وہ برابر کی حیثیت میں ہو گئے تو انھوں نے اپنی مدعو قوم سے نزاع کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ۱۹۴۷ کے بعد جب انھیں اکثریت کے مقابلہ میں اقلیت کا درجہ دیا گیا تو وہ احتجاج اور فریاد کا دفتر لے کر بیٹھ گئے۔

یہ سب غیر داعیانہ مزاج کے نتائج ہیں۔

۶ جولائی ۱۹۹۳

قرآن میں کعبہ کے بارے میں ہے کہ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ (آل عمران ۹۶) کعبہ اول البیت کیسے ہے۔ اس کے بارہ میں تفسیروں میں کئی رائیں نقل کی گئی ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ آدم کی تخلیق سے دو ہزار سال پہلے فرشتوں نے اس کو تعمیر کیا تھا۔ فرشتوں نے اس کو بیت معمور کے نمونہ پر بنایا (تفسیر مظہری ۹۲/۲)

یہ ایک بے بنیاد تفسیر ہے۔ کعبہ "الناس" کے لئے بنایا گیا۔ پھر جب الناس کا سرے سے وجود ہی نہ ہو تو کعبہ کی تفسیر کس کے لئے کی جائے گی۔ اس تفسیر کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ 'اول' کے لفظ کو اس کے منطقی معنی میں لے لیا گیا۔ حالاں کہ اس طرح کے الفاظ کبھی منطقی معنی میں نہیں ہوتے۔

۷ جولائی ۱۹۹۳

جناب رحمٰن نیر صاحب نے بتایا کہ ایک شخص نے لکھا ہے کہ جب تم چالیس سال کے ہو جاؤ تو تم اپنی عادتوں کو بدل دو۔ یہ ایک سادہ سی بات ہے مگر وہ بے حد اہم بات ہے۔ خود میرا ہرنیا کا آپریشن اسی اصول سے انحراف کا نتیجہ تھا۔

میں اپنے کمرہ کی کھڑکی سے دیکھتا تھا کہ پارک میں لوگ ورزش کرتے ہیں اور کودتے ہیں۔ میں بھی اپنے کمرہ میں صبح کے وقت کودنے لگا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس سے میری صحت اچھی ہوگی۔ مگر وہ میرے لئے الٹا پڑا۔ مجھے کودنا یاد تھا۔ اور عمر کا پہلو میں بھول گیا۔ بہت سے لوگوں کی طرح مجھے ہرنیا کا معمولی اثر تھا جس کو میں لنگوٹ باندھ کر کنٹرول کر سکتا تھا۔ مگر کودنے کی وجہ سے آنت اتنی باہر آ گئی کہ وہ کنٹرول سے باہر تھی۔ اب یہی صورت تھی کہ ان کا آپریشن کرایا جائے۔

آپریشن، خواہ وہ چھوٹا آپریشن کیوں نہ ہو، وہ جسم کے نظام میں جارحانہ مداخلت ہے۔ آدمی کو ہر وہ تدبیر کرنا چاہئے جو اس کو آپریشن سے بچانے والی ہو۔ آپریشن صرف اس وقت کرانا چاہئے جبکہ آخری مجبوری کا درجہ آ جائے۔

۸ جولائی ۱۹۹۳

نیاز احمد صاحب (132/246, Babupura, Kanpur-208023) جون میں دو ہفتے کے لئے کشمیر گئے تھے۔ وہاں وہ اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ دو ہفتہ رہے۔ سری نگر اور اننت ناگ میں

زیادہ قیام رہا۔ انھوں نے اپنے کئی تجربے بتائے۔

اس دوران اُن کا سامنا فوجیوں سے ہوا۔ وہ اگر چہ شیروانی اور ٹوپی پہنے ہوئے تھے اور صاف نظر آتا تھا کہ وہ مسلمان ہیں۔ مگر ہندستانی فوجیوں نے کبھی ان کے ساتھ برا سلوک نہیں کیا۔ ایک بار وہ شالیمار باغ کے پاس کھڑے ہوئے تھے کہ اتنے میں انڈین ملٹری کا ایک آدمی آگیا۔ وہ وردی میں تھا اور گن لئے ہوئے تھا۔ نیاز صاحب نے اس کو دیکھتے ہی کہا کہ آداب عرض ہے۔ اس کے بعد وہ مسکرایا اور قریب آکر اچھے انداز میں باتیں کرتا رہا۔ آخر میں پاس کے ایک اسٹال پر لیجا کر ان کو اور ان کے ساتھی کو چائے پلائی۔

گفتگو کے دوران فوجی آدمی نے بتایا کہ ہم بھی انسان ہیں۔ کوئی پیار کے ساتھ بولے تو ہمارے دل میں بھی اس کے لئے پیار آئے گا۔ مگر کشمیریوں کا یہ حال ہے کہ وہ ہم سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ اگر ہم ایک گلاس پانی مانگیں تو وہ ہم کو پانی پینے کے لئے نہیں دیں گے۔ پھر آپ جانتے ہیں کہ نفرت کے جواب میں نفرت ہی پیدا ہوتی ہے۔

۹ جولائی ۱۹۹۳

نظام الدین احمد صاحب کا وطن حیدر آباد ہے۔ مگر اب وہ عرصہ سے بمبئی میں رہتے ہیں۔ بمبئی میں ان کا ٹیلیفون نمبر یہ ہے (6127648, 61286361) انھوں نے بتایا کہ ۱۹۸۷ میں میں لیبر منسٹری کے تحت کلکتہ میں تھا۔ میں حیدر آباد سے کلکتہ جا رہا تھا۔ درمیان میں ناگپور کا اسٹیشن آیا۔ صبح کا اخبار پلیٹ فارم سے خریدا۔ اس کے پہلے صفحہ پر یہ سرخی تھی کہ کلکتہ میں دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم :

Shoot at sight order in Calcutta.

ناگپور میں میری ایک رشتہ داری تھی۔ خیال ہوا کہ یہیں اتر جاؤں۔ پھر میں جی کو ٹھا کر کے چلا گیا۔ ہوڑہ اسٹیشن پر اترا تو وہاں زندگی بالکل نارمل تھی۔ اسٹیشن سے قیام گاہ تک شہر بالکل نارمل دکھائی دیا۔ انھوں نے کہا کہ اس قسم کا واقعہ ہمیشہ شہر کے کسی گوشہ میں ہوتا ہے۔ مگر اخبار والے اس طرح خبر بناتے ہیں جیسے سارے شہر میں گولیاں چل رہی ہیں۔ دسمبر ۱۹۹۲ میں تمام اخباروں میں یہ خبریں چھپ رہی تھیں کہ بمبئی میں فساد۔ میں اسی بمبئی میں تھا مگر میرے

علاقہ میں کہیں کوئی فساد کا نشان دکھائی نہیں دیا۔ کیوں کہ فساد بمبئی کے ایک مخصوص علاقہ میں تھا نہ کہ سارے بمبئی میں۔

۱۰ جولائی ۱۹۹۳

شمیم احمد صاحب دہلی میں وسنت وہار میں رہتے ہیں۔ وہ کمال صاحب کے ساتھ ملاقات کے لئے آئے۔ کمال صاحب نے بتایا کہ دہلی میں ان کے پانچ گیرج کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ ان کے پاس کار ہے۔ ذاتی مکان ہے۔ بچے اچھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ زندگی کی تمام سہولتیں حاصل ہیں۔

شمیم صاحب نے گفت گو کے دوران کہا کہ "ہندو قوم تو مسلمانوں کی دشمن ہے"۔ مزید گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میرے گاہک ۹۹ فیصد ہندو ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ جب ہندو قوم مسلمانوں کی دشمن ہے تو وہ ۹۹ فیصد آپ کو بزنس دے کر آپ کی خوش حالی کا سبب کیوں بنی ہوئی ہے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اندر سوچنے کی صلاحیت بالکل ختم ہو گئی ہے، حتی کہ وہ اپنے ذاتی تجربہ سے بھی کوئی سبق نہیں لے پاتے۔ مسلمانوں کی زرد صحافت اور ان کی زرد قیادت نے جو الفاظ ان کے دماغ میں بھر دئے ہیں، وہ بس اتنا ہی جانتے ہیں۔ ان کے اندر یہ صلاحیت مفقود ہو گئی ہے کہ اپنی عقل سے سوچ کر کسی بات کو جانیں۔ اسی کو کہتے ہیں عقل پر پتھر پڑ جانا۔

۱۱ جولائی ۱۹۹۳

عابد سعید بجرا سی ایم اے پاکستان گئے تھے۔ وہاں ۲۲ دن کراچی وغیرہ میں رہے۔ انھوں نے بتایا کہ ایم کیو ایم (مہاجر قومی موومنٹ) کے لیڈر الطاف حسین جو لندن میں پناہ گزیں ہیں۔ وہاں سے وہ ٹیلیفون پر دو گھنٹہ تک تقریر کرتے ہیں۔ پاکستان میں لوگ کسی میدان میں جمع ہو جاتے ہیں اور لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ ان کی تقریر یہاں سنتے ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ پاکستان کے لوگ اب ایم کیو ایم سے سخت متوحش ہو گئے ہیں اور اس کو مہاجر قومی موومنٹ کے بجائے متنقل قومی مصیبت کہتے ہیں۔

۱۲ جولائی ۱۹۹۲

ایک عرب پروفیسر نے کہا کہ آپ کی کتاب الاسلام یتحدی (مذہب اور جدید چیلنج) ساری مسلم دنیا میں نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھی گئی۔ آج بھی اس موضوع پر وہ ایک منفرد کتاب ہے۔ آپ کو اسی قسم کی کتابیں لکھنا چاہیے تھا۔ ایسی کتابوں کے ذریعہ آپ ساری مسلم دنیا کے علمی ہیرو بن جاتے۔ مگر بعد کو آپ ایسی کتابیں لکھنے لگے جس میں اسلامی تحریکوں اور اسلامی شخصیتوں پر تنقید ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے لوگ آپ سے بدک گئے۔

میں نے کہا کہ الاسلام یتحدی تو اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ لکھوایا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ معجزہ بار بار نہیں دکھایا جاتا۔ میرا اصل کام وہی ہے جس کو میں اب کر رہا ہوں۔ الاسلام یتحدی کلامی موضوع سے متعلق ایک کتاب ہے۔ جب کہ میرا اصل مشن تجدید دین ہے۔

۱۳ جولائی ۱۹۹۲

میرے پاس اکثر ایسے مسلمان آتے ہیں جو ملی معاملات پر سوالات کرتے ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ یہ لوگ نہ سوال کرنے میں سنجیدہ ہوتے ہیں اور نہ سوال کا جواب پانے سے انھیں کوئی خاص دلچسپی ہوتی ہے۔ بس موضوع گفت گو کے طور پر کچھ سوال کریں گے۔ اور سطحی گفت گو کرتے چلے جائیں گے۔

مجھے ایسے لوگوں پر بہت تعجب ہوتا ہے۔ کیوں کہ میں نے اپنی ساری زندگی میں ایک بار بھی ایسا نہیں کیا۔ اگر مجھے سوال کرنا ہو تو متعلقہ موضوع کا مطالعہ کرکے سب سے پہلے میں یہ سمجھنے کی کوشش کروں گا کہ سوال کی نوعیت کیا ہے۔ اور کیا سوال بنتا ہے۔ پھر جب کسی سے سوال کروں گا تو اس کے جواب کو انتہائی غور کے ساتھ سنوں گا۔ اور خالی الذہن ہو کر اس کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کروں گا۔

۱۴ جولائی ۱۹۹۲

ایک صاحب سے گفت گو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اعلیٰ ربانی کیفیات کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس قسم کی کیفیات کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو خود بھی ان کیفیات سے آشنا ہوا ہو۔ ان کیفیات کو لفظوں میں بیان کرنے والی زبان صرف آخرت میں حاصل ہوگی، دنیا میں ایسی

زبان کا ملنا ممکن نہیں۔

۱۵ جولائی ۱۹۹۳

ڈاکٹر عبدالکریم نائک بمبئی میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ دسمبر ۱۹۹۲ میں بمبئی میں جو فساد ہوا اس کی شروعات مسلمانوں نے کی تھی۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جب یہ خبر ملی کہ اجودھیا کی بابری مسجد توڑ دی گئی تو بمبئی کی منارہ مسجد میں کچھ نوجوان مولویوں نے پُرجوش تقریریں کیں اور مسلمانوں کو جہاد پر ابھارا۔ اسی رات کو کچھ مسلمانوں نے علاقہ کے دو پولیس والوں پر حملہ کیا۔ ایک کو مار ڈالا اور دوسرا سخت زخمی ہوگیا۔ اس کے بعد ۷ دسمبر کو مسلمانوں نے جوگیشوری میں تشدد کا آغاز کیا۔ اس کے بعد فسادات شروع ہوئے۔

یہی ہندستان کے ہر فساد کی کہانی ہے۔ مگر مسلمانوں کے جھوٹے لیڈر جب فساد کی رپورٹ چھاپتے ہیں تو واقعہ کا پہلا حصہ حذف کر دیتے ہیں۔ وہ صرف واقعہ کا دوسرا حصہ چھاپتے ہیں۔ اس کی وجہ سے بظاہر لوگوں کو نظر آتا ہے کہ مسلمان تو معصوم ہیں۔ ہندو یکطرفہ طور پر ان پر ظلم کر رہے ہیں۔

۱۶ جولائی ۱۹۹۳

ہمارے یہاں ایک ہریجن عورت گھر کی صفائی کرتی ہے۔ آج اس نے بتایا کہ اب اس کو سڑک کی صفائی کے لئے سرکاری ملازمت مل گئی ہے۔ "صفائی کرمچاری" کا کام ہریجنوں کے لئے ریزرو ہے۔ اس کے باوجود مذکورہ ہریجن عورت (راجن) کو زبردست کوشش کے بعد یہ کام ملا۔

راجن کئی سال سے "سرکاری کام" حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسی کے ساتھ اس کو معلوم تھا کہ نوکری ملنے کے بعد بھی اس کو دس ہزار روپیہ رشوت دینا پڑے گا۔ ورنہ دفتر والے اس کی منظوری نہیں ہونے دیں گے۔ چنانچہ وہ دفتری کوشش کے باوجود نظام الدین کالونی میں بہت سے گھروں میں صفائی کا کام لئے ہوئے تھی۔ وہ صبح سے لے کر شام تک مسلسل اس گھر سے اُس گھر دوڑتی رہتی تھی تاکہ روپیہ جمع کر سکے۔ اس طرح سخت محنت کے ذریعہ اس نے دس ہزار روپیہ فراہم کیا اور دفتر میں اس کو پہنچا کر نوکری حاصل کی۔

مسلمانوں کے نام نہاد لیڈر اکثر یہ کہتے رہتے ہیں کہ نچلے درجہ کے سرکاری کاموں میں بھی

مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ کیا مسلمان اس قابل بھی نہیں ہیں۔ یہ محض جھوٹے الفاظ ہیں۔ کیونکہ ہندستان میں اب رشوت اتنی بڑھ چکی ہے کہ کوئی بھی کام رشوت کے بغیر نہیں ملتا۔ مسلمان سرکاری ملازمتوں میں اس لئے نہیں ہیں کہ وہ "راجن" کی طرح اس کی شرط پوری کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس کا سبب یقینی طور پر تعصب نہیں بلکہ کرپشن ہے۔ اور کرپشن کا شکار اسی طرح خود ہندو بھی ہو رہے ہیں جس طرح مسلمان ہو رہے ہیں۔

۱۷ جولائی ۱۹۹۳

میں ایک کام کر رہا تھا۔ اس میں ایک شدید بھول ہوگئی۔ اس کی وجہ سے پورے کام کو ازسرنو انجام دینا پڑا۔ اس میں کئی گھنٹے مزید لگ گئے۔ میں نے سوچا کہ خدایا، انسان کو تونے کتنا زیادہ عاجز پیدا کیا ہے۔ یہ عجز اگر اس لئے ہے کہ آدمی اپنی کیوں کو بھگتے تو یہ بڑا ہی سخت معاملہ ہے۔ اور اگر یہ عجز اس لئے ہے کہ انسان تیری قدرت کا احساس کر کے تیرے آگے جھک جائے تو بلاشبہہ یہ تیرا ایک احسان ہے۔ کیوں کہ انسان اگر عاجز نہ ہوتا تو شاید وہ موت سے پہلے کبھی تیری قدرت کا اعتراف نہ کر پاتا۔

۱۸ جولائی ۱۹۹۳

ضیاء الرحمان نیر صاحب نے بتایا کہ ایک بار ان کا کلرک ان کا پیسہ لے کر بھاگ گیا۔ انھوں نے دہلی کے ایک مسلمان سے اس کا ذکر کیا۔ یہ مسلمان کوئی پڑھا لکھا مسلمان نہیں تھا۔ مگر اس نے بڑی کار آمد بات کہی۔ اس نے کہا کہ اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ چور مال لے گیا، اس کا ثواب تمہارے کھاتہ میں ٹرانسفر ہو گیا۔

۱۹ جولائی ۱۹۹۳

ایک جاپانی انجنیر ہندستان آیا۔ اس نے یہاں کی ایک فیکٹری دیکھی۔ اس کو یہ جان کر تعجب ہوا کہ فیکٹری کے ہر شعبہ میں ایک سپروائزر مقرر ہے جو ورکروں کے کام کی نگرانی کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ ہمارے یہاں بھی فیکٹری میں سپروائزر ہوتے ہیں مگر وہ ورکروں کو کام بتانے کے لئے ہوتے ہیں نہ کہ ورکروں کی نگرانی کے لئے:

Supervisor is needed for explaining the job. Supervisor is not needed for supervising the workers for their working.

۲۰ جولائی ۱۹۹۳

پروفیسر نورالحسن (۹۳ - ۱۹۲۱) آخر وقت میں مغربی بنگال کے گورنر تھے۔ اسی عہدہ پر رہتے ہوئے کلکتہ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے ایک عزیز کا مراسلہ قومی آواز (۲۰ جولائی) میں چھپا ہے۔ اس کا ایک پیراگراف یہ ہے:

"جب نورالحسن صاحب لکھنؤ یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے تو اس وقت لکھنؤ میں پروفیسر احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں، سید سجاد ظہیر اور ڈاکٹر اشرف کے نام کا سکہ چل رہا تھا جو سب کے سب کمیونسٹ تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ نورالحسن صاحب کا ذہنی رجحان کمیونزم کی طرف ہوگیا تھا۔ اس زمانہ میں لکھنؤ سے ایک اخبار جو کمیونسٹ پارٹی کا ترجمان تھا شائع ہوا کرتا تھا۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ شام کے وقت وہ اپنی سائیکل کے ہینڈل پر رکھے ہوئے اخبار کی کاپیاں فروخت کیا کرتے تھے۔ جسٹس نانا کے نواسے، رئیس الوقت دادا کے پوتے، شریف النفس ماں باپ کے فرزند نے پارٹی کی مخلصانہ خدمت میں 'ہاکر' بننا معیوب نہ سمجھا"

اربعینات میں اس طرح کے بہت سے کمیونسٹ تھے۔ مثلاً میرے وطن اعظم گڑھ میں پیرزادہ منظور احمد شبلی نیشنل کالج میں انگلش کے استاد تھے۔ اور کالج سے چھٹی پانے کے بعد ہر روز اعظم گڑھ کے چوک پر کھڑے ہو کر کمیونسٹ اخبار بیچا کرتے تھے۔

مسلمانوں کی موجودہ نسلوں کو دیکھئے تو ان میں اس طرح کی قربانی کا جذبہ دکھائی نہیں دیگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ان کی دریافت نہیں۔ وہ صرف ایک نسلی وراثت ہے۔ موجودہ زمانہ میں کوئی بھی ایسی تحریک نہیں اٹھی جو ان مسلمانوں کے تقلیدی ایمان کو ازسرِ نو ایک دریافت بنائے۔ اور جب دریافت کے درجہ کا ایمان نہ ہو تو اس سے قربانیوں کا ظہور بھی نہیں ہو سکتا۔

۲۱ جولائی ۱۹۹۳

عابد سعید ایم اے (بگراسی) لاہور گئے۔ وہاں کسی نے ان کو "فکر کی غلطی" پڑھنے کے لئے دی جو میرے خلاف ایک مفصل کتاب ہے۔ مجھ سے انھوں نے کہا کہ اس تنقیدی کتاب کو پڑھ کر مجھے لارڈ بائرن کا ایک قول یاد آگیا۔ لارڈ بائرن خود بھی ایک تنقیدی آدمی تھا مگر وہ غیر علمی اور سطحی تنقیدوں کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ اس نے ایسے ناقدین کے بارہ میں کہا:

Cheap critics are like vultures who eat the flesh of literature.

۲۲ جولائی ۱۹۹۳

سورہ آل عمران کی آیت ۱۲۰ پر غور کرتے ہوئے خیال آیا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں دشمن کی سازشیں صرف ۵۰ فیصد کی حد تک موثر ہے۔ وہ اپنی تکمیل کو صرف اس وقت پہنچتی ہے جب کہ فریق ثانی اپنی طرف سے کوئی غلطی کرکے اس کا بقیہ ۵۰ فیصد حصہ پورا کر دے۔ صبر و تقویٰ اس بات کی ضمانت ہے کہ یہ بقیہ نصف حصہ دشمن کو حاصل نہ ہو۔ جب ایسا ہوگا تو اس کی سازش بھی بے انجام ہو کر رہ جائے گی۔

۲۳ جولائی ۱۹۹۳

آج میں نے جمعہ کی نماز ایک نئی مسجد میں پڑھی۔ یہ پہاڑ گنج (دہلی) کی مسجد سنگ تراشان ہے۔ یہ مسجد خالص ہندو علاقہ میں ہے۔ وہاں کوئی ایک گھر بھی مسلمانوں کا نہیں۔ ۱۹۴۷ کے بعد یہ مسجد کوڑا خانہ بنا دی گئی تھی۔ ایک مسلمان محمود سعید بلالی نے اس کو دریافت کیا۔ ۱۹۸۲ میں انھوں نے اس کی صفائی کرائی۔ لمبی جد وجہد کے بعد وہاں ایک مدرسہ قائم ہے۔ پنج وقتہ نماز ہوتی ہے۔ وغیرہ

میرا تجربہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں زیادہ تر چھوٹے اور گم نام لوگوں نے کام کئے ہیں۔ بڑے لیڈروں نے ذاتی شہرت وعظمت تو حاصل کی مگر ملت کا کوئی خاص کام وہ نہ کر سکے۔ الا ماشاء اللہ۔

۲۴ جولائی ۱۹۹۳

آج فکی آڈیٹوریم (نئی دہلی) میں مشہور انگلش صحافی گری لال جین کی یاد میں جلسہ تھا۔ ۱۹ جولائی کو ۷۱ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ میری بھی تقریر تھی۔ ٹائمس آف انڈیا کے موجودہ ایڈیٹر دلیپ پیڈگاؤکر (Dileep Padgaonkar) نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں پیدائش کے اعتبار سے ہندو ہوں۔ زبان کے اعتبار سے مرہٹی میری زبان ہے۔ ہندو پیریڈ، مسلم پیریڈ، برٹش پیریڈ سب میری تاریخ کا جزء ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں اتنا زیادہ وسیع ہوں کہ تمام تضادات میری ہستی میں سما جائیں:

I am large enough to contain all these contradictions.

اکثر غلط فہمیاں انسان کے کمتر اندازے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

۲۵ جولائی ۱۹۹۳

پاکستان کے نواز شریف "اسلامی جمہوری اتحاد" کے لیڈر تھے۔ ۱۹۹۰ کے الکشن میں ان کی پارٹی کو پاکستان کی مرکزی اسمبلی میں دو تہائی اکثریت حاصل ہوگئی۔ وہ وزیر اعظم بن گئے۔ مگر جلد ہی ان سے اور صدر اسحاق خاں سے اختلافات شروع ہوگئے۔ صدر اسحاق خاں کے الفاظ میں، نواز شریف عہدہ میں چھوٹے تھے، مگر وہ چھوٹے بن کر نہیں رہنا چاہتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ غلام اسحاق خاں اور نواز شریف کے تعلقات کی نوعیت بھارت اور پاکستان جیسی رقیبانہ ہوگئی (نوائے وقت ۲۱ جولائی ۱۹۹۳)

آخر کار ۱۸ اپریل ۱۹۹۳ کو صدر اسحاق خاں نے بدعنوانی اور نااہلی کا الزام لگاکر نواز شریف کو برطرف کر دیا اور قومی اسمبلی کو تحلیل کر دیا۔ نواز شریف پاکستان کی سپریم کورٹ میں گئے۔ سپریم کورٹ نے ۲۶ مئی ۱۹۹۳ کو قومی اسمبلی بحال کر دی۔ نواز شریف دوبارہ وزیر اعظم بن گئے۔ مگر وزیر اعظم اور صدر میں چپقلش جاری رہی۔ یہاں تک کہ فوجی چیف جنرل عبد الوحید نے مداخلت کرکے دونوں کو استعفا پر مجبور کر دیا۔ اعلان کیا گیا کہ اکتوبر میں الکشن ہوگا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ الکشن کی جیت یا عدالت کا فیصلہ یا ایکٹ پاس کرنا، اس قسم کی چیزوں سے اسلامی نظام قائم نہیں ہوتا۔ اسلامی نظام کے لئے ملکی اور سماجی اور بین اقوامی حالات کی موافقت درکار ہے۔ اگر یہ موقف حاصل نہ ہو تو دوسری کوئی بھی تدبیر کسی ملک میں اسلامی نظام کے قیام کے لئے کارگر نہیں ہو سکتی۔

۲۶ جولائی ۱۹۹۳

ایک تعلیم یافتہ مسلمان ملاقات کے لئے آئے۔ وہ میرے پیروں کے پاس بیٹھ گئے۔ انھوں نے کہا کہ میں خودکشی کرنے والا تھا۔ اسی زمانہ میں اتفاق سے مجھے الرسالہ ملا۔ الرسالہ پڑھ کر میں نے نئی زندگی حاصل کی۔ میں آپ کو اپنا محسن سمجھتا ہوں اور آپ کی قدم بوسی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ اسلام میں قدم بوسی نہیں ہے بلکہ دعا ہے۔ آپ میرے لئے دعا فرمائیں۔

انھوں نے کہا کہ بہت سے مسلمان آپ کو ہندوؤں کا ایجنٹ کہتے ہیں۔ میں ان کو جواب دیتا ہوں کہ میں کیسے مانوں کہ وہ ہندوؤں کے ایجنٹ ہیں۔ ان کے الرسالہ نے تو مجھ کو اسلام کا

ایجنٹ بنا دیا۔ آج میں اسلام کو مسلمانوں اور ہندوؤں میں پھیلا رہا ہوں۔ پھر میں کیسے مانوں کہ وہ ہندوؤں کے ایجنٹ ہیں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ہندوؤں کا ایجنٹ ہو اور لوگوں کو اسلام کا علمبردار بنائے۔

۲۷ جولائی ۱۹۹۳

اکبر صاحب انگلستان کی کیمبرج یونیورسٹی میں استاذ ہیں۔ وہ بوسنیا گئے تاکہ وہاں کے حالات کا خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں۔ واپسی کے بعد انھوں نے ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ بوسنیا کے مسلمانوں کے ساتھ کس طرح آگ اور خون کا طوفان برپا کیا گیا ہے۔ مظالم کی تفصیلات بتاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ ایک نئی صلیبی جنگ ہے، آخری صلیبی جنگ:

And I ask is this another Crusade. The last Crusade.

اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ کروسیڈ ہے تو سوال یہ ہے کہ پہلی کروسیڈ میں تو مسلمان پوری طرح کامیاب ہوئے تھے، پھر دوسری کروسیڈ میں وہ کیوں مکمل طور پر ناکام ہو گئے۔ اس کا جواب یہ نہیں دیا جا سکتا کہ موجودہ ناکامی کا سبب تو پہلی کروسیڈ کے وقت بھی اہل مغرب کی سازش ہے، کیوں کہ اہل مغرب نے تو پہلی کروسیڈ کے وقت بھی ہر قسم کی سازشیں کی تھیں جس طرح آج وہ کر رہے ہیں۔

۲۸ جولائی ۱۹۹۳

مولانا خورشید احمد قاسمی میرٹھ کے مدرسہ امداد الاسلام میں استاد تھے۔ دو سال پہلے وہاں کے منتظمین سے ان کا اختلاف ہو گیا۔ ان کا کہنا ہے کہ الرسالہ نے اس نازک موقع پر میری مدد کی۔ اگر میں الرسالہ کا قاری نہ ہوتا تو میں مدرسہ والوں سے ٹکرا جاتا۔ مگر الرسالے میں نے جانا تھا کہ آدمی کے لئے ایک راستہ بند ہو تو اس کو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ کیوں کہ عین اسی وقت دوسرا راستہ اس کے لئے کھلا ہوا ہوگا۔

انھوں نے مدرسہ کی ملازمت چھوڑ دی۔ اور طے کیا کہ اب کسی بھی مدرسہ کی ملازمت نہیں کریں گے۔ چنانچہ انھوں نے کتابت سیکھنا شروع کر دیا۔ اب وہ میرٹھ کی ایک مسجد میں رہتے ہیں۔ انھیں

کتابت کا کام برابر ملتا رہتا ہے۔ مدرسہ میں ان کو سات سو روپیہ مہینہ مل رہا تھا۔ اب کتابت سے وہ دو ہزار روپیہ مہینہ حاصل کر لیتے ہیں جب ابھی وہ آغاز کے مرحلہ میں ہیں، کچھ عرصہ بعد ان کی آمدنی انشاء اللہ اس کا دگنا ہو جائے گی۔

میں نے کہا کہ الرسالہ کا مقصد صحیح سوچ پیدا کرنا ہے۔ اس وقت ہمارے ادارے اور معاشرہ کا یہ حال ہے کہ کہیں بھی آدمی کو صحیح سوچ کی تربیت نہیں ملتی۔ ہر آدمی خود رو پودے کی طرح اپنی زندگی کا سفر طے کرتا ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ ہزاروں لوگوں کو الرسالہ کے ذریعہ روشنی ملی ہے۔

۲۹ جولائی ۱۹۹۲

حدیث میں یہ پیشین گوئی ہے کہ دور آخر میں ایک دجالی فتنہ ظاہر ہوگا جو تمام فتنوں سے زیادہ بڑا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ دجالی فتنہ سے مراد شاید اسلام کی سیاسی تعبیر کا فتنہ ہے۔ جس کو اس کے علمبردار اسلام کی انقلابی تعبیر کا خوش نما نام دیتے ہیں۔

پیتل کے برتن پر سونے کی پالش کر دی جائے تو اس پرفریب عمل کو دجال کہا جاتا ہے۔ اسلام کی انقلابی یا سیاسی تعبیر بھی اسی قسم کی ایک پرفریب تعبیر ہے جو بظاہر اسلام ہے مگر بباطن اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی دجالی تعبیر کا یہ نتیجہ ہے کہ آج اسلام کی دھوم ہے مگر اسلامی سیرت کا کہیں وجود نہیں۔ لوگ مکمل اسلام قائم کرنے کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں مگر وہ جزء اسلام کو قائم کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ اسلام کے نام پر جان ومال کی بے حساب قربانیاں دی جا رہی ہیں مگر نتیجہ کے اعتبار سے سارا معاملہ بالکل صفر ہے

اس سیاسی اسلام کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس نے مسلم اور غیر مسلم کے درمیان داعی۔ مدعو کے رشتہ کو ختم کر دیا ہے۔ اس نے ساری دنیا میں دعوتی ماحول کو برباد کر کے ہر طرف عداوتی ماحول پیدا کر دیا ہے۔

۳۰ جولائی ۱۹۹۲

مسٹر بنواری لال چورو (راجستھان) کے رہنے والے ہیں۔ اور بنک میں ملازم ہیں۔ وہ آر ایس ایس کے ممبر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہمارے بچپن میں جب ہمارے یہاں تعزیہ کا جلوس نکلتا تو میری

نانی مجھ کو اس کے جلوس میں بھیجتی تھیں اور کہتی تھیں کہ چلتے ہوئے تعزیہ سے پاس ہو جانا۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے برکت ہوتی ہے۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے ملک میں کیسا ماحول تھا۔ تقسیم کے واقعہ نے ان ساری روایات کو برباد کر دیا۔

۲۱ جولائی ۱۹۹۳

ڈاکٹر مہیش شرما نے بتایا کہ ۱۹۲۵ میں ناگپور میں ہندوؤں کا جلوس نکلنے والا تھا۔ اس جلوس کے بارہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ معاہدہ ہوا کہ جلوس مسجد کے سامنے سے جب گزرے گا تو وہ اپنا باجا بند کر دے گا۔ اور خاموشی کے ساتھ گزر جائے گا۔ ڈاکٹر ہیڈگوار کو معلوم ہوا تو انھوں نے کہا کہ یہ بالکل غلط معاہدہ ہے۔ چنانچہ انھوں نے خود اپنے گلے میں ایک ڈھول لٹکائی اور جلوس کے آگے اس کو بجاتے ہوئے چلے۔ مسجد کے پاس مسلمانوں نے روک ٹوک کیا۔ یہاں تک کہ ہندو مسلم فساد ہو گیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر ہیڈگوار نے آر ایس ایس کی تنظیم قائم کی۔ ان کا خیال تھا کہ ہندو اکثریت میں ہونے کے باوجود مسلمانوں سے ڈرتے ہیں۔ اس ڈر کو ہندوؤں کے دل سے نکالنا ہے۔ اور ہندوؤں کو دلیر بنانا ہے۔ یہ مقصد تھا آر ایس ایس کو قائم کرنے کا۔

یکم اگست ۱۹۹۳

بمبئی سے ایک اخبار مڈ ڈے (Mid-Day) نکلتا ہے۔ اس میں ایک مسلم خاتون کا خط چھپا ہے۔ اس کو سنڈے آبزرور (یکم اگست ۱۹۹۳) نے نقل کیا ہے۔ خاتون کا نام ثریا بالو ہے۔ وہ ایک تنظیم کی کنوینر ہیں۔ اس تنظیم کا نام ہے:

Muslim Women's Equality Forum

اس خط میں کہا گیا ہے کہ حکومت فوراً تین طلاق اور تعدد ازدواج کو خلاف قانون قرار دے ورنہ بہت بڑی تعداد میں مسلم عورتیں پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں کے سامنے خودسوزی کا مظاہرہ کریں گی۔ خط کا خاتمہ اس موٹو پر ہوا ہے:

If you do not permit us to live with honour, you cannot stop us from dying with dignity.

یعنی اگر آپ ہم کو عزت کے ساتھ جینے کی اجازت نہیں دیتے تو آپ ہم کو عزت کے ساتھ مرنے سے نہیں روک سکتے۔

۲ اگست ۱۹۹۳

محمود سعید بلالی دہلی میں جامع مسجد کے علاقہ میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی والدہ اپنے بچوں کو ہمیشہ صبر و برداشت کی تلقین کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں: غصہ کھائے اپنے کو، نرمی کھائے دوسرے کو۔

یہ نہایت درست بات ہے۔ غصہ بظاہر آدمی دوسرے کے اوپر دکھاتا ہے مگر اس سے وہ خود اپنا نقصان کرتا ہے۔ غصہ کے وقت نرم پڑنا بظاہر اپنے خلاف ہے۔ مگر اس کا نتیجہ دوسرے کو بھگتنا پڑتا ہے۔

۳ اگست ۱۹۹۳

القرطبی کی تفسیر الجامع لاحکام القرآن پڑھتے ہوئے یہ واقعہ نظر سے گزرا کہ ایک آدمی کو دوسرے آدمی نے سب وشتم کیا۔ اس کو سن کر پہلے آدمی نے کہا: ان کنت صادقاً فغفر اللہ لی وان کنت کاذباً فغفر اللہ لک (اگر تم سچے ہو تو خدا مجھے معاف کرے اور اگر تم جھوٹے ہو تو خدا تم کو معاف کرے) ۳۶۱/۱۵

یہ اللہ سے ڈرنے والے انسان کا معاملہ ہے۔ جو آدمی اللہ سے ڈرے، اس کے ساتھ جب کوئی ناخوش گوار بات پیش آتی ہے تو وہ حد سے باہر نہیں ہو جاتا۔ اس وقت بھی اس کی زبان سے احتیاط والا کلام نکلتا ہے جس کی ایک مثال مذکورہ واقعہ ہے۔

۴ اگست ۱۹۹۳

ایک صاحب بعض حالات کی شکایت کر رہے تھے۔ ان کو میں نے ایک صحابی کا یہ قول سنایا: من لم یرضَ بالقلیل مما یأتی بہ السفیہ یرضیٰ بالکثیر (جو آدمی نادان کے تھوڑے کو برداشت نہیں کرے گا، اس کو نادان کے زیادہ کو برداشت کرنا پڑے گا۔)

میں نے کہا کہ اس حدیث میں ایک اہم حقیقت بتائی گئی ہے۔ وہ یہ کہ اس دنیا میں آدمی کے لئے چوائس شر اور بے شر کے درمیان نہیں ہے۔ بلکہ شر قلیل اور شر کثیر کے درمیان ہے۔

اگر آپ شر قلیل کو برداشت نہ کریں تو اس کے بعد جو چیز آپ کے حصہ میں آئے گی وہ بے شر کی حالت نہیں ہے بلکہ شر کثیر کی حالت ہے۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ وہ شر قلیل کو گوارا کرلے تاکہ شر کثیر سے وہ اپنے آپ کو بچا سکے۔

۵ اگست ۱۹۹۳

محمد فخر الاسلام ندوی نے ندوہ (لکھنؤ) سے فراغت کی ہے۔ اور اب وہ جامعہ ملیہ میں داخلہ کے لئے دہلی آئے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ دسمبر ۱۹۹۲ میں وہ ندوہ میں تھے۔ ۶ دسمبر کو اجودھیا میں بابری مسجد توڑی گئی۔ اس کے بعد، دسمبر کی رات کو لکھنؤ یونیورسٹی کے طلبہ اپنے ہوسٹل کی چھت پر چڑھ گئے اور ندوہ کی طرف پتھر پھینکنے لگے۔ یہ پتھر زیادہ تر ندوہ کے شبلی ہاسٹل پر آرہے تھے۔ اسی کے ساتھ وہ اشتعال انگیز نعرے لگا رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ پھر ندوہ کے طلبہ نے کیا کیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ اپنے کمروں میں خاموش بیٹھے رہے۔ کیوں کہ ندوہ کے "بڑوں" نے ہم کو کسی بھی قسم کے جوابی عمل سے منع کردیا تھا۔

۶ اگست ۱۹۹۳

نجم الحسن صاحب ایک انگلش جرنلسٹ ہیں۔ وہ شیعہ خاندان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے بتایا کہ میرے والد مجتہد تھے۔ وہ مجھ کو ہمیشہ کنفرنٹیشن سے منع کیا کرتے تھے۔ ایک روز ایک شیعہ بزرگ ہمارے گھر آئے۔ وہ دیر تک علی کی مظلومیت بیان کرتے رہے کہ خلافت علی کا حق تھا۔ مگر سازش کرکے ان کی خلافت چھین لی گئی۔ لمبی تقریر کرکے جب وہ چپ ہوئے تو میرے والد نے کہا کہ اب میں صرف ایک سوال کرتا ہوں۔ علی کے ساتھ جب اتنی بڑی حق تلفی ہوئی تو وہ گھر میں کیوں بیٹھے رہے۔ وہ تو بہت بہادر آدمی تھے۔ انھیں اپنے حق کے لئے لڑنا چاہئے تھا۔

پھر والد صاحب نے خود ہی جواب دیا کہ وہ اس لئے گھر میں بیٹھ رہے کہ فتنہ کا اندیشہ تھا۔ گویا کہ علی کی اصل سنت یہ ہے کہ خواہ تم مظلوم ہو اور خواہ تمہاری حق تلفی کی گئی ہو، لیکن اگر اقدام سے فتنہ کا اندیشہ ہو تو تم کو اپنی زبان بند کرکے بیٹھ رہنا چاہئے اور کوئی بھی جوابی کارروائی نہیں کرنا چاہئے۔

۷ اگست ۱۹۹۳

غلام اسحاق خاں پاکستان کے آہنی صدر سمجھے جاتے تھے۔ آٹھویں ترمیم کے تحت اپنے دستوری حق کو استعمال کرتے ہوئے انھوں نے ۱۹۹۰ میں بے نظیر بھٹو کی منتخب حکومت کو بیک جنبش قلم توڑ دیا۔ دوبارہ نواز شریف کی منتخب حکومت کو اپنے صدارتی فرمان سے ۱۹۹۳ میں برخاست کر دیا وغیرہ۔

پاکستان کے سیاسی حالات بے حد خراب ہو گئے۔ نواز شریف اور بے نظیر بھٹو دونوں کی طرف سے بھیڑ کی سیاست (mob-politics) نے ہر طرف افراتفری پھیلا دی۔ آخر کار ۱۸ جولائی ۱۹۹۳ کو فوجی افسران صدارتی محل میں داخل ہو گئے۔ مسلح فوج نے اسلام آباد میں مارچ کرنا شروع کر دیا۔ پاکستان کے آرمی چیف جنرل عبدالوحید نے غلام اسحاق خاں کو ہدایت دی کہ وہ استعفا دے کر حکومت سے الگ ہو جائیں۔ لاہور کے روزنامہ نوائے وقت (۳۰ جولائی ۱۹۹۳) میں سابق وزیر دفاع سید غوث علی شاہ کا بیان چھپا ہے۔ انھوں نے کہا کہ :

" غلام اسحاق خاں نے صدارت کے عہدہ سے استعفا دینے میں لیت ولعل سے کام لیا لیکن فوج کے دباؤ کے تحت انھیں مستعفی ہونا پڑا۔ غوث علی شاہ نے کہا کہ جب غلام اسحاق خاں استعفا کے کاغذ پر دستخط کر رہے تھے تو اس وقت میں وہاں موجود تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس وقت ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور وہ سخت پریشان تھے۔

۸ اگست ۱۹۹۳

مولانا عنایت اللہ سبحانی بلیریا گنج میں رہتے ہیں اور وہاں جامعۃ الفلاح میں استاد ہیں۔ آج وہ ملاقات کے لئے آئے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کی شام کو جب یہ خبر ملی کہ اجودھیا کی بابری مسجد کو ہندوؤں نے ڈھا دیا تو بلیریا گنج میں کچھ نوجوانوں کو جوش آیا۔ رات کو وہ ایک مقامی مندر میں گھس گئے۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ مندر کے اندر پوجا کے لئے سفید پتھر کی ایک گائے رکھی ہوئی تھی۔ رات کے اندھیرے میں وہ اس گائے کو اٹھا لائے۔

بعد کو پجاری کو معلوم ہوا تو وہ بلیریا گنج کے حکیم ایوب صاحب کے پاس آیا۔ اس

نے کہا کہ مسلمان ہمارے مندر کی گائے اٹھالائے ہیں۔ میرے گھر کے بچے اور عورتیں سب رو رہے ہیں۔ حکیم صاحب نے پتہ کرایا تو خبر صحیح تھی۔ انھوں نے مسلمانوں کو سمجھایا اور گائے کو اپنے گھر منگوالیا۔ پھر کچھ مسلمانوں کے ساتھ اس کو لے جاکر مندر میں پہنچا دیا۔ مندر کا پجاری اس کے بعد حکیم صاحب کے پاؤں پر گر پڑا۔

اگر یہ پجاری ہندوؤں کے پاس جاکر شور مچاتا تو یقیناً بلریا گنج میں ہندو مسلم جھگڑا ہو جاتا۔ وہ لوگ ساری بستی میں آگ لگا دیتے۔ مگر پجاری کی شرافت اور حکیم صاحب کی سمجھ داری نے بستی کو فساد سے بچالیا۔

مولانا عنایت اللہ سبحانی نے بتایا کہ اسی طرح اعظم گڑھ شہر میں بھی ہوا۔ ۶ دسمبر کی شام کو خبر ملنے کے بعد مولانا مجیب اللہ ندوی نے کچھ نوجوانوں کو اکٹھا کیا۔ ان کے سامنے جوشیلی تقریر کی۔ اس کے بعد لڑکوں کو لے کر دلال گھاٹ پہنچے۔ وہاں ان مسلمانوں نے ایک مندر کے کچھ حصہ کو توڑ دیا۔ اس پر مقامی ہندو بھڑک اٹھے۔ انھوں نے دلال گھاٹ کی مسجد میں توڑ پھوڑ کی۔ مگر اعظم گڑھ کا کلکٹر فوراً وہاں آگیا۔ اس نے آنسو گیس کے ذریعہ مجمع کو قابو میں کیا۔ اس کے بعد اس کے حکم کے تحت رات ہی کو مندر اور مسجد دونوں دوبارہ بنا دئے گئے۔ اس طرح شہر میں فساد ہونے سے رہ گیا۔

۹ اگست ۱۹۹۳

حدیث میں ہے کہ عمر فاروقؓ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرہ میں آئے۔ آپ کھجور کی معمولی چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے جس سے آپ کے جسم پر نشانات پڑ گئے تھے۔ یہ دیکھ کر حضرت عمر رو پڑے۔ انھوں نے کہا کہ کسریٰ اور قیصر کے لئے ریشم و کمخواب ہیں اور خدا کے پیغمبر کے لئے یہ چٹائی۔ آپ نے فرمایا : افی شك انت یاعمر، الا ترضی ان تكون لنا الآخرة ولهم الدنیا (رواہ البخاری ومسلم وابو داؤد والترمذی وابن ماجہ والدارمی واحمد)

اس کا مطلب یہ نہیں کہ خود راحت یا خود مشقت میں ذاتی طور پر یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ راحت سے دنیا والی نفسیات پیدا ہوتی ہے اور مشقت سے آخرت والی نفسیات۔ راحت آدمی کو بے حس کر کے اعلیٰ حقیقتوں کی طرف سے غافل بنا دیتی ہے۔ حتی کہ بعض

اوقات وہ سرکشی تک پہنچ جاتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں مشقت سے اعلیٰ حقیقتوں کا احساس پرورش پاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص آخرت کی فکر کی بنا پر اپنے دنیا کے معاملات کو درست نہ کر سکا۔ اس کے بیوی بچے پریشانیوں میں پڑے رہے۔ اس کو سوچ کر ان کی زبان سے نکلا: خدایا، جو کچھ میں اپنے بیوی بچوں کو دنیا میں نہ دے سکا، تو اس کو مزید اضافہ کے ساتھ آخرت میں دے دے۔

یہ دعا اگر قبول ہو جائے تو وہ تمام قیمتی چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ مگر ایسی دعا مشقتوں ہی میں نکلتی ہے، وہ راحتوں میں کبھی نہیں نکلتی۔

۱۰ اگست ۱۹۹۳

ایک تعلیم یافتہ ہندو مسز لِشتھا جین 'اسلام میں عورت کا مقام' پر ریسرچ کر رہی ہیں۔ وہ انٹرویو کے لئے آئیں۔ میں نے کہا کہ اسلام میں عورت اور مرد کا ورک پلیس (work place) بنیادی طور پر الگ الگ رکھا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو برابری کے اصول کے مطابق نہیں۔ میں نے کہا کہ وہ فطرت کے اصول کے مطابق ہے۔ کیوں کہ بیالوجی کی تحقیقات بتاتی ہیں کہ عورت اور مرد میں پیدائشی فرق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکمل آزادی کے باوجود بہت سے شعبے عورتوں سے بالکل خالی ہیں۔

انھوں نے کہا کہ یہ تو کنڈیشننگ کی وجہ سے ہے، میں نے کہا کہ کنڈیشننگ کا نظریہ تحقیق سے ثابت نہیں ہوتا۔ تحقیقات بتاتی ہیں کہ کنڈیشننگ وراثتی طور پر منتقل نہیں ہوتی۔ اگر فی الواقع کوئی مرد یا عورت کنڈیشنڈ ہو جائیں تب بھی اس کا اثر انھیں کی ذات پر ختم ہو جائے گا۔ وہ وراثت کے ذریعہ ان کے بچوں کو منتقل نہیں ہو سکتا۔

۱۱ اگست ۱۹۹۳

علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر کسی کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: اعرف الرجال بالحق ولا تعرف الحق بالرجال (آدمیوں کو حق کے ذریعہ پہچانو، حق کو آدمیوں کے ذریعہ نہ پہچانو۔)

حضرت علی کے زمانہ میں تو صرف بعض افراد اس ذہن کے ہوں گے۔ مگر موجودہ زمانہ میں

پوری کی پوری امت اسی مزاج کی ہوگئی ہے۔ آج عوام اور خواص دونوں کا یہ حال ہے کہ وہ قرآن وسنت کے ذریعہ حق کو جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ صرف اس حق سے واقف ہیں جو ان کے "بڑوں" کے ذریعہ ان کو ملا ہو۔ حتی کہ اگر وہ کبھی قرآن وسنت کا نام لیتے ہیں تو اس لئے کہ اس سے اپنے بڑوں کی رائے کو درست ثابت کرسکیں۔

۱۲ اگست ۱۹۹۲

۱۹۵۲ میں مصر میں فوجی بغاوت ہوئی۔ شاہ فاروق کو تخت سے معزول کرکے ملک سے نکال دیا گیا۔ فوجی افسران حکومت پر قابض ہو گئے۔ اس وقت میں اعظم گڑھ میں تھا۔ عبدالرشید اعظمی ندوی سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے رازدارانہ انداز میں بتایا کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی قاہرہ جارہے ہیں۔ یہ جو مصر میں "انقلاب" آیا ہے اس کو لانے والے الاخوان المسلمون کے لوگ ہیں۔ اب مصر میں اسلامی شریعت کی حکومت ہوگی۔ مولانا موصوف قاہرہ اس لئے جارہے ہیں کہ اس تاریخی موقع پر اخوانی قائدین کو مشورہ دے سکیں۔

مولانا عنایت اللہ سبحانی کا بیان ہے کہ ان کے استاد ڈاکٹر احمد حسن فرحات شامی جو مصری عالم شیخ ابوزہرہ کے استاد ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۶۹ میں جب لیبیا میں فوجی انقلاب ہوا۔ شاہ ادریس کی جگہ کرنل معمر قذافی ملک کے حکمراں بن گئے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ: القرآن شریعۃ المجتمع۔ تو اس موقع پر شیخ ابوزہرہ (۱۹۷۴ - ۱۸۹۸) نے قذافی کے پاس باقاعدہ وفد بھیجا تھا۔ اس وفد کے ذریعہ انھوں نے صدر قذافی کو یہ پیغام دیا تھا کہ تم لیبیا میں اسلامی شریعت نافذ کرنا چاہتے ہو تو فلاں فلاں باتوں کا خیال رکھنا۔ مثلاً یہ کہ اسلامی شریعت میں حدِ زنا رجم نہیں ہے۔ بلکہ سو کوڑے مارنا ہے۔ تم نفاذ اسلام کے جوش میں کوئی ایسی کارروائی مت کرنا کہ دنیا کو اسلام پر ہنسنے کا موقع ملے۔

۱۳ اگست ۱۹۹۲

ایک صاحب نے مسجد میں تقریر کی۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ چیزوں سے نہیں، ہوتا خدا سے ہوتا ہے۔ انھوں نے اس سلسلہ میں موسیٰ اور فرعون کی مثال دی۔ انھوں نے کہا کہ فرعون کے پاس سب چیزیں تھیں۔ اس کے مقابلہ میں موسیٰ بے چیز تھے۔ مگر خدا نے فرعون کو

چیزوں میں ہلاک کیا اور موسیٰ کو بے چیز میں کامیابی دیدی۔

یہ دلیل نہیں ہے بلکہ مضمون بندی ہے۔ کیوں کہ موسیٰ کے پاس فرعون کی ہر چیز سے زیادہ طاقت ور چیز تھی، اور وہ نبوت تھی۔ نبی ہونے کی بنا پر ان کو ایسا عصا حاصل تھا جو سمندر کو پھاڑ سے اور پہاڑ کو توڑ ڈالے۔ یہی وجہ ہے کہ نبوت سے پہلے موسیٰ کو فرعون کے خوف سے مصر چھوڑ کر مدین جانا پڑا۔ مگر نبوت اور عصا ملنے کے بعد وہ فرعون کے اوپر غالب آگئے۔

ایسی ہی مضمون بندی ایک اور گروہ کرتا ہے جس کا کہنا ہے کہ سب کچھ سیاسی نظام سے ہوتا ہے۔ اگر سیاسی نظام پر قبضہ ہو جائے تو گویا ہر چیز پر قبضہ ہو گیا۔ مگر یہ ایک بے معنی بات ہے۔ ضیاء الحق کی صدارت اور نواز شریف کی وزارت کے ذریعہ پاکستان میں پندرہ سال تک 'اسلام پسندوں' کا سیاست پر قبضہ رہا۔ مگر وہ ایک فیصد بھی اسلام کے لئے مفید نہ بن سکا۔

۱۴ اگست ۱۹۹۳

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۱۲ صفر ۱۴۱۲ھ، ۲۲ اگست ۱۹۹۱) میں ایک رپورٹ چھپی تھی۔ اس کا عنوان تھا: كل الامم تخطط لمستقبلها ماعدا المسلمين (تمام قومیں اپنے مستقبل کا منصوبہ بنا رہی ہیں سوا مسلمانوں کے)

اس کو پڑھ کر میں نے کہا کہ یہ سرخی درست نہیں۔ اس لئے کہ دوسری قوموں کی طرح مسلمان بھی پچھلے کم از کم ڈیڑھ سو سال سے اپنے قومی عمل کے نقشے بنا رہے ہیں، اپنے نقشے کے مطابق عمل کر رہے ہیں اور قربانیاں دے رہے ہیں۔ پھر ایسا کہنا کیوں کر درست ہو سکتا ہے کہ مسلمان اپنے مستقبل کے لئے منصوبہ نہیں بنا رہے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ مسلمانوں کے منصوبہ اور ان کی قربانیوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اس لئے مضمون نگار یہ سمجھ رہے ہیں کہ منصوبہ بھی نہیں بنا۔ حالاں کہ مسلمانوں کے لئے اصل مسئلہ فقدان تخطیط کا نہیں بلکہ فقدان نتیجۂ تخطیط کا ہے۔ مضمون نگار کو كل الامم تخطط لمستقبلها ماعدا المسلمين کے بجائے یہ کہنا چاہئے: كل الامم تستمتع بنتائج تخطيطها ماعدا المسلمين (تمام قومیں اپنے منصوبہ کے نتائج سے فائدہ اٹھا رہی ہیں سوائے مسلمانوں کے)

۱۵ اگست ۱۹۹۳

مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی (استاد جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ) نے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کا نام "حقیقت رجم" ہے۔ یہ مجموعی طور پر ۳۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے اس کا مسودہ مجھے پڑھنے کے لئے دیا۔ عام کتابوں کی طرح یہ کتاب ادبی اسلوب میں نہیں ہے بلکہ از اول تا آخر تحقیقی انداز میں لکھی گئی ہے۔

اس کتاب کو میں نے دیکھا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حد زنا اسلام میں رجم نہیں ہے بلکہ سو کوڑے مارنا ہے، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے۔ رجم دراصل اس زانی کے لئے ہے جو عادی مجرم ہو، جو اپنی مفسدانہ کارروائیوں سے پورے سماج کے لئے خطرہ بن جائے۔ حتی کہ کوڑا مارنے کی مقرر سزا اس کی اصلاح کے لئے کافی نہ ہو اور حاکم ضرورت شدیدہ کی بنا پر اس کے لئے سخت تر سزا کا فیصلہ کرے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک اہم اور تاریخی کتاب ہے۔ اگر ایک بار یہ ثابت ہو جائے کہ رجم حد زنا نہیں ہے بلکہ مخصوص حالات میں ایک تعزیری حکم ہے تو اس کے بعد بہت سے مسائل کے حل کا راستہ کھل جائے گا۔ کیوں کہ یہی غلطی بعد کے زمانہ میں متعدد امور میں کی گئی ہے۔ مثلاً مرتد کی سزا قتل، شاتم کی سزا قتل، یا ایک مجلس کی تین طلاق کو واقع کر کے تفریق کرا دینا، یہ سب حاکم وقت کی طرف سے بطور وقتی تعزیر تھے۔ مگر ان کو مستقل شرعی مسئلہ سمجھ لیا گیا۔

یہ کوئی سادہ غلطی نہیں ہے۔ اس غلطی نے موجودہ زمانہ میں اسلامی تحریک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلم داعیوں میں عام طور پر تشدد کا مزاج پیدا ہو گیا ہے جس کا نمونہ ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔

اس غلطی نے اسلام کی ایک متشددانہ تصویر بنا دی ہے۔ اسی کی بنا پر ایسا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم حکمراں غیر ضروری طور پر نفاذ شریعت کی کوششوں کے مخالف بن گئے ہیں۔ کیوں کہ وہ اس کو دور وحشت کی طرف لوٹنے کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ اس غلط تصویر نے اسلام کو ایک انتہا پسند مذہب کا روپ دے کر لوگوں کو خلاف واقعہ طور پر اسلام کی طرف سے متوحش کر دیا ہے۔ اسلام کے قانون کی یہ غلط تشریح

موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کا راستہ روکنے کا سبب بن گئی ہے۔

۱۶ اگست ۱۹۹۳

مئو کے جناب حافظ عبدالجبار صاحب ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ مئو میں دریا کے ٹونس کے کنارے ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ اس کے ساتھ بڑی سی زمین تھی۔ ایک ہندو عورت نے دعویٰ کیا کہ یہ مسجد میری زمین پر بنائی گئی ہے۔ مسلمان مسجد کو اس کے حوالے کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ عورت اس پر راضی تھی کہ مسجد اور اس کے ساتھ بقدر ضرورت زمین مسلمان لے لیں اور بقیہ زمین اس کے لئے چھوڑ دیں۔ مگر مئو کے مسلمانوں نے اس کو نہیں مانا۔ یہاں تک کہ مقدمہ شروع ہو گیا۔

مقامی عدالت میں مسلمان اپنا مقدمہ ہار گئے۔ اس کے بعد وہ الٰہ آباد ہائی کورٹ میں گئے وہاں بھی ان کے خلاف فیصلہ ہوا۔ اب عدالتی حکم کے تحت وہاں پولیس فورس چاروں طرف لگا دی گئی۔ تمام راستے بند کر دئے گئے تاکہ مسلمان وہاں نہ پہنچ سکیں۔ اس طرح مسجد ڈھاکر زمین کے برابر کر دی گئی۔ اب وہ زمین پوری کی پوری اس عورت کے خاندان کے قبضہ میں ہے۔ یہ واقعہ ۲۵ سال پہلے کا ہے۔

عبدالجبار صاحب نے اسی طرح مئو کے مسلمانوں کے کئی اور واقعات بتائے۔ جب کہ ایک خاندان آپس میں لڑ گیا۔ صلح کی ساری کوشش ناکام ہو گئی اور جھگڑا صرف اس وقت ختم ہوا جب کہ عدالت نے کسی ایک کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ یہ سب قصے سننے کے بعد میں نے کہا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ الصلح خیر۔ مگر آجکل کے مسلمانوں نے اس کو چھوڑ کر اپنا اصول یہ بنا لیا ہے کہ الحرب خیر۔

۱۷ اگست ۱۹۹۳

کشمیری لیڈر پروفیسر سیف الدین سوز ایک اور کشمیری کے ساتھ ملاقات کے لئے آئے۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ کشمیر کا مسئلہ تو مزید حل ہو رہا تھا۔ مگر لیاقت علی خاں (سابق وزیر اعظم پاکستان) کی نادانی سے وہ کھو یا گیا۔ پھر میں نے اس کی تفصیل بتائی جو پاکستان کے مسلم لیگی لیڈر چودھری محمد علی نے اپنی کتاب (Emergence of Pakistan) میں درج کی ہے۔

اس معاملہ کا مکمل حوالہ میں نے الرسالہ اگست ۱۹۸۸، صفحہ ۲۷ میں نقل کیا ہے۔

پروفیسر سوز نے کہا کہ اس معاملہ کی مزید تفصیل سردار محمد ابراہیم خاں نے لکھی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ لیاقت علی خاں تو اس پر تیار تھے کہ حیدر آباد کو انڈیا کے حوالے کر کے کشمیر کو حاصل کر لیں۔ مگر غلام محمد اس پر راضی نہیں ہوئے جو لیاقت علی خاں کی کیبنٹ میں وزیر خزانہ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کشمیر تو ہمارا ہے ہی۔ جونا گڑھ اور حیدر آباد کو ہم انڈیا کے لئے کینسر بنا کر رکھیں گے تاکہ اس کا دماغ درست رہے۔

یہ موجودہ مسلمانوں کا خاص مزاج ہے۔ اس طرح کے معاملات میں وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی اسکیپ گوٹ (scapegoat) حاصل کر لیتے ہیں جس کے ذریعہ وہ اپنے بڑوں کی غلطیوں کا الزام کسی اور کے سر ڈال سکیں۔

۱۸ اگست ۱۹۹۳

راجندر سنگھ عرف رجو بھیا، آر ایس ایس کے منظر سمجھے جاتے ہیں۔ ۱۵ اگست کو دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ان کی ایک تقریر سنی۔ انھوں نے بتایا کہ ۹۲-۱۹۹۱ میں جب یو پی میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت تھی، انھوں نے یوپی کے مسلم مدرسوں میں پڑھائی جانے والی کتابوں کا اردو سے ہندی میں ترجمہ کرایا۔ ان کا جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوا کہ ابتدائی مدرسہ میں پانچ سال کے دوران ایک مسلمان بچہ جو تعلیم حاصل کرتا ہے اس میں وہ ۱۰۵ شخصیتوں کے حالات پڑھتا ہے۔ یہ سب شخصیتیں مسلمان اور زیادہ تر باہر کی ہوتی ہیں۔ جیسے کہ ابوبکرؓ و عمرؓ وغیرہ۔ ۱۰۵ شخصیتوں میں چند ملکی شخصیتیں ہوتی ہیں ان میں دو تو گاندھی اور جواہر لال ہیں اور بقیہ ابوالکلام آزاد اور ذاکر حسین وغیرہ ہیں۔

انھوں نے کہا کہ گاندھی اور جواہر لال تو ایسے لوگ ہیں جو بہر حال رہیں گے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ان کے علاوہ کوئی نہیں۔ مثلاً سوامی ویویکانند، ارو بندو گھوش، شیواجی، رابندر ناتھ ٹیگور اور اسی طرح دوسرے بہت سے لوگ ہیں جن کے بارہ میں مسلم بچہ کچھ نہیں جانتا۔ ایسی حالت میں دیش میں یک جہتی کیسے آسکتی ہے۔

یک جہتی کا تعلق مزاج سے ہے نہ کسی تعلیمی کورس سے۔

۱۹ اگست ۱۹۹۳

انسان کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ کسی نے کہا کہ انسان ایک ناطق حیوان ہے۔ کسی نے کہا کہ انسان ایک معاشی حیوان ہے۔ کسی نے کہا کہ انسان ایک اوزار ساز حیوان ہے کسی نے کہا کہ انسان ایک توجیہہ پسند حیوان ہے۔ میرا خیال ہے کہ انسان کی زیادہ جامع تعریف، جس میں اس کی تمام دوسری صفتیں شامل ہوجائیں، وہ شاید یہ ہوگی کہ انسان ایک جویائے مسرت حیوان ہے:

Man is a pleasure-seeking animal.

میرا تجربہ ہے کہ انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ ہمیشہ مسرت کی تلاش میں رہتا ہے۔ ذہنی مسرت، جسمانی مسرت، اپنی چاہتوں کو پانے کی مسرت۔ مگر اس دنیا میں کوئی بھی انسان اب تک اپنی مطلوب مسرت کو پانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

ایک طرف خالق فطرت نے انسان کو ایک مسرت طلب حیوان بنایا۔ دوسری طرف اس نے انسان کے اندر اور انسان کے باہر ایسی ناقابل عبور رکاوٹیں رکھ دیں کہ کوئی شخص اپنی پسندیدہ منزل تک نہ پہنچ سکے۔ اس تضاد کا واحد جواب جنت کا عقیدہ ہے۔ جنت حال کی بظاہر بے معنی زندگی کو مستقبل کی بامعنی زندگی میں تبدیل کرتا ہے۔ موجودہ المناک صورت حال میں صرف جنت کا عقیدہ ہے جو آدمی کی زندگی کو معنویت عطا کرتا ہے۔ اگر جنت کے عقیدہ کو حذف کر دیا جائے تو انسان کی زندگی ایک ناقابل فہم معما بن کر رہ جائے۔

۲۰ اگست ۱۹۹۳

ایک صاحب نے کہا کہ میں آپ کی تحریریں برابر پڑھتا ہوں۔ کئی تقریریں بھی سنی ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ آپ غیر مسلموں کے مقابلہ میں یکطرفہ طور پر بس نرم ہوتے جارہے ہیں۔ آخر آپ کی اسلامی غیرت کہاں گئی۔

میں نے کہا کہ یہ اسلامی غیرت کا معاملہ نہیں، یہ اسلامی حکمت کا معاملہ ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ الاسلام یعلو ولا یعلیٰ علیہ (اسلام غالب ہوتا ہے، وہ کبھی مغلوب نہیں ہوتا۔ اس حدیث میں اسلام کی حربی برتری کا ذکر نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ جنگ کے میدان

میں تو بار بار وتلک الایام نداولہا بین الناس کا معاملہ ہوتا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث میں اسلام کی فکری برتری کا ذکر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فکری اور نظریاتی مقابلہ میں اسلام ہمیشہ سربلند رہے گا۔ اسلام کو کبھی نظریاتی مغلوبیت کا تجربہ پیش نہیں آئے گا۔

موجودہ زمانہ میں داعی اور مدعو کے درمیان کھنچاؤ کا ماحول اسلام کی اس صفت کے ظہور میں رکاوٹ بن گیا ہے۔ اگر کسی طرح اس منفی تضاد کو ختم کر دیا جائے تو اسلام اپنی فکری برتری کی بنا پر لوگوں کو مسخر کرنا شروع کر دے گا۔

میں نے کہا کہ دو نا مساوی فریقوں میں صلح ہمیشہ طاقت ور فریق کے لئے مفید ہوتی ہے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ چھری اور خربوزہ میں بحث ہوئی کہ ہم دونوں ایک ساتھ رہیں۔ خربوزہ نے کہا کہ مگر شرط یہ ہے کہ تم کو اپنا نام چھری کے بجائے گھاس رکھنا ہوگا۔ اور مجھ کو شیر کہنا پڑے گا۔ میں ہمیشہ اوپر رہوں گا اور تم کو ہمیشہ نیچے رہنا پڑے گا۔ چھری نے کہا کہ تمہاری سب شرطیں منظور۔ اب بتائیے کہ یہ معاہدۂ صلح کس کے حق میں جائے گا۔

۲۱ اگست ۱۹۹۳

صلاح الدین صاحب (رائچور) ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ رائچور میں ایک صاحب نے کہا کہ تمہارے مولانا وحید الدین خاں مغرب سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ صلاح الدین صاحب نے کہا: ہاں وہ متاثر تو ہیں، مگر وہ اللہ سے متاثر ہیں نہ کہ مغرب سے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ وہ مغرب کی ہر بات سے اللہ اور آخرت کی بات نکالتے ہیں۔

۲۲ اگست ۱۹۹۳

دور جدید میں اسلام کے احیاء کی باتیں بہت زیادہ کی گئی ہیں۔ بے شمار قربانیاں دی گئی ہیں۔ مگر اب تک اسلام کا احیاء نو نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو آدمی اٹھتا ہے وہ ابتدائی بنیاد کا کام کئے بغیر اوپری طور پر اسلام کا قلعہ کھڑا کر دینا چاہتا ہے۔ الرسالہ مشن دراصل وہ ابتدائی فکری اساس بنانے کی تحریک ہے جس پر آگے کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ تعمیر اساس کا یہ کام بے حد مشکل اور بہت زیادہ دیر طلب ہے۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کو بنائے بغیر کوئی عملی نتیجہ ظاہر ہونا بھی ممکن نہیں۔

۲۳ اگست ۱۹۹۳

ناندیر کے ایک نوجوان اقبال محی الدین صدیقی (۲۲ سال) ملاقات کے لئے آئے۔ ان کے والد الرسالہ کے قاری ہیں۔ انھوں نے اپنے بیٹے سے کہا تھا کہ تم دہلی جارہے ہو تو وہاں "الرسالہ والے مولانا" سے ضرور ملاقات کرنا۔ انھوں نے نصیحت کے لئے کہا۔ میں نے ان کی ڈائری میں یہ الفاظ لکھ دئے: اس دنیا میں ہر آدمی اپنی محنت کے بقدر پاتا ہے۔ اس دنیا کا اصول یہ ہے کہ ——— جتنی محنت اتنی کامیابی۔

۲۴ اگست ۱۹۹۳

آج دہلی کے تالکٹورہ اسٹیڈیم میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی طرف سے ایک جلسہ تھا۔ وسیع ہال پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ بہت بڑی تعداد میں دہلی اور دہلی کے باہر کے بی جے پی سے تعلق رکھنے والے ہندو جمع تھے۔ منچ پر ان کے اکثر بڑے بڑے لیڈر موجود تھے۔ مجھے بھی تقریر کے لئے بلایا گیا تھا۔

میں نے کہا کہ زندگی کے دو طریقے ہیں۔ الگاؤ واد اور ملاپ واد۔ اسلام کا طریقہ ملاپ واد کا طریقہ ہے۔ چنانچہ قرآن میں کہا گیا ہے: الصلح خیر (النساء ۱۲۸) اور فرمایا کہ واللہ یدعوا الی دار السلام (یونس ۲۵)

میں نے کہا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن مارکاٹ کی کتاب ہے۔ وہ جاہل ہیں۔ وہ اپنے اگیان کو قرآن کے آئینہ میں دیکھ رہے ہیں۔ مسٹر زاد چودھری (مقیم لندن) کا انٹرویو ٹائمس آف انڈیا ۸ اگست ۱۹۹۳ میں چھپا ہے۔ وہ بجا طور پر کہتے ہیں قرآن کے ٹکسٹ میں مجھ کو کوئی بے ٹھیک بات نہیں ملی۔ جو بے ٹھیک باتیں ہیں وہ سب کمنٹری میں ہیں۔ سلمان رشدی نے اپنی کتاب (The Satanic Verses) کمنٹری کی بنیاد پر لکھی ہے نہ کہ قرآن کے ٹکسٹ کی بنیاد پر۔

میں نے کہا کہ کمنٹری ہر آدمی کا اپنا انٹرپٹیشن ہوتا ہے۔ اور انٹرپٹیشن میں ہمیشہ اختلاف ہوتا ہے۔ چنانچہ گیتا کے متعلق کچھ ہندو شارحین کا کہنا ہے کہ وہ جنگ کی کتاب ہے۔ مگر اسی گیتا کو مہاتما گاندھی نے امن کی کتاب بتایا ہے۔

اکثر غلط فہمیاں صرف بے شعوری کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

۲۵ اگست ۱۹۹۳

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا کیس کیا ہے، اس کے بارہ میں جناب محمد حنیف صاحب (ناگپور) سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس زمانہ کے مسلمانوں کا کیس (degenaration) کا کیس ہے۔ اب اس کا حل صرف ایک ہے۔ مسلمانوں کو دوبارہ regenerate کیا جائے۔ موجودہ زمانہ میں بے شمار کوششوں اور قربانیوں کے باوجود مسلمانوں کو دوبارہ اٹھانا ممکن نہ ہوسکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل کام تو regeneration کا تھا، مگر رہنماؤں نے اس کو excitement کا معاملہ سمجھ لیا۔ ہر ایک مختلف انداز سے جوش دلانے کا کام کرتا رہا۔ کسی نے تاریخی عظمت بیان کی۔ کسی نے تاریخی فخر کے جذبہ کو ابھارا۔ کسی نے سیاسی نعرہ لگایا۔ کسی نے فضائل کی داستانیں سنائیں۔ غرض ہر ایک بس جذبات کو ابھارتا رہا۔ جب کہ اصل کام شعور کو بیدار کرنا تھا۔

دور اوّل کے مسلمانوں کے لئے اسلام ایک ڈسکوری تھا۔ آج ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے لئے اسلام کو دوبارہ rediscovery بنایا جائے۔ اس کے بغیر احیاء ملت کا کوئی امکان نہیں۔

۲۶ اگست ۱۹۹۳

ایک صاحب نے کہا کہ آپ ہمیشہ صلح کی بات کرتے ہیں، ایسا کیوں۔ میں نے کہا کہ صلح کی بات وہ نہیں کرتا جو کمزور ہو۔ میں اسلام کو سب سے بڑی طاقت سمجھتا ہوں، اس لئے میں ہمیشہ صلح کے لئے تیار رہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ طاقت ور آدمی ہمیشہ صلح کا خیر مقدم کرتا ہے کیونکہ دو نامساوی فریقوں کے درمیان صلح ہمیشہ طاقت ور فریق کے لئے مفید ہوتی ہے۔

۲۷ اگست ۱۹۹۳

ماہنامہ حیات نو (جولائی ۱۹۹۳) کے صفحہ اول پر "کسب کمال" کے عنوان سے یہ الفاظ چھپے ہوئے تھے: ہر حلقہ میں استعداد و قابلیت ہی کی آج بھی پوچھ ہے۔ جدید تعلیم کے حلقہ میں بھی، دینی تعلیم کے دائرہ میں۔ غیر قابل کی کہیں پوچھ نہیں۔ اور قابل آدمی ہر جگہ اپنا مقام پالیتا ہے۔ پس کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی۔ کمال حاصل کرو تاکہ دنیا والوں کے پیارے

بن جائے (مولانا جلیل احسن ندوی)

میں نے اس کو پڑھا تو میں نے کہا کہ یہ ایک صحیح بات ہے مگر اس کو کمزور الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ صحیح بات کو بھی طاقت ور الفاظ میں بیان کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک عملی حقیقت ہے کہ جب تک الفاظ میں طاقت نہ ہو، معنی میں طاقت نہیں آتی۔

۲۸ اگست ۱۹۹۳

ایک صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ مجھے بار بار سفر کرنا پڑتا ہے۔ مگر سفر ہمیشہ میرے لئے ایک وحشت ناک تجربہ ہوتا ہے۔ میں مجبوری کے تحت سفر کرتا ہوں نہ کہ خوشی کے تحت۔ میرا خیال ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے معمولات کا عادی بن جاتا ہے اور سفر خواہ بظاہر کتنا آرام دہ ہو، بہر حال آدمی کے معمولات سفر میں ٹوٹ جاتے ہیں۔ معمولات کے ٹوٹنے کی وجہ سے سفر راحت کے بجائے زحمت بن جاتا ہے۔

۲۹ اگست ۱۹۹۳

کولمبو (سری لنکا) میں رابطۂ عالم اسلامی اور سعودی عرب کی وزارت اوقاف کے زیر اہتمام ایک ایشیائی کانفرنس ہوئی۔ ان کی دعوت کے تحت میں بھی اس میں شریک تھا۔ انڈیا کے پروفیسر زبیر فاروقی نے بتایا کہ کانفرنس کے دوران ایک بار وہ اور ایک پاکستانی ڈیلی گیٹ بس میں ساتھ تھے۔ پاکستانی صاحب نے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں۔ فاروقی صاحب نے کہا کہ میں جامعہ ملیہ (دہلی) میں عربی شعبہ میں استاد ہوں۔ پاکستانی صاحب نے دوبارہ پوچھا کہ آپ کو کتنی تنخواہ ملتی ہے۔ زبیر فاروقی صاحب نے ناگواری کے ساتھ اپنی ماہانہ تنخواہ بتائی۔ یہ سن کر پاکستانی صاحب نے کہا: اتنی رقم میں آپ کا گزر کیسے ہوتا ہے۔

اس گفتگو کے وقت مولانا عبد الحمید رحمانی موجود تھے۔ انھوں نے فوراً کہا کہ آپ کو یہ کہنا چاہئے تھا کہ ہاں، اتنی رقم میں تو گزر نہیں ہو سکتا۔ مگر آپ ہر مہینہ جو رقم بھیج دیتے ہیں اس کی وجہ سے کام چل جاتا ہے۔

۳۰ اگست ۱۹۹۳

ہر آدمی کو معلوم ہے کہ جو وقت گزر گیا وہ دوبارہ واپس آنے والا نہیں۔ مگر لوگوں کی

زندگیوں کو دیکھئے تو ایسا محسوس ہوگا جیسے اس جانی ہوئی بات کو بھی اب تک کسی نے نہیں جانا۔ لوگ وقت کو اتنی بے دردی کے ساتھ ضائع کرتے ہیں جیسے کہ وہ ابدی طور پر انھیں حاصل ہے، وہ کبھی ان سے چھننے والا نہیں۔

۳۱ اگست ۱۹۹۳

آج صبح کی فلائٹ سے میں کولمبو سے واپس آیا۔ وہاں میری ملاقات ایک مسلمان پروفیسر سے ہوئی۔ وہ ترجمہ کے کام کے لئے بلائے گئے تھے۔ اسی کام کو وہ پچھلے ۲۵ سال سے کر رہے ہیں۔ وہ عربی سے انگریزی اور انگریزی سے عربی میں فوری ترجمہ کرتے تھے۔ ترجمانی کے کام پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی۔ وہ ایک پروفیشنل ترجمان ہیں۔

ان سے کئی بار گفتگو ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ ترجمہ کے کام میں تو وہ بہت ماہر ہیں۔ مگر کسی فکری موضوع پر بولنے کے لئے وہ بالکل نااہل ہیں۔ ترجمہ کے کام کا اکسپرٹ فکری موضوع پر بچوں کی سی بات کرنے لگتا تھا۔ اسی کے ساتھ میں نے دیکھا کہ ان کی زندگی نہایت پرسکون ہے۔ میں نے کبھی ان کو پریشان نہیں پایا۔

اصل یہ ہے کہ تفکیری صلاحیت کے لئے تخلیقی صلاحیت درکار ہے۔ اور تخلیقی صلاحیت کبھی پرسکون ذہن میں جمع نہیں ہوتی۔ مذکورہ صاحب کا پرسکون مزاج ان کے ترجمانی کے کام میں بہت مددگار تھا، مگر اس مزاج کی انھیں یہ قیمت دینی پڑی کہ ان کے اندر تخلیقی فکر پیدا نہیں ہوا۔

یکم ستمبر ۱۹۹۳

بمبئی کے ایک تاجر نے ہندوؤں کی شکایت کی۔ انھوں نے کہا کہ ہندو متعصب اور مسلم دشمن ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ بمبئی میں بزنس کرتے ہیں تو آپ کو ہندوؤں سے سابقہ پیش آتا ہے یا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ میرا تو پارٹنر ہندو ہے۔ ہمارا کام زیادہ تر ہندوؤں کے درمیان ہوتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ ذاتی معاملات میں آپ نے ہندوؤں کو کیسا پایا۔ انھوں نے کہا کہ بہت اچھا۔ میں نے کہا کہ پھر آپ ڈبل اسٹینڈرڈ کیوں ہیں۔ ذاتی معاملہ میں آپ ہندوؤں کو اچھا سمجھتے ہیں اور ملّی مسئلہ میں ہندوؤں کی برائی کر رہے ہیں۔

یہی بیشتر مسلمانوں کا حال ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذاتی معاملہ میں ان مسلمانوں کی

سوچ انٹرسٹ کے تحت چلتی ہے۔ اور جب ملّی مسئلہ سامنے ہو تو فوراً اس کو قومی پرسٹیج کے ذہن سے دیکھنے لگتے ہیں۔ ذاتی معاملہ میں ان کا نقطۂ نظر انسانی ہوتا ہے اور ملّی معاملہ میں ان کا نقطۂ نظر قومی۔ مسلمانوں کا یہ مزاج ان کے دین اور دنیا دونوں کے لئے ہلاکت خیز حد تک غلط ہے۔

انٹرسٹ کے جذبہ کے تحت کسی سے معاملہ کرنا ہو تو آدمی ہمدردی کا انداز اختیار کرتا ہے۔ مگر جب پرسٹیج کا ذہن ہو تو آدمی فوراً فریق ثانی کو رقیب اور حریف کے انداز میں دیکھنے لگتا ہے۔ فریق ثانی کے بارہ میں جب آپ کے اندر ہمدردی کا جذبہ ہو تو معاملات خوش اسلوبی کے ساتھ طے ہو جاتے ہیں۔ اور جب فریق ثانی کو حریف سمجھ لیا جائے تو چھوٹی سی بات بھی الجھ کر بڑی بات بن جاتی ہے۔

۲ ستمبر ۱۹۹۳

ڈاکٹر سراج الحسین صاحب حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ اب وہ ۲۰ سال سے امریکہ میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی ملاقات ایک امریکی پروفیسر سے ہوئی۔ سراج الحسین صاحب نے ان سے پوچھا:

Do you believe in God

اس نے کہا کہ نہیں (No) سراج الحسین صاحب نے پوچھا کہ کیوں نہیں۔ اس نے کہا کہ خدا کے وجود کا کوئی سائنٹفک ثبوت نہیں۔ اس سے اس کی مراد یہ تھی کہ خدا کے اثبات کے لئے کوئی ڈائرکٹ قسم کا ثبوت نہیں ملتا۔

سراج الحسین صاحب نے کہا کہ سائنس میں بہت سی باتیں ڈائرکٹ ثبوت کے بغیر مانی جاتی ہیں۔ پھر آپ اس بنا پر خدا کا انکار کیوں کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے کہا کہ اکسرے (X-Rays) کی مثال لیجئے۔ جرمن سائنس داں رانٹجن (Rontgen) ۱۸۹۰ میں الیکٹرومیگنیٹک ریڈئیشن کا تجربہ کر رہا تھا، اس نے اپنے سامنے ایک ایسے effect کا مشاہدہ کیا جس کا سبب اسے معلوم نہ تھا۔ اس نے مزید تجربات کے بعد کہا کہ یہ ناقابل مشاہدہ شعاعوں کی بنا پر ہے۔ اس نے ان ناقابل مشاہدہ شعاعوں کو اکسرے (X-Rays) کیا۔

سراج الحسین صاحب نے کہا کہ آپ الکٹرانکس میں ایک چیز کا تجربہ کرتے ہیں، اس کا effect آپ کو نظر آتا ہے مگر effect پیدا کرنے والے کو آپ نہیں دیکھتے۔ آپ ان دیکھی چیز پر اتنا یقین رکھتے ہیں کہ اس کو دیکھی ہوئی چیز کی طرح مانتے ہیں۔

۳ ستمبر ۱۹۹۳

مولانا انعام الرحمٰن خاں بھوپالی ۲۳ اگست ۱۹۹۲ کو ۸۱ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ وہ عالم نہیں تھے۔ تاہم انھیں مولانا کہا جاتا تھا۔ وہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے لٹریچر سے متاثر ہوئے اور آخر وقت تک جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔ ریڈئنس ویکلی (۲۹ اگست ۱۹۹۳) میں ان پر ایک مضمون چھپا ہے۔ اس میں درج ہے کہ مرحوم کے اپنے الفاظ میں، مولانا مودودی کی کتاب "اسلام کا سیاسی نظریہ" نے ان کی زندگی کا رخ متعین کر دیا:

In the words of the late Maulana, the famous booklet, "Islam ka Siyasi Nazariya" authored by Maulana Maudoodi, fixed the direction of his life.

یہی مولانا مودودی کا اور جماعت اسلامی کے اکثر افراد کا حال ہے۔ ان سب کو اسلام کے سیاسی پہلو، یا صحیح تر الفاظ میں، اسلام کی سیاسی تعبیر نے متاثر کیا۔ اور اسی سے ان کی پوری فکر بنی۔ پھر جن لوگوں کا فکر سیاسی تعبیرات سے بنا ہو اور اسی سے ان کی زندگی کا رخ متعین ہوا ہو وہ اسلام کے ربانی پہلو کی اہمیت کو کیوں کر محسوس کر سکتے ہیں۔

۴ ستمبر ۱۹۹۳

دیوبند کے دو عالم آئے۔ میں نے غیر مسلموں کے درمیان دعوت کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ مسلمان تو خود اصلاح یافتہ نہیں۔ پھر وہ دوسری قوموں کو کس طرح اسلام کی دعوت دے سکتے ہیں۔ میں نے تفسیر ابن کثیر، جلد اول کا صفحہ ۸۵ دکھایا۔ اس میں ابن کثیر نے علماء کا اتفاق نقل کیا ہے کہ دعوت کے لئے عامل ہونے کی شرط نہیں۔

انھوں نے کہا کہ عمل خواہ شرط دعوت نہ ہو مگر انسب طریقہ تو یہی ہے داعی باعمل ہو۔ اس لئے پہلے مسلمانوں کو باعمل بنانا ہے۔ میں نے کہا کہ نماز کے لئے خشوع یقیناً مطلوب ہے لیکن اگر ایک مسلمان کے اندر خشوع نہ ہو تب بھی اس کو نماز پڑھنا ہوگا۔ خشوع کا نہ ہونا نماز کی فرضیت

کو ساقط نہیں کرتا۔ یہی معاملہ داعی کے لئے عمل کا ہے۔ اگر داعی کے اندر عمل ہے تو بہت اچھا ہے، مگر یہ جائز نہ ہوگا کہ اگر مسلمانوں کے اندر عمل موجود نہ ہو تو وہ دعوتی کام نہ کریں۔

۵ ستمبر ۱۹۹۳

۵ ستمبر کو میں اورنگ آباد میں تھا۔ پہلی بار جب میں اورنگ آباد گیا تو وہاں صرف چند آدمیوں کی ایک چھوٹی سی میٹنگ ہو گئی تھی۔ اس بار صرف میری تقریر کے نام پر جلسہ ہوا اور ہزاروں آدمی صرف میری تقریر سننے کے لئے جمع ہو گئے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا فضل خاص ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الرسالہ مشن تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اور وہ وقت آنے والا ہے جب کہ ملک میں الرسالہ کی آواز ہی سب سے زیادہ طاقت ور آواز ہوگی۔ انشاء اللہ العزیز۔

۶ ستمبر ۱۹۹۳

زمین کی سطح کا ۷۲ فیصد حصہ پانی سے ڈھکا ہوا ہے۔ اور اگر پہاڑوں کو ہٹا کر سطح زمین کو ہموار کر دیا جائے تو ساری زمین پانی سے ڈھک جائے گی۔ انسانی جسم کا ۸۵ فیصد حصہ پانی پر مشتمل ہے۔ زندہ اشیاء کو اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ پانی ہے۔ دوسرے سیاروں پر زندگی اسی لئے نہیں کہ وہاں پانی موجود نہیں۔

۷ ستمبر ۱۹۹۳

اس دنیا میں پیدا ہونے والا ہر انسان عاجز ہے۔ خواہ بظاہر وہ کمزور ہو یا طاقتور۔ آدمی کے پاس عجز مطلق کے سوا اور کوئی سرمایہ نہیں۔ مگر آدمی کی اس عاجزانہ حیثیت پر قدرت کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ آدمی بظاہر اپنے کو قادر محسوس کرتا ہے حالاں کہ باعتبار حقیقت وہ صرف عاجز ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں

مگر مجھے اپنا معاملہ ایک استثنائی معاملہ نظر آتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے اوپر سے اللہ تعالیٰ نے قدرت کا ظاہری پردہ ہٹا دیا ہے۔ میں اپنے آپ کو اندر سے بھی عاجز پاتا ہوں اور باہر سے بھی عاجز۔ یہ بڑی ہی سخت آزمائش ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ نے اس آزمائش کے لئے کیوں میرا انتخاب فرمایا۔

۸ ستمبر ۱۹۹۳

ایک ہندو جرنلسٹ مسٹر لیشونت دلیش کھا انٹرویو کے لئے آئے۔ ان کے مختلف سوالوں میں سے ایک سوال یہ تھا کہ "اسلام میں آلوچنا (تنقید) کو برداشت نہیں کیا جاتا"۔ میں نے کہا کہ یہ تو الٹی بات ہے۔ اسلام میں تو تنقید یا اختلاف کو پسند کیا جاتا ہے۔ ایک حدیث ہے کہ: اختلاف امتی رحمۃ۔

اس میں اختلاف سے مراد وہی چیز ہے جس کو انگریزی میں ڈیسینٹ (dissent) کہا جاتا ہے۔ یعنی اختلاف رائے۔ اسلام کے دور اول میں اختلاف رائے یا تنقید عام تھی۔ کوئی بھی آدمی کسی شخص پر تنقید کرسکتا تھا۔ اس سلسلہ میں میں دور اول کے کئی واقعات بتائے۔

مذکورہ جرنلسٹ بہت خوش ہوا۔ جاتے ہوئے اس نے کہا کہ اسلام کے بارہ میں میرے بہت سے شبہات تھے۔ آج سب ختم ہوگئے۔

۹ ستمبر ۱۹۹۳

دار العلوم دیوبند کے سابق شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی (۱۹۵۷-۱۸۷۹) نے اپنے آخری زمانہ میں جماعت اسلامی کے خلاف کچھ تحریریں شائع کرائی تھیں۔ ان میں بڑے زور شور کے ساتھ یہ مسئلہ بیان کیا گیا تھا کہ "کلمہ گو کے لئے جنت ہے"۔

موجودہ زمانہ میں اکثر علما کا یہی حال ہے۔ میں جب اس پر غور کرتا ہوں تو مجھے سخت تعجب ہوتا ہے کہ یہ لوگ آخر حقیقت دین سے اتنا زیادہ بے خبر کیوں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بخاری کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ من قال لا الٰہ دخل الجنۃ۔ مگر اس کی تشریح مسلم کی روایت سے ہورہی ہے۔ جس میں یہ الفاظ ہیں کہ من عرف ان لا الٰہ الا اللّٰہ دخل الجنۃ

پوری حدیث پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا اصل حقیقت یہ ہے کہ عارفِ کلمہ کے لئے جنت ہے نہ کہ قائل کلمہ کے لئے۔

۱۰ ستمبر ۱۹۹۳

ایک ہندو جرنلسٹ لیشونت دلیش کھ سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران کشمیر کا ذکر آیا۔ انھوں نے اس سے اتفاق کیا کہ نئی دہلی کی طرف سے کشمیر کی ترقی کے لئے جو پیسہ دیا گیا وہ وہاں کے

عوام کو بہت کم پہنچا۔ زیادہ تر وہ کشمیری لیڈروں کی جیب میں چلا گیا۔ اس کی وجہ سے کشمیر کے لوگوں میں ایک قسم کی مایوسی کا احساس پیدا ہوا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ہندستان کے ساتھ الحاق سے انھیں کوئی خاص فائدہ نہیں ملا۔

مسٹر دیش مکھ نے کہا کہ اس بارے میں کشمیر کے سابق گورنر جگموہن سنگھ نے لکھا ہے کہ بطور واقعہ یہ بات صحیح ہے۔ مگر اس کا اصل سبب دستور ہند کی دفعہ ۳۷۰ ہے۔ یہ دفعہ ہندستان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ کشمیر کی ترقی کے لئے جو رقم دے وہ وہاں کے پولٹیکل لیڈروں کی معرفت دے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ دفعہ ۳۷۰ کو ختم کر دیا جائے تاکہ دہلی اس پوزیشن میں ہو جائے کہ وہ براہ راست طور پر کشمیر کی ترقی کے لئے کام کر سکے۔

میں نے کہا کہ جو کچھ کشمیر میں ہوا وہی ملک کی تمام دوسری ریاستوں میں بھی ہوا۔ ہر جگہ کے لوگوں نے امداد کی رقمیں لوٹ لیں اور ریاست کے عوام محروم رہ گئے۔ پھر دوسری ریاستوں میں بھی کیا کوئی دفعہ ۳۷۰ موجود تھی۔

یہی وہ چیز ہے جس کو میں نے ایک میٹنگ میں Pseudo intellectualism کہا تھا۔ ہمارے ملک کو سب سے زیادہ نقصان سوڈو انٹلکچول سے پہنچا ہے۔ مسٹر جگموہن بھی انھیں میں سے ایک ہیں۔

۱۱ ستمبر ۱۹۹۳

آج کے تمام اخباروں میں صفحہ اول کی پہلی خبر یہ تھی کہ پی ایل او (فلسطینی آزادی کی تنظیم) اور اسرائیل نے ایک دوسرے کو تسلیم کر لیا۔ ہندستان ٹائمس کی سرخی یہ تھی:

Israel, PLO formally recognise each other.

اس کے مطابق غازہ اسٹرپ اور جیریکو (Jericho) میں اسرائیل فلسطینیوں کو آٹونومی (محدود آزادی) کا حق دیدے گا اور اس کے جواب میں پی ایل او پورے فلسطین میں اسرائیل کی حکومت تسلیم کر لیں گے۔ آج تمام اخباروں میں اس فیصلہ پر ایڈیٹوریل چھپا ہے۔ ٹائمس آف انڈیا نے اس کو ایک ڈرامائی آغاز (dramatic beginning) کہا ہے۔ پیٹریاٹ نے اپنے ایڈیٹوریل کی سرخی ان الفاظ میں قائم کی ہے ——— مغربی ایشیا میں نقطۂ انقلاب:

Turning point in West Asia.

۱۲ ستمبر ۱۹۹۳

کچھ لوگوں سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ دعوتی نقطۂ نظر سے ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ دور قدیم اور دور جدید کے فرق کو سمجھا جائے۔ پہلے زمانہ میں جو قانونی تفریق تھی وہ سرکاری مذہب اور غیر سرکاری مذہب کی بنیاد پر تھی، اب یہ تفریق امن اور تشدد کی بنیاد پر ہے۔ یعنی پہلے سرکاری مذہب کو قانونی اجازت تھی، اور غیر سرکاری مذہب کو کچل دیا جاتا تھا۔ اب یہ تفریق ختم ہو چکی ہے۔ اب جو تفریق ہے وہ یہ ہے کہ پرامن طور پر اگر آپ تحریک چلائیں تو آپ کو اپنی تحریک چلانے کی پوری اجازت ہوگی۔ لیکن اگر آپ تشدد کی بنیاد پر تحریک چلائیں تو وہ غیر قانونی سمجھی جائے گی اور آپ حکومت کی زد میں آجائیں گے۔

۱۳ ستمبر ۱۹۹۳

کشمیر کے ایک صاحب سے بات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ انڈیا نے ۱۹۴۸ میں وعدہ کیا تھا کہ وہ کشمیر میں ریفرنڈم کرائے گا۔ مگر اس نے ریفرنڈم نہیں کرایا۔ میں نے کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان حقیقتوں کو اتنا کم کیوں جانتے ہیں۔ آپ لوگوں کو یہ حقیقت جاننا چاہئے کہ پولیٹکل فیصلے ہمیشہ حال کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ ماضی کی بنیاد پر کبھی پولیٹکل فیصلے نہیں ہوتے۔ پی ایل او کا اسرائیل کو تسلیم کرنا اسی حقیقت کا اعتراف ہے۔ پی ایل او کے لیڈر چالیس سال سے یہ کوشش کرتے رہے کہ وہ ماضی کی بنیاد پر فلسطین کا فیصلہ کرائیں۔ آخر کار انھیں معلوم ہوا کہ یہ ناممکن ہے۔ چنانچہ انھیں اس پر راضی ہونا پڑا کہ وہ حال کی سیاسی منطق کو اس معاملہ میں تسلیم کرلیں۔

۱۴ ستمبر ۱۹۹۳

۱۳ ستمبر کو واشنگٹن (وھائٹ ہاؤس) میں فلسطینی لیڈر یاسر عرفات اور اسرائیلی وزیر اعظم یتزک رابن کے درمیان ایک دوسرے کو تسلیم کرنے کے معاہدہ پر دستخط ہوگئے۔ اسرائیل نے فلسطینیوں کو دو چھوٹے علاقے میں محدود وقتی آزادی دیدی جو کہ پاکستان اور بنگلہ دیش کی طرح ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ جب ۱۹۴۸ سے اب تک تمام دنیا کے مسلمانوں کا

موقف یہ تھا کہ وہ اسرائیل کے وجود کو کسی قیمت پر ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔

پچھلے پچاس سال سے ساری دنیا کے تمام مسلمان فلسطینی تحریک کے حامی تھے۔ اس مہم میں جان و مال کا جو نقصان ہوا وہ اتنا زیادہ ہے کہ اس کا کوئی شمار نہیں کیا جاتا۔ شیخ حسن البنا سے لے کر مولانا ابوالحسن علی ندوی تک کوئی ایک شخص نہیں جو اس معاملہ میں فلسطینیوں کی حمایت نہ کر رہا ہو۔ مگر ان سب کے باوجود فلسطینیوں کو اور تمام دنیا کے مسلمانوں کو نہایت ذلت کے ساتھ اس صلح کو قبول کرنا پڑا۔

فلسطین کا یہ معاملہ اس حقیقت کا آخری اظہار ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان اللہ کی نظر میں ایک قسم کے غیر مطلوب انسان بن چکے ہیں۔ امت پر وہ دور آگیا ہے جس کی پیشین گوئی حدیث میں ان الفاظ میں کی گئی تھی: يذهب الصالحون الاول فالاول وتبقى حثالة كحثالة الشعير لا يباليهم الله بالةً (فتح الباری ۱۱/۲۵۶)

۱۵ ستمبر ۱۹۹۳

اقبال کا ایک شعر ہے کہ مصطفیٰ کے چراغ اور ابولہب کے شرارہ کے درمیان ازل سے مقابلہ جاری رہا ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

اس شعر میں مصطفیٰ اور ابولہب کو اگر لفظی معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مصطفیٰ اور ابولہب دونوں ازل سے موجود تھے۔ حالاں کہ یہ درست نہیں۔ یہاں یہ الفاظ علامتی معنی میں ہیں۔ مصطفیٰ کا لفظ حق کی علامت ہے اور ابولہب کا لفظ باطل کی علامت۔ نیز ازل کا لفظ بھی علامتی معنی میں ہے نہ کہ منطقی معنی میں۔

شاعر نے یہ نہیں کہا کہ شعر میں یہ الفاظ وہ علامتی معنی میں استعمال کر رہے ہیں، ان باتوں کو اپنی عقل سے سمجھنا پڑتا ہے۔ اسی طرح ہر عبارت کو سمجھنے کے لئے عقل ضروری ہے، جو لوگ بے عقلی کے ساتھ مطالعہ کریں وہ نہ انسانی کلام کو سمجھ سکتے اور نہ خدائی کلام کو۔

۱۶ ستمبر ۱۹۹۳

ٹیلیفون پر ایک صاحب نے کہا کہ میں جامع مسجد سے عادل اسیر بول رہا ہوں۔ انھوں

نے کہا کہ میں آپ کے ادارہ میں ملازم تھا۔ مگر آپ کے صاحبزادہ ڈاکٹر ثانی اثنین نے میرے ساتھ بہت بدمعاملگی کی۔ وہ تقریری انداز میں دیر تک بولتے رہے اور کہا کہ میں آپ سے ملنے کے لئے وقت چاہتا ہوں۔

میں نے کہا کہ انتظامی امور سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ آپ کوئی متعین شکایت بتائیں تو میں اس پر غور کروں گا۔ مگر وہ ایک بھی متعین شکایت نہ بتا سکے۔ پھر میں نے کہا کہ میں تبلیغی جماعت کے رحمٰن نیر صاحب کو ثالث بناتا ہوں۔ آپ ان سے اپنی پوری بات کہیں۔ وہ جو فیصلہ دیں گے، میں اس کو مان لوں گا۔ وہ اس پر راضی نہیں ہوئے۔ میں نے کہا کہ پھر جماعت اسلامی کے مکتبہ کے منیجر اقبال جاوید صاحب کو ثالث بنا لیجئے۔ وہ اس پر بھی راضی نہیں ہوئے۔ پھر میں نے کہا کہ مدرسہ حسین بخش کے استاد مولانا قاسم صاحب کو ثالث بنا لیجئے۔ وہ اس پر بھی راضی نہیں ہوئے۔ پھر میں نے کہا کہ جماعت اہل حدیث کے مولانا عبد الحمید رحمانی صاحب کو ثالث بنا لیجئے۔ وہ اس پر بھی راضی نہیں ہوئے۔

انھوں نے کہا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں اور آپ ہی اس کا فیصلہ کریں۔ میں نے کہا کہ میں ایک مولوی آدمی ہوں۔ میرا کام لکھنا پڑھنا اور تقریر کرنا ہے۔ انتظامی امور کی واقفیت مجھے نہیں ہے۔ اس لئے میں ایسے معاملہ میں ثالثی کا کام نہیں کر سکتا۔ وہ مُصر رہے تو میں نے کہا کہ آپ کے پڑوس میں جامع مسجد کے امام مولانا عبد اللہ بخاری ہیں، ان سے پوچھ کر مجھے بتائیے کہ انتظامی معاملہ کا ثالث ایک مولوی بن سکتا ہے یا ایک ایسا شخص جو انتظام کا تجربہ رکھتا ہو اور اس سے واقف ہو۔ وہ اس پر بھی راضی نہیں ہوئے۔ اس کے باوجود انھیں یہی یقین تھا کہ وہ حق پر ہیں۔ غلطی صرف دوسرے کی ہے نہ کہ ان کی۔

۱۷ ستمبر ۱۹۹۳

دی ڈیلی ٹیلیگراف میں پیٹرک بشپ (Patric Bishop) کے قلم سے ایک رپورٹ فلسطینیوں اور اسرائیل کے معاہدہ کے بارے میں چھپی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے مجبورانہ اسباب کے تحت فلسطینی لیڈر یاسر عرفات کو بہت چھوٹی چیز پر راضی ہونا پڑا، کیوں کہ اس کے بعد انھیں کچھ بھی ملنے والا نہیں تھا:

> The peace deal may be a small thing at first sight, but it was a choice between something or nothing. And for once history compelled Palestinians to choose something.

مگر اسی واقعہ کے بارہ میں دہلی کے مسلم اخبار نئی دنیا (۱۷-۲۳ ستمبر ۱۹۹۳) نے جو رپورٹ چھاپی ہے اس کی سرخی یہ ہے —— فلسطینیوں کے جذبۂ جہاد اور جوشِ ایمانی نے اسرائیل کو سمجھوتہ کرنے پر مجبور کر دیا۔

اس تقابل سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو کیوں مغربی پریس سے یہ شکایت ہے کہ وہ مسلم خبروں کو غلط صورت میں پیش کرتا ہے۔ پیٹرک بشپ نے اصل واقعہ کو ویسا کا ویسا ہی بیان کر دیا ہے۔ مگر اپنی یہ تصویر مسلمانوں کو پسند نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی شکست کو بھی فتح کے الفاظ میں بیان کیا جائے۔ مسلمانوں کے اپنے اخبارات یہی کام کر رہے ہیں جس کی ایک مثال مذکورہ اردو سرخی بھی ہے۔ اسی لئے مسلمانوں کو 'نئی دنیا' پسند ہے اور 'ڈیلی ٹیلی گراف' ناپسند۔

۱۸ ستمبر ۱۹۹۳

قرآن کا کتاب محفوظ ہونا قرآن کی انوکھی صفت ہے۔ اس کی بنا پر ہر مسلمان اسلام کا مبلغ بن جاتا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ نارمل حالات میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات اور ملنا جلنا جاری ہو جائے۔

مثلاً مصر میں فرعون ثانی کا مومیائی کیا ہوا جسد میوزیم میں رکھا ہوا ہے۔ حکومت مصر نے پایا کہ اس کے جسم میں کریک پیدا ہو گیا ہے۔ اس کو ایک ماہر کی تلاش ہوئی۔ آخر کار حکومت مصر نے موریس بکائی (Maurice Bucaille) کو بلایا جو ایک فرانسیسی عالم تھا۔ یہ فرانسیسی عالم جب قاہرہ آیا تو کسی مسلمان نے اس سے کہا کہ تم جانتے ہو، اس فرعون کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ اس کے بعد اس نے موریس بکائی کو یہ آیت بتائی : اليوم ننجيك ببدنك لتكون لمن خلفك آية

موریس بوکائی کو یہ بات بہت عجیب لگی کہ فرعون ثانی کا ذکر قرآن میں ہے جب کہ سو سال پہلے کوئی سرے سے یہ جانتا ہی نہ تھا کہ فرعون ثانی کا جسم کہیں محفوظ حالت میں موجود ہے۔ انھوں

نے قرآن پڑھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنی کتاب (بائبل، سائنس اور قرآن) لکھی۔

۱۹ ستمبر ۱۹۹۳

سلطان ٹیپو نے انگریزوں سے جنگ کی۔ ان کو بری طرح شکست ہوئی۔ ۴ مئی ۱۷۹۹ کو وہ انگریزی فوج کے ہاتھوں بے بسی کے ساتھ قتل کر دئے گئے۔ اس کے بعد شاہ عبد العزیز دہلوی نے ۱۸۰۶ میں انگریزوں کے خلاف جہاد و قتال کا فتویٰ دیا۔

یہ فتویٰ سراسر نادانی کا فتویٰ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بعد کے زمانہ میں ہمارے علماء نے اسلام کو فقہی نظام میں ڈھال دیا۔ وہ اسلام کے فقہی پہلو سے واقف تھے۔ مگر وہ اسلام کے حکیمانہ پہلو سے بے خبر رہے۔ اگر وہ اسلام کے حکیمانہ پہلو کو جانتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ احد کی جنگ (۶۲۵ء) میں جب یہ ظاہر ہوا کہ جنگ کے میدان میں اسلام کو فیصلہ کن فتح ملنا مشکل ہے تو آپ نے ۶۲۸ء میں حدیبیہ کی صلح کر لی۔ یعنی آپ نے میدان مقابلہ کو بدل دیا۔ پہلے اگر اسلام اور غیر اسلام کا مقابلہ جنگ کے میدان میں ہو رہا تھا تو اب دونوں کا مقابلہ فکر اور نظریہ کے میدان میں ہونے لگا جو آخر کار فتح مبین تک پہنچا۔

- ہمارے علما اگر اسلام کے حکیمانہ پہلوؤں سے آگاہ ہوتے تو وہ ٹیپو کی شکست کے بعد الحدیبیہ پرنسپل کو اختیار کرنے کا فتویٰ دیتے۔

۲۰ ستمبر ۱۹۹۳

ایک صاحب نے بابری مسجد کے بارہ میں سوال کیا۔ میں نے کہا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد میں نے جو فارمولا پیش کیا تھا، اس میں کہا گیا تھا کہ مسلمان ایک کو بھلا دیں اور ہندو ایک کے بعد کو بھلا دیں۔ خدا کے فضل سے دونوں عملاً اس کو مان چکے ہیں۔ حالات بتاتے ہیں کہ مسلمان اجودھیا کی مسجد کو بھلا چکے ہیں۔ اسی طرح ہندو بھی ایک کے بعد کی تمام مسجدوں کو بھلا چکے ہیں۔ اب جو مسئلہ ہے وہ صرف چند نااہل اور نادان رہنماؤں کا ہے جو انتہائی غیر ضروری طور پر اس مسئلہ کو زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ دونوں فرقوں میں سے کوئی بھی اب اس موڈ میں نہیں۔ اس لئے ان نام نہاد رہنماؤں کی بات چلنے والی نہیں۔ یہ لیڈر اور ان کے نعرے دونوں اپنے آپ مر جائیں گے۔

۲۱ ستمبر ۱۹۹۳

پاکستان کا روزنامہ مجھے جرائم نامہ معلوم ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اوپر سے لیکر نیچے تک وہاں کا ہر آدمی مجرم بن چکا ہے۔ پاکستان کے کچھ اخبارات پڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد میری زبان پر یہ الفاظ آگئے : آہ وہ لوگ جو جہنم کے قابل بھی نہیں، وہ جنت کی کھڑکی پر لائن لگائے ہوئے ہیں۔

۲۲ ستمبر ۱۹۹۳

میرا بار بار کا تجربہ ہے کہ ہندو کے ساتھ اگر حسن سلوک کیا جائے تو وہ جھک جائے گا۔ مگر مسلمان کا معاملہ مختلف ہے۔ کوئی بھی حسن سلوک مسلمان کو نہیں جھکاتا۔ اس فرق پر غور کرتے ہوئے سمجھ میں آیا کہ ہندو کا کیس عداوت کا کیس ہے اور مسلمان کا کیس قساوت کا کیس۔ قرآن کی گواہی ہے کہ سیئہ کے جواب میں حسنہ کا سلوک کر کے عداوت کو ختم کیا جا سکتا ہے (41:34) مگر قساوت آدمی کو پتھر سے بھی سخت بنا دیتی ہے۔ ایسا آدمی کسی بھی دلیل یا کسی بھی سلوک سے متاثر نہیں ہوتا (2:74)

۲۳ ستمبر ۱۹۹۳

موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں کو دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ جوہر حیات سے بالکل خالی ہو چکے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ لاہور کے روزنامہ نوائے وقت (۷ ستمبر ۱۹۹۳) کے صفحہ اول پر پاکستان کی جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد کی ایک تقریر اسرائیل اور فلسطینیوں کے معاملہ پر چھپی ہے۔ ان کی تقریر کا خلاصہ اس کی سرخی میں ہے۔ سرخی کے الفاظ یہ ہیں : اسرائیل کو تسلیم کرنے کا اشارہ بھی دیا گیا تو عوام جانوں پر کھیل جائیں گے۔

اس کے بعد اسی اخبار کے صفحہ ۳ پر دوسری خبر ہے۔ اس خبر کی سرخی کا عنوان یہ ہے : خلیجی ریاستوں نے پی ایل او ۔ اسرائیل معاہدے کی حمایت کر دی۔ (واضح ہو کہ پی ایل او کے معاہدہ میں اسرائیل کو باضابطہ طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے) سوال یہ ہے کہ اسرائیل کو تسلیم کرنے کا واقعہ تو ہو چکا۔ پھر موصوف اور ان کے ساتھی جان پر کھیلنے کے لئے مزید کس وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔

۲۴ستمبر۱۹۹۳

مکی دور کے واقعات میں سے ایک یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوق عکاظ میں بنو کعب بن ربیعہ کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ تم مجھ کو اپنی پشت پناہی (منعۃ) میں لے لو تاکہ میں اپنے رب کا پیغام پہنچا سکوں۔ اس کے بعد آپ نے ان سے کہا: ولم اکرہ احداً منکم علی شئی (حیاۃ الصحابہ ۱/۹۵)

اس جملہ میں غیر ذالک محذوف ہے۔ پورا جملہ اس طرح ہوگا کہ حتی ابلغ رسالۃ ربی ولم اکرہ احداً منکم علی شئی غیر ذالک (تاکہ میں اپنے رب کا پیغام پہنچا سکوں اور میں تم میں سے کسی کو اس کے علاوہ مزید کسی چیز پر مجبور نہ کروں گا۔

اس جملہ میں رسالت رب سے سارا دین مراد نہیں لیا جا سکتا۔ اس میں لازماً دین کا وہی حصہ مراد ہے جو مکہ میں اترا تھا۔ مکی دور کو عام طور پر مظلومیت کے دور کے مفہوم میں لیا جاتا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ مکی دور سے مراد دراصل دعوت کا دور ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعوت کے دور میں مخاطب سے بس اتنی ہی بات کہی جائے گی جو مکہ میں اتری۔ یعنی توحید، عبادت، اخلاق اس کے سوا کسی اور چیز کے لئے نہ مطالبہ کیا جائے گا اور نہ احتجاج۔ کسی اور سوال پر ہتھیار اٹھانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔

۲۵ستمبر۱۹۹۳

جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ آدمی جب سوتا ہے تو اس کے کانشس مائنڈ کا رشتہ اَن کانشس مائنڈ سے ٹوٹنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ گہری نیند میں پہنچتا ہے تو دونوں کا رشتہ مکمل طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ اب صرف اس کا اَن کانشس مائنڈ کام کرتا ہے۔ اس کا ان کانشس مائنڈ عملاً پوری طرح معطل ہو چکا ہوتا ہے۔ چنانچہ آدمی گہری نیند کی حالت میں جو خواب دیکھتا ہے اس پر اس کے شعوری ذہن کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

قرآن میں ہے کہ نیند کے وقت اللہ آدمی کی روح کو قبض کر لیتا ہے (الزمر ۴۲) ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد انسانی دماغ کی یہی حالت ہو۔ یہ بات پہلے بھی عام تجربہ کے تحت معلوم تھی کہ سونے کے وقت آدمی بے خبر ہو جاتا ہے۔ مگر اب یہ چیز باقاعدہ سائنسی تحقیق کے ذریعہ ثابت شدہ

بن گئی ہے۔

۲۶ ستمبر ۱۹۹۳

ایک مسلمان بزرگ نے کہا کہ آجکل آپ ہندوؤں میں بہت جا رہے ہیں۔ آپ نے ہندوؤں تک کیا دعوت پہنچائی اور کتنے ہندوؤں کو دین حق کے سایہ میں داخل کیا۔ میں نے کہا کہ آپ لوگوں نے معاملہ کو اتنا زیادہ بگاڑ دیا ہے اور اتنی نفرت اور دوری پیدا کر دی ہے کہ ابھی براہ راست دعوت کا کوئی سوال نہیں۔ ابھی تو صرف لوگوں کو مانوس کرنا ہے۔ آپ حقیقی طور پر لوگوں کے خیر خواہ ہوں تو موجودہ قسم کے حالات میں آپ اعلان دعوت سے اپنے عمل کا آغاز نہیں کریں گے بلکہ لوگوں کو مانوس بنانے سے اپنی جدوجہد شروع کریں گے۔

آپ کا بیٹا آپ سے ناراض ہو جائے تو آپ اس کی اصلاح کے لئے کہاں سے آغاز فرمائیں گے۔ ناراض بیٹے کو اپنی طرف واپس لانے کے لئے آپ جہاں سے اپنے عمل کا آغاز کرنے والے ہوں بس وہیں سے مدعو کے اوپر عمل کا بھی آغاز کرنا پڑتا ہے۔

۲۷ ستمبر ۱۹۹۳

کسی شخص نے ایک سائنس داں سے کہا کہ آپ لوگوں کی ہر دریافت اتفاقی دریافت (Chance discovery) ہے۔ سائنسداں نے جواب دیا کہ تمہارا کہنا صحیح ہے۔ مگر یہ اتفاقی صرف کسی سائنسداں ہی کو پیش آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی اتفاقی دریافت کے لئے آدمی کو پہلے سے تیار ذہن (Prepared mind) ہونا چاہئے۔ ورنہ اتفاقات اس کے سامنے ظاہر ہوں گے اور وہ اس سے کچھ دریافت نہ کر سکے گا۔

یہی معاملہ مذہب کا بھی ہے۔ قرآن میں ہے کہ یہ کتاب ہدایت ہے متقیوں کے لئے (ھدی للمتقین) متقی سے مراد یہاں سنجیدہ ذہن والا انسان ہے۔ سنجیدہ انسان گویا وہ تیار ذہن ہے کہ جب قرآن کی بات اس کے سامنے آئے تو وہ اس کو اخذ کر سکے۔

۲۸ ستمبر ۱۹۹۳

ہندستان میں جو علماء تعلیم دین یا مسجد کی امامت پر اجرت لیتے ہیں ان کو حقیر سمجھا جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ' اکابر علماء ' کو محترم سمجھا جاتا ہے کیوں کہ وہ مدرس یا امام بن کر

اس کی اجرت نہیں لے رہے ہیں۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو اس معاملہ میں اکابر علماء کے مقابلہ میں اصاغر علماء زیادہ بہتر ہیں۔ کیوں کہ اکابر علما حکومتوں کے انعام واکرام پر جی رہے ہیں۔ ان اکابر علماء پر امام احمد کا یہ قول صادق آتا ہے کہ دینی تعلیم پر اجرت لینا بہتر ہے سلطان کے انعامات لینے سے (اخذ الاجرة علی التعلیم خیر من جوائز السلطان) ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی ۳۰/ ۱۹۲

۲۹ ستمبر ۱۹۹۳

صحابہ وتابعین کے زمانہ میں یہ حال تھا کہ وہ مسجد اور زمینی پیداوار کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ کہا جانے لگا تھا کہ مسلمان جب کسی ملک کو فتح کرتے ہیں تو وہ بیک وقت دو چیزوں کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ مسجد کی تعمیر اور قابل کاشت زمین کا اہتمام (یہتم المسلمون عند فتح ای بلد بشیئین فی وقت معا هما بناء المسجد وتنظیم الحقل) انور الرفاعی، الاسلام فی حضارتہ ونظمہ، ۲۸۳

اس بیان میں اصل چیز تعمیر مسجد اور انتظام زراعت ہے۔ اس میں "فتح" کا ذکر محض اضافی ہے۔ قدیم زمانہ میں فتنہ (religious persecution) کا زور تھا۔ اس لئے پر امن منصوبہ پر عمل کرنے کے مواقع نہیں ملتے تھے۔ موجودہ زمانہ کامل آزادی کا زمانہ ہے۔ اب اس قسم کی رکاوٹ ختم ہو چکی ہے۔ اس لئے اب مسلمانوں کو یہ کرنا ہے کہ وہ جہاں بھی موقع پائیں، مسجد اور تنظیم معیشت میں اپنے آپ کو مشغول کر دیں۔ اب انھیں کسی سے جنگ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

۳۰ ستمبر ۱۹۹۳

ریاض میں ایک بڑا ادارہ ہے جس کا نام ہے : الامانة العامة لهيئة كبار العلماء۔ اس کی طرف سے ایک جرنل مجلة البحوث الاسلامية کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کے شمارہ نمبر ۳۶ (۱۴۱۳ھ) اس میں ایک مضمون تعدد الزوجات فی الاسلام کے عنوان سے ہے۔ اس میں مبررات تعدد الزوجات في الاسلام کے ذیلی عنوان کے تحت مبرر اول یہ بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی۔ آپ کی وفات ہوئی تو آپ

کے یہاں ۹ بیویاں تھیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ آپ ہر چیز میں نمونہ ہیں۔ (الاقتداء برسول الله صلی الله علیه وسلم الذی توفی وفی عصمته تسع زوجات، ورسول الله صلی الله علیه وسلم بلا شك اسوة وقدوة للمسلمین فی كل شئ) ۲۴۸

موجودہ زمانہ میں اس قسم کے مبررات پیش کرنا ظاہر کرتا ہے کہ یہ حضرات اپنے زمانہ کے احوال سے اور جدید ذہن سے بالکل ناواقف ہیں۔

یکم اکتوبر ۱۹۹۳

قرآن میں سوءظن سے منع کیا گیا ہے (الحجرات ۱۲) مومن کو چاہئے کہ اپنے بھائی مومن کے کلام کو بہترین معنی میں محمول کرے۔ اسلاف میں سے کسی نے کہا کہ تمہارے بھائی کے منھ سے کوئی کلمہ نکلے تو اس کو برے معنی میں نہ لو جب کہ اس کا ایک بہتر مفہوم موجود ہو (لا تظن بكلمة خرجت من اخيك سوءًا وانت تجد لها فی الخير محملا)

۲ اکتوبر ۱۹۹۳

مکہ کے عربی اخبار العالم الاسلامی (۲۷ ستمبر — ۳ اکتوبر ۱۹۹۳) میں بوسنیا (یوگوسلاویہ) کے مسلمانوں کے بارہ میں ایک مضمون ہے۔ اس کا عنوان ہے —— یوگوسلاویہ کے چھ ملین مسلمانوں کو خاتمہ کا سامنا: ٦ ملايين مسلم يوغوسلافی يواجهون الابادة

بوسنیا کے مسلمانوں کے بارہ میں اس قسم کے مضامین مسلسل مسلم اخباروں اور جرائد میں نکل رہے ہیں۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ ۱۹۹۱ میں جب وہاں کے مسلم لیڈروں نے "آزاد بوسنیا" کا اعلان کیا، اس سے پہلے اس علاقہ کے مسلمانوں کا حال کیا تھا۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ اس سے پہلے یہاں کے مسلمان اچھی حالت میں تھے۔ ان کو مذہبی آزادی حاصل تھی۔ ایسی حالت میں سوال یہ ہے کہ انھوں نے کیوں ایسا سیاسی اقدام کیا جو ان کو زیادہ بری حالت کی طرف لے جانے والا ہو۔ عملی اقدام ہمیشہ موجودہ حالت سے بہتر حالت کی طرف پہنچنے کے لئے ہوتا ہے نہ کہ موجودہ حالت کو کھو کر زیادہ بری حالت کی طرف جانے کے لئے۔

۳ اکتوبر ۱۹۹۳

پچھلے ہفتہ میں انگلینڈ میں تھا۔ وہاں ایک مسلمان کے ساتھ روزانہ صبح کو قریب کی مسجد

میں فجر کی نماز کے لئے جاتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ راستہ میں جب بھی کوئی انگریز مرد یا انگریز عورت ملتی ہے تو وہ اس کو گڈ مارننگ کہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ انگریزوں کا طریقہ ہے۔ وہ جب راستہ چلتے ہوئے کسی سے ملتے ہیں، خاص طور پر صبح کو تو اس کو اسی طرح سلام کرتے ہیں۔ مذکورہ مسلمان ان کی اسی روایت پر عمل کر رہے تھے۔

میں اس کو ایک اچھی چیز سمجھتا ہوں۔ اسی طرح مسلمانوں کو دوسری قوموں کی روایات میں ان سے شیر کرنا چاہئے۔ مگر ہندستانی مسلمانوں کا مزاج اس کے برعکس ہے۔ اور ہندستان میں ان کے تمام مسائل کی جڑ ان کا یہی مزاج ہے۔

۴ اکتوبر ۱۹۹۳

بنگلور کے ڈاکٹر احمد سلطان ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی بیوی میسور گئیں۔ وہاں سے گھر کے کام کے لئے دو ہندو لڑکے لے آئیں۔ راجیش (۸ سال) شنکر (۱۴ سال) ان لڑکوں کا باپ غریب تھا اس لئے پڑھائی چھڑا کر انھیں کام کے لئے بھیج دیا۔ ڈاکٹر احمد سلطان نے اپنی بیوی سے کہا کہ ان بچوں کی پڑھائی بند ہونا ٹھیک نہیں ہے۔ انھیں دوبارہ اسکول میں داخل کر دو۔ فاضل وقت میں وہ ہمارے گھر کا کام بھی کریں گے۔ اب راجیش پانچویں کلاس اور شنکر گیارھویں کلاس میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

ان بچوں سے کسی نے پوچھا کہ تمہارے باپ کا نام کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ احمد سلطان۔ پوچھنے والے کو تعجب ہوا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے میسور کے باپ نے ہماری پڑھائی چھڑا دی تھی اور احمد سلطان ہم کو پڑھوا رہے ہیں اور ہمارا سارا خرچہ دے رہے ہیں اس لئے اب تو وہی ہمارے باپ ہوئے۔

۵ اکتوبر ۱۹۹۳

آج بیدر کے چار آدمی ملاقات کے لئے آئے۔ ایک صاحب نے کہا کہ آپ کی شانتی یاترا کو ہم نے ٹی وی پر دیکھا۔ اس میں ہم کو دکھائی دیا کہ ہندو لوگ آکر اپنے گروؤں کے پاؤں چھو رہے ہیں، اسی کے ساتھ انھوں نے آپ کا بھی پاؤں چھوا۔ مگر آپ چپ رہے۔ حالاں کہ پاؤں چھونا تو غلط ہے۔

میں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ آپ کو ہندوؤں سے محبت نہیں۔ آپ کو اپنے بیٹے سے محبت

ہے اس لئے آپ بیٹے کی ہر بات کو برداشت کرتے ہیں۔ مگر ہندو سے محبت نہیں، اس لئے ہندو کی ہر بات پر اس سے لڑنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

۶ اکتوبر ۱۹۹۳

آج متھرا پرشاد سنہا (لکھنؤ) ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کو جب مہاتما گاندھی کا قتل ہوا اور اس کی خبر اخباروں میں چھپی تو برٹرینڈ رسل نے کہا کہ بہت زیادہ اچھا ہونا بھی بہت برا ہے:

It is too bad to be too good.

اس کی وجہ یہ ہے کہ جو آدمی زیادہ اچھا ہو وہ منافق نہیں ہوتا۔ وہ بے لاگ سچائی کو بیان کرتا ہے۔ وہ بے لاگ سچائی ہمیشہ کسی کے موافق اور کسی کے خلاف ہوتی ہے۔ اب اس کی بات جس کو اپنے موافق نظر آتی ہے وہ اس سے خوش ہو جاتے ہیں اور جن لوگوں کو اس کی بات اپنے خلاف نظر آتی ہے وہ اس کے دشمن بن جاتے ہیں۔

۷ اکتوبر ۱۹۹۳

عربی زبان کا ایک پرانا مقولہ ہے: اول العزم المشورة (فیصلہ کا پہلا زینہ مشورہ ہے) آدمی جب ایک پرعزم فیصلہ کرنے جا رہا ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اس کے بارہ میں باخبر لوگوں سے مشورہ کرے۔ اول مشورہ پھر اقدام۔

۸ اکتوبر ۱۹۹۳

ایک ندوی عالم کا مضمون نئی دہلی کے اردو ہفت روزہ ملی اتحاد (۱-۸ اکتوبر ۹۳) میں چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے ــــــ امت مسلمہ: ملکی اور بین اقوامی سازشوں کے گھیرے میں۔

آجکل تمام مسلمان اسی طرح کی بولی بول رہے ہیں۔ مگر یہ باتیں لغویت کی حد تک بے معنی ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ امت مسلمہ خدائی مچھلی کے پیٹ میں ہے نہ کہ انسانی سازشوں کے گھیرے میں۔ اس پیٹ سے وہ صرف اس وقت نکل سکے گی جب وہ اس خدائی ذمہ داری کو لے کر اٹھے جس کو اس کے عوام اور خواص دونوں نے بھلا دیا ہے۔ یہ ہے دعوت الی اللہ کی ذمہ داری یعنی خدا کے دین کو خدا کے بندوں تک پہنچانا۔

۹ اکتوبر ۱۹۹۳

ابو اسحاق السبیعی کا قول ہے کہ صحابہ و تابعین صاحب مال ہونے کو دین میں ایک مدد سمجھتے تھے (قال ابو اسحاق السبیعی: کانوا یرون السعة عونا علی الدین)

مالی وسعت بذات خود نہ اچھی ہے اور نہ بری۔ استعمال کے اعتبار سے وہ اچھی یا بری بنتی ہے۔ مال پاکر اگر آدمی کے اندر احساس برتری پیدا ہو تو مال برا ہے۔ اور اگر مال کو وہ اپنے لئے دینی مددگار کے طور پر استعمال کرے تو مال بلاشبہ ایک مفید اور مطلوب چیز ہے۔

۱۰ اکتوبر ۱۹۹۳

مولانا مظفر حسین کشمیری ندوی سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ کشمیر کی موجودہ تحریک کو میں ایک قومی تحریک سمجھتا ہوں نہ کہ اسلامی تحریک۔ اسلامی تحریک دعوت کی بنیاد پر اٹھتی ہے کشمیریوں نے اپنی تحریک دعوت کی بنیاد پر نہیں اٹھائی اس لئے وہ اسلامی تحریک بھی نہیں۔

پھر میں نے کہا کہ اگر آپ دعوت کے اصول کو نہ مانیں تب بھی آپ کی تحریک سنت نبوی کے خلاف ہے۔ بخاری میں حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ: ماخیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین الا اختار ایسرھما۔ اس سنت کی روشنی میں دیکھئے تو کشمیریوں کے لئے دو میں سے ایک چوائس تھا۔ ایک یہ کہ وہ عدم تشدد کی بنیاد پر اپنی تحریک چلائے، جیسا کہ مہاتما گاندھی نے چلایا۔ اور جیسا کہ حال میں ساؤتھ افریقہ والوں نے چلایا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ آپ اپنی تحریک کو تشدد کی بنیاد پر چلائیں۔ آپ لوگوں نے عدم تشدد کو چھوڑ کر تشدد کا طریقہ اختیار کیا۔ یہ حدیث کے الفاظ میں، اختیار اعسر تھا۔ وہ ایسر کو چھوڑ کر اعسر کو لینا تھا۔ جو سنت رسول کے خلاف ہے۔ اور جو لوگ سنت رسول کو چھوڑیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

۱۱ اکتوبر ۱۹۹۳

میں ۱۹۷۱ میں لاہور گیا تھا۔ ایک روز رات کو میں اور میرے میزبان ڈاکٹر اسرار احمد صاحب لاہور (کرشن نگر) میں ان کے مکان کی چھت پر تھے۔ چودھویں کا چاند آسمان میں دکھائی دے رہا تھا۔ ہم دونوں کچھ دیر تک چاند کے حسن کو دیکھتے رہے۔ اس کے بعد اچانک ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

نے کہا: یہی چاند تو انڈیا میں بھی چمکتا ہوگا:

آج ہندستان ٹائمس (۱۱ اکتوبر) میں اسی قسم کا ایک اور واقعہ پڑھا۔ مسٹر پریم بھاٹیہ نے لکھا ہے کہ پچھلی شام کو وہ اپنے گھر کے ٹی وی سیٹ پر ایک کے بعد ایک اس کے آٹھ بٹن دبا رہے تھے کہ دیکھیں کیا کوئی اچھا پروگرام آرہا ہے۔ اچانک اسکرین پر پاکستان کی خاتون سنگر ملیکہ پکھراج اور ان کی لڑکی طاہرہ دکھائی دیں۔ ملیکہ پکھراج مسٹر بھاٹیہ کی بہت پسندیدہ مغنیہ ہیں۔ وہ اس اتفاقی دریافت (Chance discovery) پر بہت خوش ہوئے۔ وہ اور ان کی بیوی دونوں ایک گھنٹہ تک گم ہو کر اس کو سنتے رہے۔

For a whole rapturous hour and more we sat spell-bound listening to mother and daughter.

آخر میں انھوں نے لکھا ہے کہ ہم کو خدا کا شکر کرنا چاہئے کہ اس نے سٹیلائٹ کے ذریعہ ہم کو ٹیلیویژن پروگرام دیکھنے کا موقع دیا:

Lord be praised for giving us television programmes through satellite.

کیسی عجیب بات ہے کہ دو پڑوسیوں میں چاند اور سٹیلائٹ کے ذریعہ تو ربط قائم ہو، مگر ان کے درمیان براہ راست انسانی ربط قائم نہ ہو سکے۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۹۳

کشمیر میں اس وقت جو پرتشدد تحریک چل رہی ہے، اس کو کشمیر کے لوگ جہاد کہتے ہیں۔ دو کشمیریوں سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ جہاد سے پہلے دعوت ضروری ہے۔ کیا آپ نے ہندؤوں کو دعوت پہنچائی ہے جو ان کے خلاف آپ جہاد بالسیف کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ فقہ کی کتاب ہدایہ میں لکھا ہے کہ اذان دعوت ہے۔ جس مقام پر مسجدوں سے اذان کی آوازیں بلند ہو کر ہندوؤں کے کان میں پہنچ رہی ہوں وہاں دعوت بھی پہنچ گئی۔ کشمیر میں بہت مسجدیں ہیں۔ ہر مسجد سے لاؤڈ اسپیکر پر اذان دی جارہی ہے۔ اس طرح ان پر دعوت پہنچ گئی ہے۔ اس لئے ہم جہاد کر رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ کسی قوم پر دعوت کا درجۂ اتمام حجت تک پہنچ جانا بہت سنگین بات ہے۔ اس

کے بعد وہ قوم جہنم کی مستحق ہو جاتی ہے۔ اتنی اہم بات کو فقہی مسائل کی کتاب سے نہیں نکالا جاسکتا۔ اس کے لئے قرآن و حدیث کی صریح نص درکار ہے۔ پھر میں نے کہا کہ قرآن میں دعوت پہنچ جانے کا معیار یہ بتایا گیا ہے کہ مدعو کہہ اٹھے کہ تم نے ہمارے اوپر پیغام رسانی کر دی (ولیقولوا درست) دعوت پہنچ گئی، اس کا معیار داعی کا دعویٰ نہیں ہے بلکہ مدعو کا اعتراف ہے۔

۱۳ اکتوبر ۱۹۹۳

منگلور کے ڈاکٹر حبیب رحمان (Tel. 21338, 26185) ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے ہند وظلم و تعصب کی شکایت کی۔ میں نے کہا کہ میں مانتا ہوں کہ تعصب اور زیادتی ہے مگر پاکستانی مسلمانوں کو بھی آپس میں ایک دوسرے سے اسی قسم کے تعصب اور زیادتی کی شکایت ہے۔ پھر آپ لوگ اس کو ہندو کے ساتھ کیوں جوڑتے ہیں۔ اس کو انسانی تعصب اور انسانی زیادتی کہئے۔

پھر میں نے کہا کہ یہ دراصل چیلنج ہے اور یہ چیلنج ہمیشہ باقی رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کا نظام اس طرح بنایا ہے کہ یہاں ایک دوسرے کے لئے چیلنج بنے۔ چیلنج خود نظام فطرت کا حصہ ہے پھر آپ اس کو کس طرح ختم کریں گے۔ سمندر کے کنارے رہتے ہیں وہاں بار بار سائیکلون آتے ہیں۔ اس سے کئی نقصانات ہوتے ہیں۔ پھر کیا آپ سائیکلون کے خلاف پروٹسٹ کرتے ہیں۔ سائیکلون کو ختم کرنے کے لئے آپ کو نیا سمندر بنانا پڑے گا۔ نیا سورج اور نئی فضا بنانی پڑے گی۔ زمین کے پورے نظام کو بدلنا ہوگا۔ کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح انسانی زندگی میں بھی چیلنج کے سائیکلون آئیں گے۔ ان کے خلاف احتجاج نہیں کرنا ہے۔ بلکہ ان کے خلاف تدبیر کرنا ہے۔

پھر میں نے کہا کہ جب بھی کوئی ناموافق صورتحال سامنے آئے تو اس کے مقابلے میں آپ کے ریپانس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک جذباتی جواب (emotional response) اور دوسرا سوچا سمجھا جواب (considered response) پہلا جواب قرآن کے الفاظ میں عاجلانہ جواب ہے اور دوسرا صابرانہ جواب۔ آپ کے مستقبل کا انحصار اسی جواب پر ہے۔ اگر آپ نے عاجلانہ جواب دیا تو آپ کے لئے تباہی ہے، اور اگر آپ نے صابرانہ جواب دیا تو آپ کے لئے کامیابی۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۹۳

ہندستان ٹائمس (۳ اکتوبر ۱۹۹۳) میں مسٹر بی آر نندا کا ایک مضمون مہاتما گاندھی کے بارہ میں چھپا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ گاندھی جی کا خیال تھا کہ انڈیا میں اختلافات کے لئے انگریز کو ذمہ دار ٹھہرانا احمقانہ اور بے فائدہ ہے:

> It was foolish and futile to blamę the British for tormenting dissensions.

مہاتما گاندھی نے لکھا تھا کہ انگریزوں نے انڈیا پر قبضہ نہیں کیا، ہم نے انڈیا کو انھیں دیدیا:

> The English have not taken India, we have given it to them.

یہ نظریہ قرآن کے مطابق ہے۔ قرآن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ کسی شخص یا قوم پر جو کچھ بیتتا ہے وہ اس کے اپنے کئے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ ۱۸۵۷ سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کا کوئی بھی قابل ذکر مسلمان میرے علم میں نہیں جس نے اس بات کو اتنے واضح انداز میں بیان کیا ہو۔

۱۹۴۷ کے بعد ہندستانی مسلمانوں پر جو کچھ بیت رہا ہے، اس کو دوبارہ ہمارے علماء اور دانشور ہندوؤں کی سازش اور زیادتی کے خانہ میں ڈال رہے ہیں۔ مسلم علماء اور دانشور ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں بھی قرآن کے مطابق نہ سوچ سکے۔ اور ۱۹۴۷ کے بعد کے دور میں بھی وہ قرآنی طرز فکر سے محروم ہیں۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۹۳

ایک ندوی عالم نے ایک بار مولانا ابوالحسن علی ندوی سے میرے ایک مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے لکھا ہے کہ طارق نے اسپین میں کشتیاں نہیں جلائی تھیں۔ کشتی جلانے کی بات محض افسانہ ہے نہ کہ کوئی تاریخی واقعہ۔ مذکورہ ندوی عالم کے بیان کے مطابق، مولانا ابوالحسن علی ندوی نے فرمایا: لا یعتبر بہ (وہ قابل لحاظ نہیں)

میں نے کہا کہ میں نے یہ بات الرسالہ مارچ ۱۹۷۷ میں لکھی تھی۔ اس کے دس سال بعد ۱۹۸۷ میں قاہرہ سے ایک عربی کتاب چھپی ہے۔ اس کے مصنف دکتور عبدالحلیم عویس ہیں

اور مولانا ابوالحسن علی ندوی سے ان کے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ اس کتاب کا نام ہے:

قضية احراق طارق بن زياد للسفن ، بين الاسطورة و التاريخ

دکتور عبدالحلیم عویس ریاض کی جامعۃ الامام میں تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ میں نے ندوی عالم سے کہا کہ اب آپ کی ملاقات جب مولانا ابوالحسن علی ندوی سے ہو تو آپ میرا نام نہ لیں۔ صرف مذکورہ عرب پروفیسر کی کتاب کا ذکر کرتے ہوئے پوچھیں کہ اس بارہ میں مولانا کی رائے کیا ہے۔ ندوی عالم مسکرا کر رہ گئے۔ وہ اس کے لئے تیار نہ ہوئے کہ دوبارہ مولانا ابوالحسن علی ندوی سے اس قسم کا سوال کریں۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۹۳

آج رات کو ساڑھے گیارہ بجے قبل از وقت نیند کھل گئی۔ دانت میں شدید درد تھا۔ اس قسم کا درد مجھے پہلی مرتبہ ہوا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ دوسرے کمرہ میں گیا تو میری بیوی اور میری لڑکی بھی سو رہی تھیں۔ ان کو جگانا مجھے مناسب معلوم نہیں ہوا۔ ثانی اثنین سے کہنا بھی بے فائدہ تھا کیوں کہ آدھی رات کو کسی ڈاکٹر سے بھی مشورہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس بے بسی کے عالم میں صرف ایک ہی چیز میرے پاس تھی اور وہ دعا تھی۔ میں نے مسلسل دعا کرنا شروع کیا۔ خاص طور پر یہ آیت بار بار پڑھنے لگا: امن يجيب المضطر اذا دعاه ويكشف السوء۔ کچھ دیر کے بعد محسوس ہوا کہ درد کم ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے درد ختم ہو گیا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور بستر پر سو گیا۔ اس کے بعد نیند آ گئی یہاں تک کہ صبح کو فجر کے وقت نیند کھلی۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳

دوارکا پیٹھ کے شنکر اچاریہ آجکل دہلی میں ہیں۔ پروفیسر ویریندر ملک (Tel 2469 3394) آج مجھ کو ان سے ملاقات کے لئے لے گئے۔ دہلی کے ایک دولت مند ہندو کے گھر پر وہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ بہت بڑا گھر تھا پورا گھر سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا۔ بے شمار لوگ آتے جاتے نظر آئے۔ یہ سب بظاہر خوش حال لوگ تھے جو ماتھا ٹیکنے کے لئے آئے تھے۔ سڑک پر دور تک کاروں کی قطاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ بہت بڑی تعداد میں مسلح پولیس چاروں طرف پہرہ دے رہی تھی۔

اندر داخل ہوئے تو شنکراچاریہ ایک اونچے تخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اپنا ایک پاؤں وہ باہر نکالے ہوئے تھے جس کے آگے جھک کر لوگ عقیدت کا اظہار کر رہے تھے۔

پروفیسر عنوان چشتی کا تبصرہ مجھے یاد آیا۔ انھوں نے چند روز پہلے کہا تھا کہ انڈیا میں آج کل تین کنگڈم متوازی طور پر قائم ہیں۔ پولٹیکل کنگڈم، مارفیا کنگڈم اور اسپریچول کنگڈم۔ ان میں بھی سب سے زیادہ بڑی اسپریچول کنگڈم ہے۔ یہ کنگڈم جس طرح ہندوؤں میں رائج ہے ٹھیک اسی طرح وہ مسلمانوں میں بھی بڑے پیمانہ پر رائج ہے۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۹۳

گوڑگاؤں میں ایک ماڈرن مسلم فیملی رہتی ہے۔ یہ لوگ انگریزی تعلیم یافتہ ہیں اور انگریزی زبان میں لکھتے اور بولتے ہیں۔ ان کے لڑکے کی شادی ایک سابق گورنر کی لڑکی سے ہوئی۔ یہ لڑکی اگرچہ تعلیم یافتہ ہے مگر اس کی تعلیم زیادہ تر اردو میں ہوئی۔ چنانچہ وہ اردو زبان بولتی ہے۔ لڑکے کی ماں کو یہ بات سخت ناپسند ہے۔ وہ اکثر کہتی رہتی ہیں کہ بہو کو انگلش بولنا چاہئے۔ ایک روز غصہ ہو کر انھوں نے اپنی بہو کے بارہ میں کہا کہ آخر کب وہ انگریزی طریقہ اختیار کرے گی:

When she will become anglicised?

یہ قصہ مجھے معلوم ہوا تو میں نے سوچا کہ اس کے برعکس اگر ایسا ہو تو ایک مسلم خاندان میں ایک لڑکی بہو بن کر آئے جو انگلش اسکول کی تعلیم یافتہ ہو اور انگریزی زبان بولتی ہو۔ اب ایسا نہیں ہوگا کہ اس کی ساس اس کو ہندی بولنے کے لئے کہے اور جب اس کو ہندی بولنا نہ آئے تو وہ غصہ ہو کر اپنی بہو کے بارہ میں یہ ریمارک دے کہ کب وہ ہندی طریقے اختیار کرے گی:

When she will become Hinduised?

خالص شرعی اعتبار سے انگریزی اور ہندی میں کوئی فرق نہیں۔ اس کے باوجود کیوں ایسا ہے کہ مسلمان انگریزی بولنے کو فخر سمجھتے ہیں اور ہندی بولنے کو اپنے لئے کمتر خیال کرتے ہیں۔ غور کرتے ہوئے سمجھ میں آیا کہ اس فرق کی وجہ تاریخی ہے نہ کہ شرعی۔ انگریز انڈیا

میں ترقی یافتہ تمدن لے کر آئے۔ اس لئے مسلمانوں نے ان کو اپنے سے اونچا سمجھا اور مسلمان جب اس سے پہلے انڈیا میں آئے تو ہندو تہذیب بظاہر انھیں اپنے سے کم نظر آئی اس لئے انھوں نے ہندوؤں کو نیچا سمجھ لیا۔ یہ فرق میرے نزدیک سراسر غیر اسلامی نفسیات کا نتیجہ ہے، اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۹۳

چارلس سوینڈل (Charlese Swindol) نے کہا ہے کہ زندگی ۱۰ فیصد وہ ہے جو مجھ پر گزرتی ہے اور ۹۰ فیصد یہ ہے کہ میرا ردعمل اس کے بارے میں کیا ہوتا ہے:

Life is 10 percent what happens to me and 90 percent how I react to it.

اس قول کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جب یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ مشکل حالات میں گھر گیا ہے تو اس میں خارجی حالات کا حصہ صرف دس فیصد ہوتا ہے۔ بقیہ ۹۰ فیصد حصہ وہ ہے جو آدمی اپنے جوابی احساس سے اس میں اضافہ کرتا ہے۔

حالات کے واقع ہونے پر آدمی اگر نارمل رہے تو حالات کا اثر صرف دس فیصد کی حد میں رہے گا اور اس سے آگے بڑھنے نہیں پائے گا۔ اس دنیا میں ناموافق حالات ہمیشہ پیش آتے ہیں۔ آدمی کا منفی ردعمل اس کو بڑھاتا ہے اور مثبت ردعمل اس کو اس کے فطری حد میں رکھ کر اس کو غیر مؤثر بنا دیتا ہے۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۹۳

علی نورالدین السمہودی (وفات ۹۱۱ھ، ۱۵۰۶ء) ایک شافعی عالم ہیں۔ وہ سمہود (مصر) میں پیدا ہوئے۔ سفر کرکے وہ مدینہ پہنچے اور وہیں مقیم ہو گئے۔ مدینہ میں ہی ان کی وفات ہوئی۔ انھوں نے مدینہ کی تاریخ پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے: وفاء الوفا باخبار دار المصطفیٰ۔

ایک ہندستانی عالم جن کی عمر اب ۶۸ سال ہو چکی ہے۔ پچھلے ۳۰ سال سے وہ سعودی عرب میں رہتے ہیں۔ اب وہ وہاں کے شہری بن چکے ہیں۔ ان سے ۱۸ اکتوبر کو دہلی میں میرے دفتر میں ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ مدینہ کی تاریخ پر ایک تحقیقی کتاب لکھ رہے ہیں۔ اس

سلسلہ میں انھوں نے موضوع سے متعلق کافی کتابیں پڑھی ہیں۔ وہ کم از کم سو بار مدینہ جا چکے ہیں۔ مدینہ میں ان کا ایک اپنا مکان بھی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ علامہ سمہودی کی مذکورہ کتاب کو انھوں نے بالاستیعاب پڑھا ہے۔

انھوں نے کہا کہ اس کتاب میں رسول اور اصحاب رسول کے زمانہ کی مسجدوں کا ذکر ہے میں نے اپنے موضوع کی بنا پر مدینہ کی ان مسجدوں کی تحقیق کرنا چاہا۔ مگر جب میں نے مدینہ میں گھوم کر دیکھا تو میں نے پایا کہ السمہودی کی کتاب میں جن مقامات کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ یہاں فلاں نام کی مسجد تھی، ان مقامات و اماکن پر آج سرے سے کوئی مسجد موجود ہی نہیں۔ حتی کہ کتنی مسجدیں جن کے بارہ میں لکھا ہے کہ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی وہاں بھی آج مسجدوں کا وجود نہیں۔ مذکورہ سعودی عالم نے فرمایا "جن مساجد کا اس کتاب میں ذکر ہے، میں نے اندازہ کیا کہ ان میں سے پچاس فیصد مساجد اب موجود نہیں ہیں"۔

مذکورہ عالم نے یہ بات ۱۸ اکتوبر ۱۹۹۳ کی دوپہر کو میرے دہلی کے دفتر میں بیٹھ کر کہی۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ کے نام کے ساتھ میں اس بات کا ذکر کر سکتا ہوں۔ انھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔

۲۱ اکتوبر ۱۹۹۳

پرانا مقولہ ہے کہ علم طاقت ہے۔ اس کو انگریزی زبان میں اس طرح کہا گیا ہے:

Knowledge is power.

ایک شخص جس کے پاس معروف قسم کا علم نہ ہو، وہ سوچ سکتا ہے کہ میرے پاس علم نہیں اس لئے میرے پاس طاقت بھی نہیں۔ مگر یہ سوچ درست نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ علم طاقت ہے۔ مگر یہاں اس سے بھی بڑی ایک طاقت ہے۔ اور وہ طاقت کیرکٹر ہے۔ اس لئے دوسرا مقولہ یہ ہونا چاہئے کہ کردار طاقت ہے:

Character is power.

کیرکٹر وہ چیز ہے جس کے لئے رسمی علم ضروری نہیں۔ ہر آدمی اپنے اندر کردار کی صفت پیدا کر سکتا ہے۔ ہر آدمی اس سپر پاور کا مالک بن سکتا ہے۔

۲۲ اکتوبر ۱۹۹۳

جنگ بلقان (۱۳-۱۹۱۲) میں ترکوں کی عثمانی سلطنت یورپ سے تقریباً ختم ہوگئی (13/789) اسی زمانہ میں شبلی نعمانی نے کہا تھا:

یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے   اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

مولانا محمد علی پر اس حادثہ کا اتنا زیادہ اثر ہوا کہ انھوں نے لکھا ہے کہ بلقان کی تباہ کن جنگ کے دوران ایک بار میرے احساسات اتنے شدید ہوگئے کہ میں نے سوچا کہ میں خودکشی کرلوں:

My feelings during the disastrous war in the Balkans were at one time so overpowering that I must confess that I even contemplated suicide.

ذاتی طور پر میں مولانا محمد علی کی مسلم سیاست کو اتنا ہی بے معنی سمجھتا ہوں جتنا موجودہ زمانہ کے نام نہاد مسلم لیڈروں کی سیاست کو۔ تاہم دونوں میں ایک فرق ہے۔ مولانا محمد علی اپنی ساری نادانی کے باوجود اپنی جگہ پر مخلص اور دیانت دار تھے۔ جبکہ موجودہ زمانہ کے لیڈر بظاہر بالکل استقلالی نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں دوبارہ بلقان کی شکست جیسے واقعات ہو رہے ہیں مگر آج کے کسی مسلم لیڈر کے بارہ میں نہیں سنا گیا کہ وہ یہ سوچے کہ اسے خودکشی کرلینا چاہئے۔ آج کے مسلم لیڈر ہر قسم کے ملی حادثات کے باوجود 'رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ' کا مصداق بنے ہوئے ہیں۔

۲۳ اکتوبر ۱۹۹۳

۱۹۴۰ میں انڈیا میں ثالثی کا قانون پاس ہوا تھا جو ابھی تک قائم ہے۔ اس قانون کے تحت ملکی عدالتوں سے باہر کئے جانے والے فیصلے قانون کے عین مطابق ہیں۔ لوک عدالت کا نظام جو خود گورنمنٹ کی سرپرستی میں چل رہا ہے، وہ گویا گورنمنٹ کی طرف سے اس قانون کی حوصلہ افزائی کے ہم معنی ہے:

Extra-judicial settlement of disputes is recognised as valid and legal under the Indian Arbitration Act, 1940, and the Government has been encouraging it through Lok Adalats.

فوجداری معاملات از روئے قانون قابل دست اندازی پولیس ہوتے ہیں۔ اس لئے فوجداری امور میں ثالثی کا ایکٹ قابل انطباق نہیں ہے۔ بقیہ تمام معاملات میں وہ قابل انطباق ہے اور مسلمان اس سے بہت فائدہ حاصل کرسکتے ہیں۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۹۳

رسول اور اصحاب رسول جب عمرہ کے ارادہ سے مدینہ سے چل کر مکہ کے قریب پہنچے تو قریش نے ان کو وقار کا مسئلہ بنا لیا۔ انھوں نے کہا کہ جس نے ہمارے آباء کو بدر کے دن قتل کیا وہ ہمارے شہر میں داخل نہیں ہوسکتا (لا یدخل علینا من قتل آباءنا یوم بدر) تفسیر طبری ۱/۴۹۹

اسی کا نام حمیت جاہلیہ ہے۔ حمیت جاہلیہ ایک گناہ ہے اور اس کو قرآن میں اہل باطل کا طریقہ بتایا گیا ہے (الفتح)

۲۵ اکتوبر ۱۹۹۳

ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ کشمیر کی موجودہ تحریک حریت کے حامی تھے اور اس کو اسلامی جہاد بتاتے تھے۔ میں نے کہا کہ ۱۹۸۹ سے پہلے میں بار بار کشمیر گیا ہوں۔ وہاں کے مسلمانوں کو ہر طرح کی آزادی حاصل تھی دینی، تہذیبی، تعلیمی، اقتصادی، تبلیغی وغیرہ۔ ان کا صرف ایک مسئلہ تھا اور وہ تھا کشمیر میں انڈیا کا political presence اس بنا پر انھوں نے ۱۹۸۹ میں سرینگر میں بم مار کر اپنی مسلح تحریک شروع کردی۔

میں نے کہا کہ political presence کو اشو بنانا خود ایک غیر اسلامی فعل ہے کیونکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اس وقت عرب میں ایرانیوں اور رومیوں کا political presence موجود تھا مگر آپ نے اس کو اشو نہیں بنایا بلکہ شرک اور توحید کو اشو بنایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق پولٹیکل پریزنس کو اشو بنانا ایک سیاسی بدعت ہے۔ اور حدیث کے مطابق بدعت کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کچھ نہیں۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۹۳

دسمبر ۱۹۹۱ میں ایس آئی ایم والوں نے بمبئی میں اقدام امت کانفرنس کی۔ اس کا ایک

اجلاس جہاد پر تھا جس کا خطبۂ صدارت مولانا مجیب اللہ ندوی نے پڑھا۔

اس تین روزہ کانفرنس کے بعد ان مسلم نوجوانوں کا کوئی اقدامی عمل سامنے نہیں آیا۔ پچھلے دو سال کے دوران مسلمانوں کے خلاف کئی نہایت سنگین واقعات پیش آئے۔ ۶ دسمبر ۹۲ کو اجودھیا کی بابری مسجد ڈھا دی گئی۔ جنوری ۱۹۹۳ میں بمبئی اور سورت میں شدید فساد ہوا۔ وغیرہ۔ مگر ان میں سے کسی بھی چیز کو روکنے کے لئے مسلم نوجوان کوئی اقدام نہ کرسکے۔

یہی موجودہ زمانہ کے تمام مسلمانوں کا ہے۔ وہ اقدام کی پوزیشن میں نہ ہونے کے باوجود ہمیشہ اقدام کی اصطلاحوں میں کیوں بولتے ہیں۔ اقدام کے علاوہ کوئی اور عمل ان کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔ اس کا سبب مسلم علما اور دانشوروں کا ثنائی طرز فکر (dichotomous thinking) ہے۔ ان کے پاس سوچنے کے لئے دو ہی نقطے ہے۔ اقدام یا پسپائی۔ پسپائی چوں کہ ذلت کا فعل ہے، اس لئے وہ پسپائی کا انتخاب چھوڑ کر اقدام کا انتخاب کئے ہوئے ہیں۔

ضرورت ہے کہ مسلمان اس ثنائی طرز فکر سے ہٹایا جائے۔ انھیں بتایا جائے کہ ان دو کے علاوہ یہاں ایک تھرڈ آپشن بھی ہے جو زیادہ مفید اور پوری طرح قابل عمل ہے اور وہ ہے تیاری کے میدان میں اپنے آپ کو لے جانا اور اپنے آپ کو دینی، اخلاقی، سماجی، تعلیمی، اقتصادی اعتبار سے مستحکم کرنا۔ اس تیاری کے بعد ان کے مسائل یا تو اپنے آپ حل ہو جائیں گے۔ اور اگر دوسروں کے خلاف کسی اقدام کی ضرورت پیش آئی تو مسلمان زیادہ مؤثر اقدام کی پوزیشن میں ہوں گے۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۹۳

سڑکوں پر جگہ جگہ ٹرافک کے قاعدے جلی حرفوں میں لکھے ہوئے رہتے ہیں۔ میں دہلی کی ایک سڑک سے گاڑی پر گزر رہا تھا۔ ایک مقام پر سڑک کے کنارے ایک بڑے سے بورڈ پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

Better late than never. Drive carefully.

یعنی تاخیر سے پہنچنا اس سے بہتر ہے کہ تم کبھی نہ پہنچو۔ اپنی گاڑی احتیاط کے ساتھ چلاؤ۔

سڑک پر محفوظ سفر کا بھی اصول زندگی کے محفوظ سفر کے لئے بھی ہے۔ موجودہ زمانہ کی اکثر اسلامی تحریکیں اسی کا شکار ہوئی ہیں۔ جلد حکومت حاصل کرنے کے لئے یہ تحریکیں عملی سیاست میں قبل از وقت کود پڑیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ ملا ہوا تھا وہ بھی کھو یا گیا اور سیاسی اقتدار کی منزل دور سے دور تر ہوگئی۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۹۳

جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے دو ہندو استاد ملاقات کے لئے آئے اور دیر تک ہمارے دفتر میں رہے۔ میں نے چائے کے لئے پوچھا تو انھوں نے منع کر دیا اور کہا کہ ہم لوگ چائے نہیں پیتے ہیں۔ پھر میں نے ان سے کہا کہ پیغمبر اسلام کی ایک حدیث میں ہے کہ من زار رجلا ولم یذق منہ شیئاً فکانہ زار میتاً (جو شخص کسی سے ملا اور اس سے اس نے کچھ چکھا نہیں تو گویا کہ وہ مردہ سے ملا)، میں نے کہا کہ اس لئے مجھے آپ کو کچھ چکھانا ہے۔

اس کے بعد گھر کے اندر گیا۔ اس وقت گھر میں سنگھاڑے کی گھگھنی پکائی گئی تھی۔ میں ایک پلیٹ میں اس کو لے آیا اور ان کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے بہت شوق سے کھایا اور بہت خوش ہوئے۔ مذکورہ حدیث کا بھی ان پر بہت اثر ہوا۔

اس کے بعد میں نے سوچا کہ ماضی میں غالباً اسی طرح اسلام پھیلا۔ نارمل فضا میں اگر مسلمان اور غیر مسلمان آپس میں مل رہے ہوں تو اسی طرح فطری طور پر اسلام کے مختلف پہلو غیر مسلموں کے سامنے آتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ اسلام کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اسلام کی اشاعت کے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے کہ باہمی کشیدگی ختم کر دی جائے تاکہ معتدل ماحول میں ملنا جلنا شروع ہو جائے۔ اس کے بعد اپنے آپ اسلام کی تبلیغ ہونے لگے گی۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۹۳

ڈاکٹر مہیش شرما کا تعلق آر ایس ایس سے ہے۔ وہ ہندی ماہنامہ منتھن کے اڈیٹر ہیں۔ بات چیت کے دوران انھوں نے خود ہی مولانا علی میاں صاحب کا ذکر کیا۔ اور کہا: میں نے آپ کو اور علی میاں کو دونوں ہی کو پڑھا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ علی میاں مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور آپ اسلام کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے مجھ سے کچھ

حدیثیں پوچھیں اور ان کا ترجمہ ہندی میں لکھ کر لے گئے

۳۰ اکتوبر ۱۹۹۳

کشمیر کے جنگجو درگاہ حضرت بل (سرینگر) میں ہتھیار لے کر جمع ہو گئے۔ یہ واقعہ ۱۵ اکتوبر کو ہوا۔ اس کے بعد ۱۷ اکتوبر کو میں نے ٹی وی پر ایک بیان دیا جس میں کہا گیا تھا کہ مسجد عبادت کے لئے ہے۔ اس میں ہتھیار جمع کرنا غیر اسلامی فعل ہے۔ اس پر جنگجو لوگ بگڑ گئے۔ آج ۳۰ اکتوبر کو انھوں نے ایک اخباری بیان کے ذریعہ اعلان کیا کہ مولانا وحید الدین خاں کو جو شخص قتل کرے گا اس کو ہم پانچ لاکھ روپیہ انعام دیں گے۔ مزید انھوں نے کہا کہ ہم نے ایک death squad سرینگر سے دہلی بھیج دیا ہے جس کا کام یہ ہے کہ وہ ان کو قتل کر دے۔

یہ اعلان کشمیر کی اخوان المسلمون نے کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس تنظیم کو اپنا نام اعداء المسلمین (مسلمانوں کے دشمن) رکھنا چاہئے۔ کیوں کہ وہ عداوت کا کام کر رہے ہیں نہ کہ اخوت کا۔

۳۱ اکتوبر ۱۹۹۳

ویرپن پیدائشی طور پر نہایت بہادر نوجوان تھا۔ اس کے بعد وہ ڈاکو بن گیا۔ ڈاکہ بازی میں اس نے بڑے بڑے واقعات کئے۔ انگریزی پندرہ روزہ انڈیا ٹوڈے میں اس کے بارہ میں تفصیلات شائع ہوئی تھیں۔ اس کے بعد انڈیا ٹوڈے کے شمارہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۹۳ میں اس رپورٹ پر کچھ خطوط چھپے ہیں۔ ایک صاحب لکھتے ہیں کہ یہ ملک کے لئے بہت زیادہ مفید ہوتا اگر ویرپن نے اپنی بہادری کو عوامی فلاح کے لئے خرچ کیا ہوتا:

It would have benefited the country far more if Veerappan had displayed his bravery for the public good.

ہمیشہ اعلیٰ صلاحیت کے لوگ ہی دادا اور ڈاکو بنتے ہیں۔ یہ لوگ اگر تعمیری میدان میں کام کریں تو بڑے بڑے کارنامے انجام دے سکتے ہیں۔

یکم نومبر ۱۹۹۳

ایک مسلم لیڈر کا ٹیلیفون آیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ کشمیر کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ ایسا آپ کیوں کر کہتے ہیں۔ جب کہ یہ واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔ میں نے کہا کہ پہلے آپ یہ دیکھئے کہ میں

نے کیا کہا ہے۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ قانونی اعتبار سے کشمیر کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ میں نے جو بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ تاریخ کے اعتبار سے کشمیر کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ کشمیر کی موجودہ حالت آپ گولی اور بم سے نہیں بدل سکتے۔ اس کے لئے تاریخ کے نئے حالات درکار ہیں۔ تاریخ سے لڑنا چٹان سے اپنا سر ٹکرانا ہے۔ جو آدمی چٹان سے سر ٹکرائے وہ خود اپنا سر توڑے گا۔ وہ چٹان کو توڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ آپ لوگ کشمیر کے معاملہ کو آئیڈیلزم کے نقطۂ نظر سے دیکھ رہے ہیں اور میں اس کو عملی نقطۂ نظر سے دیکھ رہا ہوں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ انڈیا سے لڑ رہے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ آپ تاریخ سے لڑ رہے ہیں۔ یہ ہے اصل فرق جو میرے اور آپ کے درمیان پایا جاتا ہے۔

۲ نومبر ۱۹۹۳

بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیڈر پروفیسر مرلی منوہر جوشی آج ہمارے سنٹر میں آئے۔ ان سے تقریباً ایک گھنٹہ بات ہوئی۔ ان کے ساتھ اور بھی کئی ہندو بھائی تھے۔ آخر میں میں نے کہا کہ اب دیش میں نئے خون کی ضرورت ہے اور مجھے لگتا ہے کہ وہ نیا خون آپ لوگ بننے والے ہیں۔ میری آپ کو صرف ایک نصیحت ہے۔ آجکل جو حالات ہیں اس سے لگتا ہے کہ پہلی بار آپ لوگ ہندو ووٹ سے پاور میں آئیں گے۔ مگر جب پاور میں آجائیں تو آپ کی یہ کوشش ہونی چاہئے کہ دوسری بار آپ ہندو اور مسلمان دونوں کے ووٹ سے پاور میں آئیں۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو دیش تباہ ہو جائے گا۔

۳ نومبر ۱۹۹۳

۳۰ اکتوبر کو موت کی دھمکی کے بعد میرے رہائشی مکان (نئی دہلی) پر راؤنڈ دی کلاک سیکورٹی لگی ہوئی ہے۔ دھمکی کی خبر معلوم ہوتے ہی مسٹر ریشمی کانت میرے یہاں آئے اور مجھ کو اپنے مکان پر لے گئے۔ وہاں انھوں نے ہوم منسٹری سے ٹیلیفون پر کنٹیکٹ کیا۔ اور فوراً سیکیوریٹی لگانے کے لئے کہا۔ جب خبر ملی کہ میرے مکان پر سیکوریٹی کے مسلح جوان آچکے ہیں تو اپنی گاڑی سے مجھے واپس بھیجا۔

تاہم میں سوچتا ہوں کہ کوئی سیکوریٹی کسی کی حفاظت کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔

آدمی کے vulnerable points اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ سیکوریٹی کا کوئی بھی نظام اُن سب کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ عالم الغیب خدا کے سوا کسی کے لئے ممکن نہیں کہ وہ کسی فرد یا قوم کی حفاظت کرسکے۔

۴ اکتوبر ۱۹۹۳

کلکتہ کے ایک بڑے مسلم ڈاکٹر ملاقات کے لئے آئے۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ کلکتہ کے کئی مسلمانوں سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ جیوتی باسو (کمیونسٹ) کی حکومت کی تعریف کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔

ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ صحیح ہے کہ جیوتی باسو کی حکومت کے زمانہ میں کلکتہ میں کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔ مگر یہی کیونسٹ تو ہیں جو سوویت یونین کے دور میں سنٹرل ایشیا میں کیا کیا ظلم کرچکے ہیں۔ پھر میں نے کہا کہ وہاں کے مسلمانوں کا کہنا ہے کہ گورنمنٹ سروسوں میں بنگال میں مسلمانوں کے ساتھ وہ امتیاز نہیں برتا جاتا جو دوسری شمالی ریاستوں میں موجود ہے۔ انھوں نے کہا کہ اصولی اعتبار سے دیکھئے تو صرف امتیاز نہ ہونا کافی نہیں۔ اس وقت مسلمان تعلیم وغیرہ میں دوسرے فرقوں سے پیچھے ہوگئے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان کے ساتھ خصوصی رعایت کرکے انھیں آگے بڑھایا جائے۔

مجھے ان کا یہ طرز فکر بہت عجیب معلوم ہوا۔ جن لوگوں میں یہ سوچ پائی جائے وہ کبھی شکر کے احساس کا تجربہ نہیں کرسکتے۔

۵ نومبر ۱۹۹۳

کشمیر کے جنگجوؤں نے ۳۰ اکتوبر کو میرے قتل کا اعلان کیا تھا۔ آج اس اعلان پر ایک ہفتہ پورا ہوگیا۔ مگر اب تک کسی بھی قابل ذکر مسلمان کی طرف سے اس کی مذمت نہیں کی گئی۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، جمعیۃ علماء ہند، جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت، ملی کونسل، آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت، جمعیۃ اہل حدیث، اور دوسری درجنوں مسلم تنظیموں اور مسلم اداروں میں سے کسی نے بھی اس انتہائی غیر اسلامی فعل کے خلاف مذمتی بیان جاری نہیں کیا۔ حالانکہ یہ خبر تمام اخباروں میں چھپ کر ہر ایک کو معلوم ہوچکی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ میرا محافظ ہے۔ تاہم اس واقعہ نے تمام علماء اور تمام رہنماؤں اور دانشوروں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ ہر ایک اسلام کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہے مگر کسی کو بھی حقیقی اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں۔

۶ نومبر ۱۹۹۳

قاہرہ کی جامعۃ الازہر کو فاطمیوں نے ۹۷۰ء میں قائم کیا تھا۔ مسلم سلاطین اور حکمراں اس کا نہایت احترام کرتے تھے۔ دینی امور میں شیخ الازہر کو پوری خود مختاری حاصل تھی۔ شاہ فاروق تک اس کی یہ حالت باقی رہی۔ مگر مصر میں فوجی انقلاب کے بعد یہ صورتحال بدل گئی۔ مصر کے فوجی صدر جمال عبد الناصر نے ۱۹۵۸ میں تطویر الازہر کے نام سے ایک قانون وضع کیا۔ اس کے تحت ازہر میں کچھ جدید شعبوں کا اور عمارتوں کا اضافہ تو ہوا مگر شیخ الازہر کی قدیم حیثیت بالکل ختم ہو گئی۔ اب شیخ الازہر کا عہدہ حکومت کے تابع ہو گیا۔ جبکہ اس سے پہلے وہ ایک آزاد شعبہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

اس تبدیلی کی ذمہ داری لوگ جمال عبد الناصر پر ڈالتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک الاخوان المسلمون کے لیڈر مکمل طور پر اس میں شریک ہیں۔ کیوں کہ مصر کے فوجی انقلاب میں وہ پوری طرح فوجی افسروں کے ساتھ شامل تھے۔ یہ اخوانی لیڈروں کی بے بصیرتی کا ثبوت ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ وہ مصر کے شاہی نظام کو ختم کر کے وہاں اسلام کا نظام لا رہے ہیں۔ حالانکہ باعتبار حقیقت وہ پہلے سے بھی زیادہ برا نظام آنے کا راستہ صاف کر رہے تھے۔

۷ نومبر ۱۹۹۳

پونہ کے عبد الکریم عطار صاحب ملاقات کے لئے آئے۔ ان سے دعوت کے موضوع پر بات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں پونہ کے ہندوؤں کے درمیان رہتا ہوں۔ انھیں کے ساتھ میرا سارا کاروبار ہے۔ میں نے پایا کہ ہندوؤں کو اسلام سے نفرت نہیں، انھیں مسلمانوں سے نفرت ہے۔ اس لئے اسلام کی اشاعت کے لئے اصل کام یہ ہے کہ مسلمانوں کی اصلاح کی جائے۔ مسلمانوں کی اصلاح کے بعد ہندوؤں کی دوری اسلام سے ختم ہو جائے گی۔

یہ ایک بہت بڑی بھول ہے جس میں سو سال سے تمام مسلمان مبتلا ہیں۔ اس کی وجہ سے

اسلام کی دعوت کا کام رکا ہوا پڑا ہے۔ اسی نظریہ کے تحت تبلیغی جماعت چلائی گئی۔ مگر ۸۰ سال کی جدوجہد کے باوجود غیر مسلموں میں دعوتی کام جاری نہ ہوسکا۔

میں سمجھتا ہوں کہ دعوتی کام کو مسلمانوں کی اصلاح پر موقوف کرنے کے بجائے زیادہ درست بات یہ ہے کہ لوگوں کو بتایا جائے کہ اسلام اور مسلمان ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ اسلام اور مسلمان دونوں interchangable terms نہیں ہیں۔ اسلام کوئی نسلی مذہب نہیں۔ وہی مسلمان ہے جو واقعی معنوں میں اسلام کی دعوت پر چلے۔

اسلام اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے الگ کرکے زیادہ بہتر طور پر دعوت کا کام کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بجائے اگر مسلمانوں کی اصلاح پر دعوت کے کام کو منحصر کیا گیا تو کبھی بھی دعوت کا کام انجام نہیں پاسکتا۔ نہ کبھی مسلمانوں کی اصلاح ہوگی اور نہ کبھی دعوت کا کام شروع ہوسکے گا۔ کیوں کہ حدیث سے ثابت ہے کہ قرون ثلاثہ کے بعد جب مسلمانوں میں بگاڑ آئے گا تو وہ بڑھتا ہی چلا جائے گا۔

۸ نومبر ۱۹۹۳

ڈاکٹر مہیش شرما کا ٹیلیفون آیا۔ انھوں نے کہا کہ اس بار میں نے آپ کے اوپر اپنا مضمون لکھا ہے۔ وہ ہر ہفتہ ہندی اخبار میں ایک کالم لکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنا یہ ہندی مضمون پڑھ کر سنایا۔ اس میں ایک جملہ یہ بھی تھا کہ: مولانا وحید الدین خاں کہتے ہیں کہ اسلام دعوت ہے نہ کہ عداوت۔

اس طرح کے تجربات سے میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کی قومی غلطیوں کو اگر مان لیا جائے تو ہندو کا دل فوراً نرم ہوجاتا ہے اور وہ ہر بات سننے کے لئے تیار ہوجاتا ہے۔ واضح ہو کہ ڈاکٹر مہیش شرما مکمل طور پر آرایس ایس کے آدمی ہیں۔

۹ نومبر ۱۹۹۳

ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ابراہیم بت شکن اور محمود بت شکن بظاہر دونوں یکساں الفاظ ہیں۔ مگر دونوں میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ ایک کو دوسرے سے کوئی نسبت نہیں۔

حضرت ابراہیم نے بت شکنی سے اپنے عمل کا آغاز نہیں کیا۔ بلکہ دعوت توحید سے اپنا کام شروع کیا۔ دعوت کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے آپ نے قوم کے اوپر حجت تمام کر دی۔ اس کے باوجود قوم نے انکار کیا اور آپ کی دشمن بن گئی۔ اس کے بعد آپ نے ہجرت کا فیصلہ کیا۔ ہجرت سے پہلے آخری اتمام حجت کے لئے آپ نے ان کے بت خانہ کے ایک بت کو توڑ دیا۔

اس کے برعکس محمود غزنوی نے کوئی دعوتی کام نہیں کیا۔ وہ اپنی فوج لے کر سومناتھ میں داخل ہوا اور وہاں کے مندر میں داخل ہو کر بت کو توڑ ڈالا۔ مزید یہ کہ اس بت شکنی کا کوئی بھی تعلق دین سے نہیں تھا۔ وہ صرف اس لئے آیا تھا کہ مندر کا سونا لوٹے۔ اس کو معلوم ہوا تھا کہ سومناتھ کے مندر میں بہت بڑا بت ہے جس کے اندر سونا بھرا ہوا ہے۔ وہ اسی سونے کے لئے آیا تھا۔ اس نے بت کو توڑا اس کا سونا لوٹا اور پھر واپس چلا گیا۔

۱۰ نومبر ۱۹۹۳

مولانا بختیاری دار العلوم حیدر آباد میں استاد ہیں۔ آج وہ ہمارے دفتر میں آئے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے دار العلوم کے ایک استاد میرے خلاف ایک تنقیدی مضمون لکھ رہے ہیں۔ اس میں وہ میرے تفردات کا جائزہ لیں گے۔

میں نے کہا کہ میرے خلاف یہ ایک بے بنیاد پروپگنڈہ کیا جا رہا ہے۔ میرے کوئی تفردات نہیں۔ عقیدہ اور مسلک ہر اعتبار سے میں علماء سلف کے طریقہ پر ہوں۔ کسی بھی معاملہ میں میں نے تفرد نہیں کیا ہے۔ میرا واحد اختلاف طریقۂ کار کے بارہ میں ہے۔ میرا کہنا ہے کہ دور جدید میں ہمارے علماء اور رہناؤں نے اسلام کے احیاء کے لئے جو طریق کار اختیار کیا وہ بحیثیت طریقہ کے درست نہ تھا، اسی لئے وہ بے نتیجہ رہا۔ اور طریق کار یا تدبیر عمل کے معاملہ میں اختلاف تو ہر ایک سے کیا جا سکتا ہے حتی کہ بدر کے سفر میں خود نبی سے کیا گیا۔ جب کہ ایک صحابی نے کہا تھا کہ لیس ھذا بمنزل۔

تفرد اس سے بھی بالکل مختلف چیز ہے مثلاً طہٰ حسین (۱۹۸۹ - ۱۹۷۳) نے اپنی کتاب الشعر الجاھلی میں دعویٰ کیا ہے کہ کلام جاہلیت کوئی چیز نہیں۔ جن عربی اشعار کو دور جاہلیت

کے اشعار کہا جاتا ہے وہ سب موضوع اشعار ہیں۔ یہ ایک تفرد ہے، کیوں کہ وہ تمام اہل علم کی رائے کے خلاف محض ایک شخصی رائے ہے۔

اسی طرح سید ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا ہے کہ قائم شدہ حکومت کے خلاف خروج کرنا جائز ہے (تفہیم القرآن ۵/۷۹ — ۸۰) یہ واضح طور پر تفرد ہے۔ کیوں کہ تمام علما اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ قائم شدہ مسلم حکومت کے خلاف خروج جائز نہیں، خواہ بظاہر وہ ظالم کیوں نہ ہو۔ میں نے کبھی کسی دینی معاملہ میں اس قسم کا تفرد اختیار نہیں کیا ہے۔

۱۱ نومبر ۱۹۹۳

صبح اٹھ کر اپنے کمرہ کے سامنے والے بار جہ پر ٹہل رہا تھا کہ ایک تاثر ذہن میں آیا۔ میں نے سوچا کہ موجودہ مسلمانوں میں میرے مخالفین کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ ہزاروں کی گنتی میں بھی شاید ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مخالفین ہندستان کے اندر بھی ہیں اور ہندستان کے باہر بھی۔ مگر ان کی مخالفت کسی اصول پر مبنی نہیں، صرف اندھے تعصب پر مبنی ہے۔ مسلمانوں کا ایک طبقہ اس لئے میرا مخالف ہے کہ وہ اپنے بڑوں کے خلاف کلمۂ نقد سننے کے لئے تیار نہیں۔ دوسرا طبقہ اس لئے میرا مخالف ہے کہ وہ غیر قوموں کے حق میں کوئی کلمۂ خیر سننے کے لئے تیار نہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے مجھے ہندستان جیسے جمہوری ملک میں پیدا کیا یہاں مجھے کام کرنے کا پورا موقع مل رہا ہے۔ اگر میں کسی مسلم ملک میں ہوتا تو یقینی طور پر یہ بگڑے ہوئے مسلمان یا تو مجھے قتل کر دیتے، یا کم از کم وہ میرے خلاف ایسے حالات پیدا کرتے کہ میرے لئے آزادانہ طور پر کام کرنا ہی ناممکن ہو جاتا۔

۱۲ نومبر ۱۹۹۳

آجکل تمام دنیا کے مسلم اخبارات اور مسلم مطبوعات اس فریاد سے بھرے ہوتے ہیں کہ ساری قومیں اسلام کی دشمن ہوگئی ہیں اور متحد ہو کر مسلمانوں کو ھلاک کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ یہ ایک لغوبات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس صورت حال کی ذمہ داری تمام تر موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین پر ہے۔ انھوں نے اسلام کی تعبیر اس طرح کی کہ پولٹیکل ریولیوشن اسلام کا نشانہ بن گیا۔ چنانچہ مسلمان ہر جگہ کی حکومتوں سے کسی نہ کسی طور پر لڑنے لگے تاکہ اقتدار پر قبضہ

کر کے وہاں اسلامی حکومت قائم کر سکیں۔ مسلمانوں کے اسی طرز عمل کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہر جگہ ان کو مارا جانے لگا۔

سیاسی انقلاب اسلام کا نشانہ نہیں۔ اسلام کا نشانہ متقیانہ انقلاب ہے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں فکری انقلاب، روحانی انقلاب، اخلاقی انقلاب کہا جا سکتا ہے۔ متقیانہ انقلاب کی جدوجہد میں ساری محنت فرد پر کی جاتی ہے۔ جب کہ سیاسی انقلاب کی تحریک میں فوراً حکمراں طبقہ نشانہ بن جاتا ہے اور اس طرح غیر ضروری طور پر مسلمانوں کا ٹکراؤ حکمرانوں سے ہونے لگتا ہے۔

۱۳ نومبر ۱۹۹۳

بیسویں صدی کے نصف اول میں تمام مسلم رہنما یہ فریاد کرتے رہے کہ انگریزوں کی پالیسی یہ ہے کہ لڑاؤ اور حکومت کرو۔ اب صدی کے نصف ثانی میں تمام مسلم رہنما یہی شکایت امریکہ کے بارہ میں کر رہے ہیں۔ ان رہنماؤں نے یہ تو جانا کہ انگریزوں اور امریکیوں کی یہ پالیسی ہے کہ لڑاؤ اور حکومت کرو۔ مگر انھوں نے یہ نہیں جانا کہ یہاں ایک اور پالیسی ہے جو مذکورہ سازش کا بہترین توڑ ہے۔ اور وہ پالیسی یہ ہے کہ: نہ لڑو اور حکومت نہ کرنے دو۔

۱۴ نومبر ۱۹۹۳

مشہور عرب مصنف محمد الغزالی کی ایک کتاب "کفاحُ دین" ہے۔ ۳۱۰ صفحہ کی یہ کتاب دار البیان، کویت سے ۱۳۸۹ھ (۱۹۶۹ء) میں چھپی ہے۔ اس کتاب کے باب بیوت العبادۃ میں قاہرہ کی مسجدوں کا ذکر ہے۔ اس کے صفحہ ۱۶۸ - ۱۶۶ پر بتایا گیا ہے کہ تجمیل القاہرہ (قاہرہ کو خوبصورت بنانے) کی اسکیم کے تحت چودہ مسجدیں ڈھا دی گئیں (فان ھذا التجمیل اقتضیٰ ھدم اربعۃ عشر مسجداً لوزارۃ الاوقاف) ۱۶۷

کتاب میں ان چودہ مسجدوں کا نام اور مقام تحریر کیا گیا ہے۔ ہدم مساجد کے واقعات ہر مسلم ملک میں پیش آتے ہیں۔ مثلاً پاکستان میں، سعودی عرب میں، الجزائر میں، اور دوسرے مسلم ملکوں میں۔ مگر ہمارے علماء نے کبھی یہ تحریک نہیں چلائی کہ ان ڈھائی ہوئی مسجدوں کو دوبارہ

بنایا جائے۔ حتیٰ کہ خود ہندستان میں ۱۹۴۷ کی شورش میں ہزاروں مسجدیں ڈھائی گئیں۔ ان کے بارہ میں بھی ان علماء نے یہ مطالباتی مہم شروع نہیں کی کہ ان مسجدوں کو اسی مقام پر دوبارہ بنایا جائے۔ البتہ اجودھیا کی بابری مسجد کے معاملہ میں ہر آدمی یہی مطالبہ کر رہا ہے۔ کیسا عجیب ہے یہ تضاد جس میں ہندستان کے تمام علماء اور رہنما مبتلا ہیں۔

ان نام نہاد رہنماؤں کا کہنا ہے کہ بابری مسجد مسلمانوں کے وجود کی علامت ہے۔ یہ ایک لغو بات ہے۔ بابری مسجد اگر فی الواقع مسلمانوں کے وجود کی علامت ہوتی تو وہ کبھی ڈھائی نہ جاتی۔ کیوں کہ مسلمانوں کے وجود کا محافظ اللہ تعالیٰ ہے۔

۱۵ نومبر ۱۹۹۳

مولانا حفظ الرحمان صاحب آزادی کے بعد ۱۵ سال تک زندہ رہے۔ وہ ہندستانی پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ پارلیمنٹ کے اجلاسوں میں وہ گرج دار تقریریں کیا کرتے تھے۔ ہندو زیادتی کے خلاف اپنی ان تقریروں کی وجہ سے وہ مسلمانوں میں کافی مقبول ہوئے۔ بلکہ اپنی زندگی میں وہی واحد مقبول مسلم لیڈر تھے۔ وہ "مجاہد ملت" کے نام سے مشہور ہوئے۔

آزادی کے بعد یہی "مجاہد ملت ماڈل" مسلمانوں میں رائج ہو گیا۔ پرشور احتجاج کو لوگ کام سمجھنے لگے۔ اس درمیان میں کوئی داعیٔ ملت کی حیثیت سے نہیں ابھرا۔ اس لئے مسلمانوں میں "داعیٔ ملت ماڈل" بھی رائج نہ ہو سکا۔

۱۶ نومبر ۱۹۹۳

مولانا ابو الکلام آزاد کانگرس کے تحت ہندوؤں کے ساتھ تھے۔ ہندوؤں کو ان کے اوپر اعتماد تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۷ کے بعد ہندوؤں میں یہ ذہن پیدا ہوا کہ اسلام کو سمجھنا چاہتے ہو تو ابو الکلام آزاد کی کتابیں پڑھو۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے کئی ادارے قائم ہوئے۔ مگر ابو الکلام کی انشا پردازانہ کتابوں میں کچھ مواد نہ تھا۔ چنانچہ دھیرے دھیرے یہ لہر ختم ہو گئی۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید وہ وقت آنے والا ہے جب کہ ہندو یہ کہنے لگیں کہ اسلام کو سمجھنا چاہتے ہو تو وحید الدین خاں کی کتابیں پڑھو۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو انشاء اللہ

ہندوؤں کو مطالعہ کے لئے کافی ذخیرہ مل جائے گا۔ کیوں کہ اللہ کے فضل سے الرسالہ مشن کے تحت سو سے زیادہ کتابیں اسلام کے مختلف پہلوؤں پر تیار ہو گئی ہیں۔ اور یہ کتابیں مولانا ابو الکلام کی طرح انشاپردازانہ نہیں ہیں بلکہ سائنٹفک انداز میں ہیں جو کہ زمانہ کا انداز ہے۔

۱۷ نومبر ۱۹۹۳

آج کے تمام اخباروں کی یہ خبر ہے کہ کشمیر کے جنگجوؤں نے از خود سرینڈر کر دیا۔ قصہ یہ ہے کہ کشمیر کے جنگجو ۶۵ کی تعداد میں سرینگر کی مسجد حضرت بل میں داخل ہوئے۔ اس کے اندر انھوں نے مہلک ہتھیار اکٹھا کر لئے۔ ان کا ارادہ اس کو اپنی عسکری جدوجہد کا اڈہ بنانا تھا۔ اس کے بعد ہندستانی فوج نے مسجد کو گھیر لیا۔ اس نے سادہ طور پر یہ کیا کہ باہر سے خوراک جانا بالکل بند کر دیا۔ آخر کار تمام جنگجو بھوک سے نڈھال ہو گئے اور مجبور ہو کر مسجد کے باہر نکل آئے اور اپنے آپ کو فوج کے حوالے کر دیا۔ اس طرح وہ ۳۲ دن تک مسجد کے اندر رہے۔

اس واقعہ کے فوراً بعد ۱۶ اکتوبر کو میں نے ٹی وی پر جنگجوؤں سے اپیل کی تھی کہ مسجد کو ہتھیاروں کا اڈہ بنانا اسلام کے خلاف ہے۔ وہ رضاکارانہ طور پر اس سے باہر نکل آئیں۔ مگر جنگجو حضرات اس وقت اتنے جوش میں تھے کہ مجھ کو قتل کی دھمکی دینے لگے۔ مگر ۳۲ دن کے بعد حالات کے دباؤ کے تحت انھوں نے خود مسجد کو چھوڑ دیا۔

آج میں نے اخباروں میں یہ خبر پڑھی تو میرا تاثر یہ تھا ـــــ موجودہ زمانہ کے مسلمان یا جذباتی اقدام جانتے ہیں یا مجبورانہ پسپائی۔ اصول کے تحت خاموشی کے طریقہ کو انھوں نے اب تک نہیں جانا۔

۱۸ نومبر ۱۹۹۳

بخاری میں روایت ہے کہ حضرت عائشہ نے فرمایا: ما خیّر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین الا اختار ایسرهما (رسول اللہ صلی اللہ علیہ کو جب بھی دو امر میں سے ایک کو انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ دونوں میں سے آسان کا انتخاب فرماتے)

اس حدیث پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ یہاں آسان سے مراد ممکن العمل اور مشکل

سے مراد ناممکن العمل ہے۔ آپ کی پوری زندگی مشکلوں میں گزری۔ مجرد آسان کا طالب ہونا آپ کا طریقہ نہ تھا۔ البتہ آپ کی سیرت کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہمیشہ یہ دیکھتے تھے کہ کسی خاص وقت میں کیا چیز قابل عمل ہے اور کیا چیز قابل عمل نہیں ہے۔ چنانچہ آپ ہمیشہ اس طریقہ کو اختیار فرماتے تھے جس کو بوقت فیصلہ زیر عمل لانا ممکن ہو۔ اور حالات کے اعتبار سے اس وقت جس چیز کو عمل میں لانا ممکن ہو اس کو ترک فرماتے تھے۔

۱۹ نومبر ۱۹۹۳

کسی حدیث یا کسی اسوۂ رسول کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو اس کے حالات میں رکھ کر دیکھا جائے۔ مثلاً حدیث میں ہے کہ لا تجتمع دینان فی جزیرۃ العرب۔ دوسری طرف سیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ آئے تو آپ نے ایک "صحیفہ" جاری فرمایا۔ اس میں لکھا ہوا تھا: للمسلمین دینھم ولليهود دينهم۔

یہ دونوں باتیں بظاہر ایک دوسرے کے غیر مطابق ہیں۔ اس کی توجیہ اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی کہ یہ کہا جائے کہ دونوں دو مختلف حالات کے لئے ہیں۔ ایسی حالت میں جو مسلمان ایک حدیث کو لے کر اس کو ہر طرح کے حالات میں چسپاں کرنے لگتے ہیں وہ واضح طور پر سنت نبوی کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔

۲۰ نومبر ۱۹۹۳

فرد ہو یا جماعت، اگر نشانہ غلط ہو تو اس کے بعد اس کی تمام سرگرمیاں غلط ہوتی چلی جائیں گی۔ بیسویں صدی کے نصف اوّل میں مسلم دنیا میں کئی شخصیتیں اور تحریکیں اٹھیں جنھوں نے غلط طور پر غلبہ اور اقتدار کو نشانہ بنایا۔ پہلے مرحلہ میں انھوں نے پریس کے ذریعہ کو استعمال کرکے اسلامی انقلاب لانا چاہا۔ اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو دوسرے مرحلہ میں انھوں نے مصر، پاکستان، سوڈان، الجزائر وغیرہ میں الکشن میں حصہ لیا۔ الیکشن کے ذریعہ بھی وہ اقتدار تک نہ پہنچ سکے۔

اب ساری دنیا میں اس ذہن کے لوگ تیسرے مرحلہ میں داخل ہو گئے ہیں۔ وہ تشدد

کے ذریعہ اسلامی انقلاب لانا چاہتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر یہ تحریکیں اپنے آخری برے انجام کو پہنچ گئی ہیں۔ انھوں نے دعوت کو فساد کے ہم معنی بنا دیا ہے۔ کیونسٹوں کا تشدد ختم ہو گیا۔ اب نام نہاد اسلام پسندوں کے تشدد کا دور دنیا میں آگیا ہے۔ یہ لوگ اسلام کو قائم تو نہ کرسکے۔ البتہ اسلام کو بدنام کرنے کا کارنامہ ضرور انھوں نے انجام دیا ہے۔

۲۱ نومبر ۱۹۹۳

لوگوں سے ملاقاتوں اور گفتگوؤں کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان صرف قومی اہمیت کی باتوں کو جانتے ہیں۔ دعوتی اہمیت کی باتوں سے وہ شعوری طور پر آشنا نہیں۔ ایک لغو بات جس میں بظاہر قومی مفاد بتایا گیا ہو، ان کی سمجھ میں فوراً آجاتی ہے۔ مگر ایک بامعنی بات جس میں دعوتی مفاد بھرپور طور پر موجود ہو وہ ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔

۲۲ نومبر ۱۹۹۳

۲۰ - ۲۱ نومبر کو میں بمبئی میں تھا۔ آج وہاں سے واپس آیا۔ وہاں بہت سے مسلمانوں سے ملاقات ہوئی۔ جسٹس قاضی سے مسلمانوں کی حالت پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ جس طرح ایک فرد کا وجود degeneration کا شکار ہوتا ہے۔ اسی طرح قوموں کا بھی ڈی جنریشن ہوتا ہے۔ مسلم قوم اس سے مستثنیٰ نہیں۔

حدیث کے مطابق قرون مشہود لہا بالخیر صرف تین ہیں۔ عہد رسالت، عہد صحابہ، عہد تابعین۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تابعین کے بعد مسلم امت کا زوال شروع ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ دور عروج اور دور زوال کے درمیان عمر بن عبد العزیز کا وجود حد فاصل ہے۔

۲۳ نومبر ۱۹۹۳

میرے ایک دانت میں چند دن سے درد ہے۔ درد کی شدت میں ہر چیز بے معنی معلوم ہونے لگی۔ میں نے سوچا کہ ایک شخص کو دنیا کی تمام نعمتیں مزید اضافہ کے ساتھ دے دی جائیں اور اس کے بعد صرف اتنا ہو کہ اس کے ایک دانت میں ہمیشہ کے لئے درد رکھ دیا جائے۔ ایسے شخص کے لئے ساری نعمتیں بے معنی ہو جائیں گی۔ وہ کہے گا کہ ساری نعمتیں لے لو اور میرا دانت

اچھا کردو۔

۲۴ نومبر ۱۹۹۳

سورت کے تین صاحبان سے ملاقات ہوئی۔ وہ تبلیغ کے تحت یہاں آئے تھے۔ سورت کے فساد کی تفصیل بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ "کچھ مسلمانوں کی غلطیاں بھی اس میں شامل تھیں"۔ میں نے دریافت کیا کہ مسلمانوں کی غلطیاں کیا تھیں۔

انھوں نے بتایا کہ اصل یہ ہے کہ سورت میں فساد کا آغاز مسلمانوں نے کیا۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کی شام کو بابری مسجد ڈھانے کی خبر مل گئی تھی۔ ۷ دسمبر کی صبح کو مسلم نوجوان سورت کی سڑکوں پر نکل آئے۔ انھوں نے ہڑتال کی کال دی۔ اور لوگوں کی دکانیں بند کرانے لگے۔ ہندو لوگ دکان بند نہیں کر رہے تھے تو ان پر پتھراؤ کیا۔ اس کے نتیجہ میں ہندوؤں میں جوابی تشدد پیدا ہوا۔ اگرچہ سورت کے فساد میں جو ہندو ملوث ہوئے وہ زیادہ تر باہر کے ہندو تھے۔ مگر ان ہندوؤں کو سورت میں آکر فساد کرنے کا موقع خود مقامی مسلمانوں نے فراہم کیا۔

۲۵ نومبر ۱۹۹۳

رات میں نے مولانا جلال الدین انصر عمری (رکن مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند) کو خواب میں دیکھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے بعد جماعت اسلامی میں کوئی جاندار لٹریچر پیدا نہ ہو سکا۔ پھر بھی جماعت اسلامی چل رہی ہے۔ اس کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کوئی خاص جواب نہیں دیا۔ پھر میں نے کہا کہ اس کا راز ایک انحراف (deviation) ہے۔ تقسیم کے بعد جلد ہی جماعت اسلامی نے مسلم لیگ کا انداز اختیار کرلیا۔ ملی مسائل کے نام پر وہ مسلمانوں کی قومی خواہشات کی ترجمانی کرنے لگی۔ اس تبدیلی نے اس کو دوبارہ سنبھال لیا۔

زوال یافتہ قوم کی وکالت کرنے والا قوم کے اندر محبوب بنتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص زوال یافتہ قوم کی اصلاح کرنا چاہے وہ قوم کے اندر مبغوض بن کر رہ جائے گا۔

۲۶ نومبر ۱۹۹۳

اس وقت مسلمانوں میں جو تحریکیں چل رہی ہیں ان سے تحفظ ملت کا کچھ ضمنی فائدہ

تو ہو سکتا ہے۔ مگر ان کے ذریعہ احیاء اسلام کا برتر نتیجہ کبھی نہیں نکل سکتا۔ یہ تمام تحریکیں فکری محدودیت کا شکار ہیں۔ ان میں سے کوئی تحریک ملت کی اصلاح میں کچھ passive role ادا کر سکتی ہے۔ کوئی تحریک خارجی مسائل کے ذیل میں کچھ agitative role رول ادا کر سکتی ہے، بشرطیکہ اسے کوئی رول کہا جاسکے۔ جہاں تک مثبت معنوں میں فعال کردار (active role) کا سوال ہے، وہ ان میں سے کسی بھی تحریک کے لئے ادا کرنا ممکن نہیں۔

احیاء اسلام کے لئے فعال کردار (active role) ادا کرنے والی تحریک میں دو صفتیں لازمی طور پر ہونی چاہئے۔ ایک یہ کہ وہ انسانیت عامہ کے لئے اٹھی ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ وقت کے فکری معیار کے مطابق ہو۔ اور یہ دونوں صفتیں موجودہ زمانہ کی کسی بھی مسلم تحریک میں موجود نہیں۔

۲۷ نومبر ۱۹۹۳

مسٹر ایم اے سراج نے کہا کہ آپ مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ حکومت سے نہ ٹکرائیں اور حالات کے اعتبار سے جو مواقع حاصل ہیں بس ان کے دائرہ میں رہ کر اپنی تعمیر کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے ظلم اور بے انصافی ہو تو اس کو دور کرنے کے لئے مسلمان نہ اٹھیں۔ کیا آپ مسلمانوں کو status quoist بنا دینا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ status quoism نہیں ہے۔ یہ در اصل اسٹارٹنگ پوائنٹ حاصل کرنا ہے۔ اگر آپ بے انصافی کے نام پر حکومتوں سے لڑتے رہیں تو آپ کو اپنی زندگی کی تعمیر کے لئے نقطۂ آغاز ہی نہیں ملے گا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد سے اب تک مسلمان ہر جگہ حکومتوں سے لڑ رہے ہیں اور اب تک وہ کچھ حاصل نہ کرسکے۔ جب کہ اسی جنگ کے بعد جاپان نے سیاسی ٹکراؤ کو اوائڈ کرتے ہوئے حاصل شدہ دائرہ میں جدوجہد شروع کی تو آج وہ سب کچھ پا چکا ہے۔

زندگی کے عمل میں اصل اہمیت نقطۂ آغاز کی ہے۔ اگر آدمی کو صحیح نقطۂ آغاز مل جائے تو آخر کار وہ کامیابی کی منزل پر پہنچ کر رہتا ہے۔ اور اگر نقطۂ آغاز نہ ملے تو بظاہر ہنگامہ خیز جدوجہد کے باوجود وہ کہیں بھی نہیں پہنچے گا۔

۲۸ نومبر ۱۹۹۳

گودھرا کے حاجی سلیمان کوٹھی اور ان کے ایک ساتھی ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۸۰ کو گودھرا میں ایک ہندو مسلم فساد ہوا تھا۔ اس کے نتیجہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں تقریباً ایک سال تک کشیدگی جاری رہی۔

اس طرح کے فرقہ وارانہ فساد عام طور پر ہندو جلوس کے موقع پر ہوتے ہیں۔ اگلے سال گنپتی کا جلوس نکالنے کی تاریخ آئی تو گودھرا کے مسلمانوں کو تشویش ہوئی۔ یہ جلوس جہاں شروع ہوتا ہے اور جہاں ختم ہوتا ہے اس کا فاصلہ تقریباً چھ کلو میٹر ہے۔ اس روٹ کے درمیان ڈیڑھ کلو میٹر مسلمانوں کا علاقہ ہے۔ جلوس اپنا سفر تقریباً سات گھنٹے میں طے کرتا ہے۔ مگر مسلم علاقہ میں وہ کم از کم تین گھنٹہ تک رہتا ہے۔ یہاں وہ رک رک کر اشتعال انگیز نعرے لگاتا ہے مثلاً:

ہاتھ میں بیڑی منھ میں پان ، میاں چلے جاؤ پاکستان

جو ہم سے ٹکرائے گا ، مٹی میں مل جائے گا۔

گودھرا کے مسلمانوں نے مشورہ کرکے طے کیا کہ ہم لوگ یکطرفہ طور پر اواﺋڈ کرنے کا طریقہ اختیار کریں۔ چنانچہ جس دن جلوس نکلتا ہے مسلمان اس روٹ پر اپنی تمام دکانیں بند کر دیتے ہیں۔ نوجوانوں کو گھروں میں روک دیا جاتا ہے۔ بڑی عمر کے لوگ چوراہوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور کوئی مسلم نوجوان دکھائی دیتا ہے تو فوراً اس کو واپس بھیج دیتے ہیں۔

صبر واعراض کی اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ گودھرا میں اگرچہ اب بھی ہر سال گنپتی کا جلوس نکلتا ہے۔ مگر وہاں سالوں سے کوئی فساد نہیں ہوا۔

۲۹ نومبر ۱۹۹۳

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے بتایا کہ میری ملاقات آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ایک خاص رکن سے ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ بتاؤ کہ تمہارے اس بورڈ کا فائدہ کیا ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کا حال تو یہ ہے کہ طلاق کے معاملہ میں جو لڑکے والا ہے وہ اسلامی فتویٰ تلاش کرتا ہے تاکہ اسے لڑکی کو maintenar نہ دینا پڑے۔ اور جو لڑکی والا ہے وہ فوراً ملکی

عدالت میں پہنچتا ہے تاکہ وہاں سے اپنے حق میں فیصلہ لے آئے۔ جب مسلم معاشرہ کا یہ حال ہو تو تمہارا پرسنل لا بورڈ کیا کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔

۳۰ نومبر ۱۹۹۳

بمبئی کے ہارون شیخ (Tel. 4649428) ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے کہا کہ ۱۲ مارچ کے بامب بلاسٹ سے کچھ نادان مسلمان خوش ہو رہے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچا۔ انھوں نے کہا کہ شروع جنوری ۱۹۹۳ میں جب بمبئی میں فساد ہوا تو اس کے بعد بمبئی کے مسلمانوں میں ایک نئی سوچ آئی تھی۔ ہر آدمی یہ بولتا ہوا ملتا تھا کہ ہم کو تعلیم میں آگے بڑھنا ہے۔ ہم کو اپنے اندر اتحاد پیدا کرنا ہے۔ ہم کو اقتصادی شعبوں میں ترقی کرنا ہے۔ ورنہ ہم اسی طرح مار کھاتے رہیں گے۔

مگر اس کے بعد ۱۲ مارچ ۱۹۹۳ کو جب بمبئی میں بامب بلاسٹ ہوا تو مسلمان مطمئن ہو گئے۔ انھوں نے سمجھا کہ اب معاملہ برابر ہو گیا۔ چنانچہ جو مسلمان پہلے یہ کہتے تھے کہ ہمیں اپنی ترقی کے لئے کچھ کرنا ہے، وہ اب یہ کہنے لگے کہ انھوں نے اگر فائیو ڈے میچ جیتا تھا تو ہم نے ون ڈے میچ جیت لیا۔

یکم دسمبر ۱۹۹۳

علماء نے مجتہد کی دو قسم بتائی ہے۔ مجتہد عام اور مجتہد مطلق۔ میرا خیال ہے کہ اس تقسیم کو زیادہ بہتر طور پر اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ ایک مجتہد وہ ہے جو سادہ طور پر صرف مفتی ہو۔ دوسرا مجتہد وہ ہے جو اپنے اجتہاد کے ذریعہ ایک مستقل مکتب فکر پیدا کرے۔

علامہ اقبال ایک ایسے مجتہد کے منتظر تھے جو فقہ اسلامی کو جدید حالات پر منطبق کرکے ایک مکمل قانونی نظام کا نقشہ پیش کرے۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانہ کا مجتہد اعظم اس کے برعکس وہ ہو گا جو فقہ کے اسی توسیعی رول کو گھٹائے جو بعد کو دور عباسی میں پیدا ہوا۔ یہ مجتہد اسلام کو دوبارہ حنیفیت سمحہ کی طرف لے جائے گا جب کہ روح اسلام کی حیثیت اولین تھی اور قانونی ہیئت کی حیثیت صرف ثانوی۔

۲ دسمبر ۱۹۹۳

ایک مسنون دعا ہے کہ اے اللہ، میں تیری پناہ چاہتا ہوں ایسے علم سے جو نفع نہ دے،

اور ایسے قلب سے جو عاجزی نہ کرے اور ایسی دعا سے جو قبول نہ کی جائے (اللّٰھم انّی اعوذبك من علم لا ینفع ومن قلب لا یخشع ومن دعاء لا یستجاب لھا)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خشوع کا تعلق علم سے بھی ہے اور دعا سے بھی۔ خشوع آدمی کے اندر وہ گہری معرفت پیدا کرتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کے اندر سے سچی دعا ظاہر ہو۔

۲ دسمبر ۱۹۹۳

آج کشمیر ہاؤس میں کشمیر کے گورنر جنرل راؤ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے خود اس کی خواہش ظاہر کی تھی۔ میرے اندازہ کے مطابق وہ نہایت صحیح مزاج کے آدمی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کشمیر میں ہماری پالیسی یہ ہے کہ جنگجوؤں کے معاملہ میں vigorous اور عام پبلک کے معاملہ میں linient

میں سمجھتا ہوں کہ یہی زندگی کا بہترین اصول ہے۔ یعنی لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے ایک اور دوسرے کے فرق کو ملحوظ رکھنا۔ اسی کو شیخ سعدی نے اس طرح نظم کیا ہے:

درشتی و نرمی بہم در بہ است — کہ رگ زن کہ جراح مرہم نہ است

۴ دسمبر ۱۹۹۳

لندن سے ایک عربی ماہنامہ نکلتا ہے۔ اس کا نام البیان (Tel. 071-7318145) ہے۔ اس کے صفحہ ۱۰۶ پر درج ہے کہ یونس الصوفی نے لکھا ہے کہ میں نے ایک روز امام الشافعی سے ایک مسئلہ پر بحث کی۔ پھر ہم دونوں جدا ہو گئے۔ بعد کو امام شافعی سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ اے ابوموسیٰ، کیا یہ اچھا نہیں کہ ہم بھائی بھائی کی طرح رہیں، چاہے ہم ایک دوسرے سے اتفاق نہ رکھتے ہوں:

ما رأیت اعقل من الشافعی۔ ناظرتہ یوماً فی مسئلۃ ثم افترقنا۔ ولقینی فأخذ بیدی ثم قال: یا اباموسیٰ الا یستقیم ان نکون اخوانا وان لم نتفق۔

امام شافعی نے جو بات کہی وہ ایک اعلیٰ انسانی صفت ہے۔ اسلامی معاشرہ میں جب اعلیٰ انسان ہوں تو اعلیٰ انسانی اوصاف پائے جائیں گے اور ادنیٰ انسان ہوں تو ادنیٰ انسانی اوصاف۔

۵ دسمبر ۱۹۹۳

قدیم زمانہ کا ایک لوہار صرف محدود بزنس کر سکتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں سائنسی انقلاب نے ایک صنعت کار کو اپنا بزنس بڑھانے کے لامحدود مواقع دیدئے ہیں۔ مثال کے طور پر جے آر ڈی ٹاٹا ۹۵ فیکٹریوں کو کنٹرول کر رکھا تھا جن کا گروپ سیل ۱۰ ہزار کروڑ سالانہ تھا۔

یہی معاملہ مذہب کا بھی ہے۔ قدیم زمانہ میں مذہب کو تجارت بنانے کے امکانات بہت محدود تھے۔ موجودہ زمانہ کے حالات نے ایک شخص کو یہ موقع دے دیا ہے کہ وہ مذہب کے نام پر ایک عظیم مذہبی انڈسٹری قائم کر سکے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں سب سے زیادہ نفع بخش کام دو ہیں ـــــ قلم اور مذہب۔

۶ دسمبر ۱۹۹۳

لوگ اپنی ذات کو مبالغہ آمیز حد تک جانتے ہیں لیکن دوسروں کے بارہ میں وہ آخری حد تک بے خبر ہیں۔ مگر سچا عالم وہ ہے جو اپنے بارہ میں کم سے کم جانے اور دوسروں کے بارہ میں زیادہ سے زیادہ جاننے کا حریص ہو۔ اپنی ذات آدمی کے لئے احتساب کا موضوع ہونا چاہئے اور دوسروں کی ذات اس کے لئے اکتساب کا موضوع۔

۷ دسمبر ۱۹۹۳

۵ دسمبر کو میں رشی کیش گیا تھا جو ہندوؤں کا مقدس مقام ہے۔ ۷ دسمبر کو وہاں سے واپس آیا۔ اس سفر میں بہت سے تعلیم یافتہ ہندوؤں سے مذہبی مسائل پر بات ہوئی۔ میرا احساس یہ ہے کہ ہندوؤں کا ذہنی سانچہ موحدانہ طرز فکر سے اتنا مختلف ہے کہ ان کو اسلام کا نقطۂ نظر سمجھانا سخت مشکل ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کا معاملہ یہ ہے کہ ان کا ذہنی سانچہ درست ہے۔ مگر ان کی اکابر پرستی نے ان کے ذہن کو جامد بنا دیا ہے۔ ہندو اگر فکری انحراف کا شکار ہیں تو مسلمان فکری جمود میں مبتلا ہیں۔

۸ دسمبر ۱۹۹۳

ایک نوجوان اصلاحی عالم سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں قرآن کو اپنے مطالعہ اور تحریر کا موضوع بنانا چاہتا ہوں۔ مجھ کو اس سلسلہ میں مشورہ دیجئے۔ میں نے کہا کہ میرا پہلا مشورہ

تو یہ ہے کہ آپ اصلاحی نظریۂ قرآن سے اپنے آپ کو آزاد کیجئے۔ یہ آپ کے لئے فہم قرآن کا پہلا زینہ ہے۔

میں نے کہا کہ مدرسۃ الاصلاح مولانا حمید الدین فراہی کے فکر پر قائم ہے۔ مولانا فراہی کا نظریہ یہ تھا کہ نظم فہم قرآن کی کلید ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ یہ فراہی نظریہ کس قرآنی نص سے ماخوذ ہے۔ جو چیز فہم قرآن کی کلید ہو اس کو خود قرآن میں مذکور ہونا چاہئے۔ مگر ایسی کوئی آیت پورے قرآن میں موجود نہیں۔ یہ پورا تصور ذاتی ریزننگ پر قائم ہے نہ کہ قرآنی نص پر۔ اس قسم کا کوئی نظریہ فہم قرآن میں رکاوٹ ہے نہ کہ فہم قرآن کی شاہ کلید۔

قرآن کے شروع ہی میں یہ آیت ہے کہ ذالك الكتاب لاريب فيه هدىً للمتقين اسی طرح قرآن میں ہے کہ اتقوا الله ويعلّمكم الله (البقرہ ۲۸۲) اس طرح کی مختلف آیتیں بتاتی ہیں کہ فہم قرآن کے لئے سب سے زیادہ اہم چیز تقویٰ ہے۔ ایسی حالت میں خود ساختہ طور پر کسی اور چیز کو کس طرح فہم قرآن کی کلید قرار دیا جاسکتا ہے۔

۹ دسمبر ۱۹۹۳

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر نبوت کے ابتدائی ۱۳ سال تک مکمل طور پر صبر کا طریقہ اختیار کیا۔ یہ بے حد مشکل کام تھا۔ اس مشکل کام کو ممکن بنانے کے لئے اس زمانہ میں قرآن میں صبر کی اہمیت اور عظمت پر کثرت سے آیتیں اتاری گئیں۔ مثلاً سورۃ العصر میں صبر کو خسران سے بچنے کا واحد ذریعہ بتایا گیا۔ سورۃ الشوریٰ میں فرمایا کہ ولمن صَبَرَ وغَفَرَ فان ذالك من عزم الامور آپ نے جہاد (بمعنی قتال) پر صرف ہجرت کے بعد عمل فرمایا۔

کسی تحریک کے دو دور ہوتے ہیں۔ ایک ابتدائی دور جب کہ وہ قسم کے ٹکراؤ سے بچتے ہوئے اپنے داخلی پہلو کو مستحکم کرتی ہے۔ دوسرا وہ دور جب کہ وہ خارجی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے ضروری اقدام کرتی ہے۔ پہلے دور کو صبر اور دوسرے دور کو جہاد کہا گیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں ساری دنیا کے مسلمان صبر کے دور میں تھے۔ کیوں کہ زندگی کی دوڑ میں وہ دوسری قوموں سے بچھڑ گئے تھے۔ نئے زمانہ کے اعتبار سے انھیں اپنے آپ کو مستحکم اور طاقت ور بنانے کی ضرورت تھی۔ اس مقصد کے لئے انھیں خارجی مسائل میں الجھنے سے اعراض

کرتے ہوئے ساری طاقت داخلی استحکام پر صرف کرنا تھا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ ساری دنیا کے مسلمان دوسری قوموں سے بے نتیجہ ٹکراؤ میں مشغول ہو گئے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ موجودہ زمانہ کے تمام مفکرین اور مصلحین نے صرف جہاد کی اہمیت بیان کی۔ وہ صبر کی اہمیت بیان کرنے میں ناکام رہے۔ عظمت جہاد پر ہزاروں کتابیں لکھی گئیں۔ مگر عظمت پر کوئی ایک کتاب بھی جدید اسلامی کتب خانہ میں موجود نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاد تو لوگوں کو بڑا کام نظر آیا۔ مگر صبر انھیں بے عملی اور بزدلی دکھائی دیا۔ ایسی حالت میں یہی ہو سکتا تھا اور یہی ہوا کہ دور صبر میں لوگ عمل جہاد کے کارنامے دکھاتے رہے۔ ملت کے حصہ میں یکطرفہ بربادی کے سوا اور کچھ نہیں آیا۔

۱۰ دسمبر ۱۹۹۳

صریح احادیث کی بنا پر علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ مسلم حکمراں کے خلاف خروج (بغاوت) جائز نہیں خواہ بظاہر وہ ظالم اور فاسق کیوں نہ ہو۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ اہل اسلام کے اجماع کے مطابق خروج حرام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خروج فساد اور خوں ریزی پیدا کرکے شدید برائی کا سبب بنے گا۔ (صحیح مسلم بشرح نووی ۱۲/۲۲۹)

مذکورہ حکم کی توسیع کرتے ہوئے میرا خیال ہے کہ غیر مسلم حکمراں بھی اگر مذہبی آزادی دئے ہوئے ہو تو اس کے خلاف بھی خروج جائز نہیں۔ کیوں کہ غیر مسلم حکمراں کے خلاف بغاوت میں بھی فتنہ کا ترتب یقینی ہے۔ اور معلوم ہے کہ علت اگر مشترک ہو تو حکم بھی مشترک ہو جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلام آدمی کو status quoist بناتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرصت کار اس کے بغیر ممکن نہیں۔ زندگی میں اصل اہمیت یہ ہے کہ آدمی کو کام کرنے کے مواقع حاصل ہوں۔ مواقع کا ہونا آدمی کو نقطۂ آغاز دیتا ہے اور جب عمل کے لئے نقطۂ آغاز مل جائے تو آدمی جد وجہد کرکے کامیابی کے اگلے مراحل تک پہنچ سکتا ہے۔ اور جب عمل کے لئے نقطۂ آغاز ہی نہ ملے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی حال سے بھی محروم ہو گیا اور نتیجۃً مستقبل سے بھی۔

اس معاملے میں اصل قابل لحاظ بات یہی ہے۔

۱۱ دسمبر ۱۹۹۳

پروفیسر ریاض پنجابی آجکل دہلی میں رہتے ہیں اور جواہرلال نہرو یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اگست ۱۹۹۱ میں وہ ایک امن کانفرنس میں شرکت کے لئے ایمسٹرڈم گئے۔ اس کے بعد انھوں نے چند دن فنلینڈ میں گزارے۔ انھوں نے دیکھا کہ فنلینڈ کی دیواروں پر جگہ جگہ یہ سلوگن لکھا ہوا ہے کہ مسلمانوں سے بچو، وہ سب کے سب خمینی ہیں۔ دیکھو انھوں نے رشدی کے ساتھ کیا کیا:

In the year 1991 in Finland a slogan appeared on the walls: "Beware of Muslims. They are all Khomenis. See what they did to Rushdie."

۱۲ دسمبر ۱۹۹۳

خلیل الجبران ۶ جنوری ۱۸۸۳ کو لبنان میں پیدا ہوا۔ ۱۰ اپریل ۱۹۳۱ کو نیویارک میں اس کی وفات ہوئی۔ تاہم اس کی وصیت کے مطابق، اس کی لاش لبنان لائی گئی اور یہاں اس کے آبائی وطن میں دفن کی گئی۔ خلیل جبران کی قبر پر کسی نے یہ تختی لگا دی تھی: ھٰھنا یرقد بیننا خلیل جبران (یہاں ہمارے درمیان خلیل جبران سو رہے ہیں) مگر بعد کو کچھ لوگ پیدا ہوئے جو اس کے غالی معتقد تھے۔ انھوں نے کہا کہ تختی پر بیننا (ہمارے درمیان) نہیں لکھا ہے بلکہ نبینا (ہمارے نبی) لکھا ہوا ہے۔ انھوں نے اُس کو اس طرح پڑھنا شروع کیا: ھٰھنا یرقد نبینا خلیل جبران۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اندھی عقیدت آدمی کو کیسی کیسی گمراہیوں تک پہنچا دیتی ہے۔

۱۳ دسمبر ۱۹۹۳

اپنے بعض قریبی ساتھیوں پر ۲۰ سال سے میں یہ کوشش کر رہا تھا کہ ان کے اندر موضوعی (objective) اندازِ فکر پیدا ہو۔ مگر میں ناکام رہا۔ میں نے پایا کہ عام حالات میں تو وہ غیر جانب دارانہ انداز میں سوچتے ہیں مگر جب ان کی اپنی ذات زد میں آجائے تو فوراً ان کی موضوعیت ختم ہو جاتی ہے۔ آج ایک صاحب سے اسی قسم کا تجربہ ہوا۔ اس کے بعد

میں نے ان سے کہا: جس دن میری موت آئے گی اس دن ایک جنس (commodity) دنیا سے ختم ہو جائے گی اور پھر غالباً قیامت تک دوبارہ پیدا نہیں ہو گی۔ یہ جنس (objective thinking) ہے۔

۱۴ دسمبر ۱۹۹۳

اگر یہ کہا جائے کہ اسلام انفرادی نجات کا نظریہ ہے تو یہ سننے والوں کو ایک چھوٹی سی بات معلوم ہو گی۔ مگر جب ایک شخص کہتا ہے کہ اسلام عالمی قیادت کا نظریہ ہے تو یہ سننے والوں کو بہت بڑی بات معلوم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی بات کہنے والے کے گرد بھیڑ دکھائی نہیں دیتی۔ جبکہ دوسری بات کہنے والے کے گرد لاکھوں آدمیوں کی بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔

یہ موجودہ دنیا کا سب سے بڑا فتنہ ہے۔ اسی فتنہ کی وجہ سے آج یہ صورتحال ہے کہ بے معنی تحریکوں کی دھوم ہے اور سچی تحریک کے گرد ہر طرف سناٹا دکھائی دیتا ہے۔

۱۵ دسمبر ۱۹۹۳

قرآن کو پڑھئے تو وہ ایک خالص فکری کتاب معلوم ہو گی۔ اس کے بعد فقہ کو پڑھئے تو اسلام ایک قانونی ڈھانچہ کے روپ میں دکھائی دے گا۔ اس کے بعد جب آپ تاریخی کتابیں پڑھتے ہیں تو اسلام فتوحات اور شمشیر زنی کی تاریخ نظر آنے لگتا ہے۔

موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا تجدیدی کام یہ ہے کہ لوگوں کو قرآن والے اسلام کی طرف لوٹایا جائے۔ مگر یہ کام جتنا زیادہ ضروری ہے وہ اتنا ہی زیادہ مشکل بھی ہے۔

۱۶ دسمبر ۱۹۹۳

ایک صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ اپنی ذاتی زندگی میں ہر آدمی پریگمیٹک ہے۔ وہ ہمیشہ خالص معیاری موقف اختیار کرنے کے بجائے عملی موقف اختیار کرتا ہے۔ اس کے بغیر وہ ایک دن بھی موجودہ دنیا میں زندگی گزار نہیں سکتا۔ مگر یہی لوگ ملی معاملات میں پریگمیٹزم کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ ملی معاملات میں وہ ہمیشہ آئیڈیلزم کی بات کرتے ہیں۔

اس تضاد کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ذاتی معاملہ میں ان کا جبلی تقاضا کام کرتا رہتا ہے۔ جب کہ ملی معاملات میں کوئی موقف اختیار کرنے کے لئے آدمی کو اعلان کرنا پڑتا ہے۔ پہلے

موقف کے لئے جبلّت کا زور کافی ہے۔ جب کہ دوسرے معاملہ میں زندہ شعور کی ضرورت ہے۔ جبلّت کا زور تو ہر آدمی کو پیدائشی طور پر حاصل ہے، مگر زندہ شعور سے لوگ عام طور پر محروم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس نقطۂ نظر کو وہ اپنی ذات کے معاملہ میں اختیار کئے ہوئے ہیں اسی نقطۂ نظر کو وہ ملّی امور میں اختیار نہیں کر پاتے۔

۱۷ دسمبر ۱۹۹۳

ایک حدیث میں ہے کہ بہت سے قرآن کی تلاوت کرنے والے ایسے ہیں کہ بظاہر وہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں حالاں کہ قرآن ان پر لعنت بھیجتا ہے (رُبَّ تالٍ یَتْلُو الْقرآنَ وَالقرآنُ یَلْعَنُہ)

یہاں غالباً "تلاوت" سے مراد معروف تلاوت نہیں ہے بلکہ اس سے مراد قرآن کا وہ پڑھنا ہے جب کہ آدمی اپنے نقطۂ نظر کی حمایت میں قرآن کی آیتیں پیش کرتا ہے۔ جب ایسا ہو کہ آدمی ایک ایسی بات کہے جو اس کا ذاتی نظریہ ہو مگر اس کی تائید میں وہ غلط طور پر قرآن کی آیتیں پیش کرے تو قرآن کو اس طرح پڑھنا آدمی کے لئے لعنت کا سبب بن جاتا ہے۔

۱۸ دسمبر ۱۹۹۳

سفیان الثوری (۱۶۱ - ۹۷ ھ) بہت بڑے محدّث تھے۔ خلیفہ منصور عباسی نے ان کو عہدہ دینا چاہا مگر انھوں نے انکار کیا اور اپنے وطن کوفہ کو چھوڑ کر مکہ چلے گئے۔ اس کے بعد خلیفہ مہدی نے ان کو عہدہ دینے کے لئے بلایا مگر وہ بصرہ جا کر چھپ گئے اور اسی حال میں ان کا انتقال ہوگیا۔

سفیان الثوری کا ایک قول ہے: اِنّما الفقہ الرخصۃُ من ثِقَۃٍ۔ اَمّا التشدّد فیُحسِنُہ کلُّ احدٍ۔ یعنی فقہ تو یہ ہے کہ کسی مستند ذریعہ سے دین میں رخصت (آسانی کا پہلو) معلوم کیا جائے۔ جہاں تک شدت پسندی کا تعلق ہے تو اس کا ماہر تو ہر شخص ہوتا ہے۔

۱۹ دسمبر ۱۹۹۳

آجکل مسلمانوں کے اخبارات ورسائل مظالم غیر کی داستانوں سے بھرے رہتے ہیں۔ کراچی کے ماہنامہ الفاروق (ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ) کا صفحہ ۳ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے:

ایک عرصہ گزر چکا کہ مسلمان بحیثیت مجموعی ذلت وخواری کی انتہا کی جانب مائل بہ سفر ہیں۔ ہر آنے والا دن عالم انسانی میں مسلمانوں کی حیثیت کو ایک درجہ کم کرتا چلا جارہا ہے۔ مسلم امت کے مجموعی وقار میں کوئی اضافہ عرصۂ دراز سے تاحال بظاہر محسوس نہیں ہوتا۔"

لاہور کے روزنامہ نوائے وقت (۲ دسمبر ۱۹۹۲) کے ضمیمہ "نئی اڈیشن" میں حسب ذیل الفاظ چھپے ہوئے ہیں: دنیا کی صنعتی واقتصادی ترقی کے لئے ریڑھ کی ہڈی تصور کی جانے والی تیل کی دولت کا بڑا حصہ اسلامی ملکوں کے پاس ہے۔ اس کے علاوہ لوہا، ربڑ، پٹ سن، کپاس، چاول، فاسفیٹ اور دیگر صنعتی خام مال کی بھی اسلامی ملکوں میں بہتات ہے۔ لیکن قدرت کی ان فیاضیوں کے باوجود عالم اسلام اقتصادی، فنی اور سائنسی اعتبار سے مغربی ممالک کا دست نگر ہے ....۔ انگریزوں، فرانسیسیوں، اطالویوں، پرتگالیوں اور ڈچ قوم نے جو استحصالی نظام اپنے پیچھے چھوڑا وہی اب تک مسلم ممالک میں کسی تبدیلی کے بغیر رائج ہے۔"

ان اخباروں اور رسالوں میں عین اسی کے ساتھ اپنے مفروضہ قائد اعظم، اور مفکر اعظم، مصلح اعظم اور مجاہد اعظم کی شان میں بڑے بڑے تعریفی مضامین چھپتے ہیں۔ حالاں کہ اگر عالم اسلام کی مذکورہ تصویر درست ہے تو وہ لوگ اکابر رہنما نہیں تھے جن کو عام طور پر اکابر رہنما شمار کیا جاتا ہے۔ اور اگر یہ افراد اکابر رہنما تھے تو اس کے بعد ملت کی وہ زبوں حالی نہیں ہونی چاہئے تھی جو آج ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔

۲۰ دسمبر ۱۹۹۲

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے: من لم ینفعہ ظنہ لم تنفعہ عینہ (جس کو اس کا گمان نفع نہ دے اس کو اس کی آنکھ بھی نفع نہیں دے سکتی) اس کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی عقل سے بات کو نہ سمجھے وہ دیکھ کر بھی بات کو سمجھ نہیں سکتا۔ وہ دیکھنے کے باوجود حقیقت سے بے خبر رہے گا۔

۲۱ دسمبر ۱۹۹۲

ٹائمس آف انڈیا (۲۱ دسمبر) میں ساؤتھ افریقہ کے بارہ میں ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ سیاہ فام باشندوں کی تنظیم (African National Congress) اور سفید

فام نسل کی تنظیم (Afrikaner People's Front) دونوں میں لمبی بات چیت کے بعد اس پر سمجھوتہ ہوگیا ہے کہ ساؤتھ افریقہ میں (non-racial democracy) قائم کی جائے گی اور اس کے لئے ۲۷ اپریل ۱۹۹۴ کو الکشن کرایا جائے گا۔

ایک قومی تحریک ساؤتھ افریقہ میں چل رہی تھی۔ دوسری قومی تحریک فلسطین میں۔ پچاس سال بعد فلسطین میں تباہی کے سوا کچھ نہیں ملا۔ اور اسی پچاس سال میں ساؤتھ افریقہ کی قومی تحریک کامیاب ہوگئی۔ اس کی واحد فیصلہ کن وجہ یہ ہے کہ فلسطین کی تحریک تشدد کی بنیاد پر چلائی گئی اور ساؤتھ افریقہ کی تحریک عدم تشدد کی بنیاد پر۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ صرف تلوار کی طاقت کو جانتے ہیں، وہ امن کی طاقت کو نہیں جانتے۔ حالاں کہ موجودہ زمانہ میں امن کی طاقت ہی طاقت ہے۔ تلوار اب طاقت کی حیثیت سے اپنا مقام کھوچکی ہے۔

۲۲ دسمبر ۱۹۹۳

روزنامہ قومی آواز (۲۲ دسمبر) میں صفحہ ۲ پر ایک خبر چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے — بابری مسجد کی ۴۴ ویں یادگار ۲۳ دسمبر کو منانے کی شہاب الدین کی اپیل۔ مطبوعہ خبر حسب ذیل ہے:

'بابری مسجد تحریک رابطہ کمیٹی کے کنوینر سید شہاب الدین نے ۲۳ دسمبر ۱۹۹۳ کو بابری مسجد پر غیر قانونی قبضہ کی ۴۴ ویں یادگار منانے کی اپیل کی ہے۔ انھوں نے ایک بیان میں کہا کہ آج سے تقریباً ۴۴ برس قبل ۲۳ اور ۲۴ دسمبر کی درمیانی رات میں وہاں زبردستی رام کی مورتیاں رکھ دی گئی تھیں۔ انھوں نے بابری مسجد کی بحالی تحریک پر یقین رکھنے والی سیکولر طاقتوں سے بھی اپیل کی ہے کہ وہ اس مسئلہ میں صدر جمہوریہ کو میمورنڈم پیش کریں جس میں بابری مسجد کی جگہ مسلمانوں کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہو۔

۲۳ دسمبر ۱۹۹۳

کچھ اسلامی تعلیمات وہ ہیں جن کی انجام دہی کے لئے طاقت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مثلاً نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، وغیرہ۔ اس قسم کے فرائض ہر مسلمان سے شخصی طور پر مطلوب ہیں۔

مگر کچھ اور احکام وہ ہیں جن کی انجام دہی کے لئے طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً جہاد (بمعنی قتال) اور مجرمین کے اوپر سزا کا نفاذ۔ ایسے احکام کا تعلق افراد سے نہیں ہے۔ ان کا تعلق حکمراں سے ہے۔ اگر عام شہری ان احکام کی تعمیل کے لئے کھڑے ہو جائیں تو اس پر انھیں اصلاح کا کریڈٹ نہیں ملے گا بلکہ شریعت کی نظر میں وہ فساد پیدا کرنے کے مجرم قرار پائیں گے۔

سید سابق نے اس سلسلہ میں فقہاء کے مسلک کو اس طرح بیان کیا ہے —— اور فرض کفایہ کی تیسری قسم وہ ہے جس میں حکمراں کا ہونا شرط ہے، مثال کے طور پر جہاد اور حدود شرعی کا نفاذ (والنوع الثالث من الفروض الكفاية ما يشترط فيه الحاكم مثل الجهاد و اقامة الحدود) فقہ السنہ ۳/۲۰

۲۴ دسمبر ۱۹۹۳

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ علماء اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ مرتد کی سزا قتل ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے نہ کہ اتفاقی مسئلہ۔ مثلاً ابراہیم النخعی اور سفیان الثوری کی رائے مرتد کے بارہ میں یہ تھی کہ اس سے ہمیشہ صرف توبہ کا ہی تقاضا کیا جائے گا، اور اس کو کبھی قتل نہیں کیا جائے گا۔ (يُسْتَتَابُ اَبَداً وَلَا يُقْتَلُ)

توبہ طلب کرنے کا مطلب صرف یہ نہیں کہ مرتد کے پاس جا کر اس سے کہا جائے کہ تم توبہ کر لو۔ اس میں اس کی اصلاح کے تمام ذرائع شامل ہیں۔ مثلاً اس سے یہ معلوم کیا جائے کہ اس نے کس بنا پر ارتداد کیا ہے اور پھر اس پر کتاب لکھ کر اس کے شبہہ کا مدلل جواب دیا جائے۔

۲۵ دسمبر ۱۹۹۳

امام الشافعی کا قول ہے کہ: من اراد الدنيا فعليه بالعلم ومن اراد الآخرة فعليه بالعلم (جو شخص دنیا چاہتا ہو اس کو علم حاصل کرنا چاہئے اور جو شخص آخرت چاہتا ہو اس کو بھی علم حاصل کرنا چاہئے۔)

بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ دنیا کے لئے علم کی ضرورت ہے۔ مگر آخرت کے لئے علم کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر یہ ایک بے بنیاد بات ہے۔ اس دنیا میں ہر کامیابی کا تعلق شعور سے ہے شعور جتنا زیادہ پختہ ہوگا اتنی ہی زیادہ ترقی آدمی کو ملے گی۔ خواہ دنیا کی ترقی کا معاملہ ہو یا

آخرت کی ترقی کا معاملہ۔

۲۶ دسمبر ۱۹۹۲

بخاری میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ وسلم نے فرمایا کہ میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا۔ (لا آکل متکئاً) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹیک لگا کر کھانا اسلامی طریقہ کے خلاف ہے۔ لیکن اگر کوئی بیمار آدمی جس کو سیدھے بیٹھنا مشکل ہو وہ ٹیک لگا کر کھائے تو یہ خلاف سنت نہیں ہوگا۔ کیونکہ ایسے آدمی کا کیس اضطرار کا کیس بن گیا۔ اور مضطر کو ہر چیز میں رخصت دی گئی ہے۔

اسی اصول کو ایک شاعر نے اس طرح بیان کیا کہ ہر سخن موقع وہر نکتہ مکانے دارد۔ چھوٹے چھوٹے معاملات میں اس اصول کو ہر عالم جانتا ہے۔ مگر بڑے امور میں اس اصول کو کوئی عالم نہیں جانتا۔ مثلاً موجودہ زمانہ میں ہر عالم مسلمانوں کو جہاد اور قتال کی آیت سنا رہا ہے۔ حالانکہ آج مسلم امت جس حال میں ہے اس پر جہاد وقتال کا شرعی حکم منطبق ہی نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اپنی داخلی کمزوریوں کی بنیاد پر وہ اس پوزیشن میں ہی نہیں کہ جہاد وقتال کر سکے۔

۲۷ دسمبر ۱۹۹۳

تقویٰ کا تعلق بھی شعور سے ہے۔ شعور جتنا زیادہ بڑھا ہوا ہوگا، اتنا ہی زیادہ تقویٰ بھی آدمی کو حاصل ہوگا۔ مثال کے طور پر ایک آدمی کے پاس گھر نہیں۔ وہ اپنے آپ کو سماج میں بے جگہ پا رہا ہے۔ ایسا آدمی بہت دعا کرے گا۔ وہ خدا کے سامنے روئے گا۔ مگر جب اس کو گھر مل جائے تو وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔ اب اس کا تقویٰ ختم ہو جاتا ہے۔

اس کی وجہ اس آدمی کے شعور کی کمی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میرے پاس گھر نہیں تو میں بے جگہ ہوں۔ گھر ہو جائے تو میں جگہ والا ہو جاؤں گا۔ مگر جس آدمی کا شعور بڑھا ہوا ہو اس کو اگر ساری زمین دے دی جائے تب بھی اس کا تقویٰ ختم نہیں ہوگا۔ کیوں کہ اس کا شعور اس کو بتا رہا ہوگا کہ زمین کی چیزیں خواہ میری تحویل میں ہوں مگر پھر بھی میرے لئے خوف کا مسئلہ ختم نہیں ہوا۔ کیونکہ وسیع خلا میں گھومتی ہوئی زمین کو سنبھالے رکھنے کے لئے تو پھر بھی مجھے خدا کی ضرورت ہے۔ زمین کا قیوم تو پھر بھی خدا ہی ہے۔ ایک لمحہ کے لئے بھی اگر

خدا اپنی قیومیت کو واپس لے لے تو اس کے بعد کوئی بھی چیز مجھ کو تباہی سے بچانے والی نہیں۔

۲۸ دسمبر ۱۹۹۳

بنگلور میں ایک سیمنار ہو رہا ہے۔ اس کا دعوت نامہ میرے پاس آیا ہے۔ اس کا عنوان ہے ـــــــ کیا چیزیں ہندستانی قومیت کی تشکیل کرتی ہیں:

What constitutes Indian nationalism?

کیسی عجیب بات ہے کہ ۱۹۴۷ سے آج تک یہی طے نہیں ہوا کہ ہندستانی قومیت کے اجزا ترکیبی کیا ہیں۔ میرے نزدیک اس کی سادہ وجہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں لوگوں کا ذہن صاف نہیں ہے۔

اس معاملہ میں سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو جانا جائے۔ ہندستانی سماج میں، دوسرے تمام سماجوں کی طرح، کچھ چیزیں مشترک ہیں اور کچھ چیزیں غیر مشترک۔ مثلاً ملک کا تحفظ ایک مشترک قدر ہے۔ اس کا احساس سب کے اندر یکساں طور پر ہونا چاہئے۔ مگر لباس کی وضع مشترک چیز نہیں۔ اس میں ایک اور دوسرے کے درمیان فرق ہو سکتا ہے۔

آزادی کے بعد جو دستور ساز اسمبلی بنی اس میں ملک کے تمام اعلیٰ دماغ شامل تھے۔ مگر مجھے شبہ ہے کہ اس "فرق" کے معاملہ میں ان کا ذہن صاف نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جو دستور بنایا اس میں غیر ضروری طور پر کامن سول کوڈ کا آرٹیکل درج کر دیا۔ حالانکہ کسی سماج کا شادی بیاہ کا طریقہ غیر مشترک امور (Non-commons) سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ مشترک امور (Commons) سے۔

۲۹ دسمبر ۱۹۹۳

تُعرَف الاشیاء باضدادها (چیزیں اپنے ضد سے پہچانی جاتی ہیں) کا اصول معاملات کی گہرائی کو سمجھنے کے لئے بہترین اصول ہے۔ مثال کے طور پر قدیم مکہ میں جب رسول اور اصحاب رسول کو ستایا جا رہا تھا، اس وقت بظاہر یہ حکم اترنا چاہئے تھا کہ یہ لوگ تمہارے اوپر ناحق ظلم کر رہے ہیں۔ تم ان کے ظلم کو ختم کرنے کے لئے ان کے خلاف جنگ کرو، خدا تمہارے

ساتھ ہے۔

مگر ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ قرآن میں یہ آیت اتری کہ اِنَّ ارضی واسعۃ (العنکبوت ۵۶) اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی مسلم گروہ کو مکہ جیسے حالات پیش آئیں تو اس کو یہ نہیں کرنا ہے کہ فریق ثانی کو ظالم بتا کر اس سے لڑ جائے۔ بلکہ اس کے بجائے اسے پر امن تدبیر کے انداز میں اس کا حل تلاش کرنا چاہئے۔

۳۰ دسمبر ۱۹۹۲

امریکہ میں میری ملاقات کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں سے ہوئی۔ وہاں انھوں نے ایک مسلم تھنک ٹینک (Muslim Think Tank) بنایا ہے۔ بہت سے دماغوں نے کئی سال کی تحقیق کے بعد ایک رپورٹ تیار کی ہے۔ اس کی ایک کاپی انھوں نے مجھے دی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلم قوموں کو دوبارہ اٹھانے کے لئے ہمیں مغرب کی ترقی یافتہ قوموں کے نمونہ پر ایک اسٹریٹجی بنانا ہے۔ مثلاً مسلم ملکوں کے درمیان ناٹو (NATO) جیسا ایک معاہداتی ادارہ قائم کرنا، وغیرہ۔

میں نے کہا کہ موجودہ حالت میں ہم مغربی ملکوں کے پیٹرن پر کوئی عملی پروگرام نہیں بناسکتے۔ کیوں کہ ان قوموں نے طویل جدوجہد کے ذریعہ جو انفراسٹرکچر تیار کیا ہے وہ ہمارے پاس سرے سے موجود نہیں۔ ہم کو تو آغاز سے چلنا ہے۔ جب کہ وہ لوگ اختتام سے چلنے کی پوزیشن میں ہیں۔ میں نے کہا کہ موجودہ حالات میں ہمارا واحد پروگرام صرف ایجوکیشن ہوسکتا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور چیز سرے سے قابل عمل ہی نہیں۔ دوسرے تمام پروگرام صرف خوش فہمی ہیں نہ کہ فی الواقع کوئی پروگرام۔

۳۱ دسمبر ۱۹۹۲

قرآن میں ہے کہ لقد کان لکم فی رسول اللّٰہِ اسوۃ حسنۃ (۲۱ الاحزاب) ظاہر ہے کہ یہ اسوہ حسنہ محدود معنوں میں نہیں ہے بلکہ زندگی کے تمام معاملات کے لئے ہے۔ مگر اس اسوہ کو جاننا سنت رسول کے گہرے مطالعہ کے بغیر ممکن نہیں۔

مثلاً ہجرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت ہے۔ کچھ لوگوں نے اس کو بس مکہ سے مدینہ جانے کے ہم معنی سمجھ لیا۔ انھوں نے مدینہ کا نام دار الہجرت رکھ دیا اور ترک وطن کرکے

مدینہ چلے گئے تاکہ ہجرت والا ثواب حاصل کر سکیں۔ مگر یہ ہجرت کی تصغیر ہے۔

اس وقت مکہ اور مدینہ دونوں جگہ کے لوگ مشرک تھے لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو دونوں میں ایک فرق تھا۔ مکہ والوں کے لئے شرک ایک مادی انٹرسٹ کا معاملہ تھا۔ مقامی طور پر ان کے لئے آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس لئے انھوں نے تمام عرب قبائل کے بت کعبہ میں رکھ لئے۔ تاکہ وہ آکر نذرانہ دیں اور مکہ والوں کو گھر بیٹھے آمدنی ہوتی رہے۔ اس کے برعکس مدینہ میں زراعت اور باغبانی تھی۔ اس لئے شرک ان کے لئے صرف ایک آبائی رسم تھی نہ کہ مکہ والوں کی طرح تجارتی انٹرسٹ۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ والوں نے دعوت توحید کی سخت مخالفت کی، جبکہ مدینہ والوں نے کسی مزاحمت کے بغیر اس کو قبول کر لیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے زمانہ قیام میں کچھ مقری (مبلغ) مدینہ بھیجا۔ غالباً اس لئے کہ وہاں کی قبولیت کا اندازہ ہو سکے۔ جب معلوم ہوا کہ مدینہ والوں میں، مکہ کے برعکس قبولیت کا مادہ موجود ہے تو آپ خاموشی سے مکہ کو چھوڑ کر مدینہ چلے گئے۔ اس طرح یہ ہجرت گویا کم مواقع کی جگہ سے نکل کر زیادہ مواقع والی جگہ کی طرف جانے کے ہم معنی تھی۔

۱۹۹۴

یکم جنوری ۱۹۹۴

یکم جنوری کو میں امریکہ میں تھا۔ امریکہ میں آپ جدھر جائیں، آپ کو ہر طرف زرق برق کاریں اور شاندار مکانات دکھائی دیں گے۔ بظاہر ایسا معلوم ہو گا کہ یہاں سب اعلیٰ دولت مند لوگ رہتے ہیں۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہاں ہر چیز سودی قرض پر مل جاتی ہے۔ خواہ مکان ہو یا کار، ہو یا فرنیچر یا کوئی اور چیز۔ چنانچہ لوگ اپنی حقیقی آمدنی سے زیادہ حیثیت کی چیزیں سودی قرض کی بنیاد پر حاصل کر لیتے ہیں اور پھر ساری زندگی کما کما کر اس کی قسطیں ادا کرتے رہتے ہیں۔

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگ اس زندگی میں خوش کیسے رہتے ہیں۔ میرا تو حال یہ ہے کہ میں نے اپنی ساری زندگی میں کبھی قرض نہیں لیا۔ چند روپیہ کا بلا سودی قرض بھی میرے اوپر ہو تو مجھ کو نیند نہیں آئے گی، اور آپ لوگوں کا حال یہ ہے کہ سودی قرضوں میں گویا نہائے ہوئے ہیں۔ پھر بھی آپ لوگ سکون کی زندگی گزار رہے ہیں۔

۲ جنوری ۱۹۹۴

حافظ افضال احمد صاحب ملاقات کے لئے آئے۔ وہ فیروز آباد کے رہنے والے ہیں۔ اور چوڑیوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ وہ الرسالہ خود بھی پڑھتے ہیں اور دوسروں کو بھی پڑھاتے ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ ۱۹۷۲ میں فیروز آباد میں فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا۔ اس وقت وہاں کے مسلمانوں نے مسلم یونیورسٹی کے سوال پر یوم سیاہ منایا تھا۔ لوگ اپنے ہاتھ میں کالی پٹیاں باندھ کر سڑکوں پر نکل آئے۔ اس دوران کچھ مسلم نوجوان پولیس کی ایک ٹولی کو دیکھ کر جوش میں آگئے اور اس کے اوپر پتھراؤ کر دیا۔ اس کے بعد پولیس نے گولی چلائی۔ اس کے نتیجہ میں کچھ مسلمان مارے گئے۔ اس کے بعد فیروز آباد میں فرقہ وارانہ فساد بھڑک اٹھا۔ اس میں مسلمانوں کا بہت زیادہ جانی اور مالی نقصان ہوا۔ اس کے برے اثرات وہ عرصہ تک مختلف صورتوں میں بھگتتے رہے۔

انھوں نے بتایا کہ اس کے ۲۰ سال بعد ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو اجودھیا کی بابری مسجد ڈھائی گئی تو ٹنشن پیدا ہوا۔ انتظامیہ نے احتیاطی طور پر فیروز آباد میں کرفیو لگا دیا۔ اس دوران

دوبارہ ایسا ہوا کہ پولیس والے پٹرولنگ پر آئے تو ان کو دیکھ کر مسلم نوجوان جوش میں آگئے۔ انھوں نے پولیس پر پتھر پھینکنا چاہا۔ مگر اس بار ہمارے بڑے فوراً حرکت میں آگئے۔ انھوں نے مسلم نوجوانوں کو پتھر پھینکنے سے روک دیا۔ چنانچہ اس بار ٹنشن کے باوجود، فیروزآباد میں کوئی فساد نہیں ہوا۔ ۱۹۷۲ میں فیروزآباد کے مسلمان ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کرکے برباد ہو گئے تھے۔ مگر اب انھوں نے اعراض کی پالیسی اختیار کرلی ہے۔ چنانچہ اب وہ ہر شعبہ میں ترقی کررہے ہیں۔ مثال کے طور پر آج فیروزآباد میں ماروتی کار سب سے زیادہ مسلمانوں کے پاس ہے۔ وغیرہ

۳ جنوری ۱۹۹۴

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں موسیٰؑ کے مقالہ میں بتایا گیا ہے کہ آخری زمانہ میں حضرت موسیٰ پہاڑ پر چڑھے۔ یہودیوں نے اس کے بعد کبھی موسیٰ کو نہیں دیکھا۔ ان کی موت اور تدفین پراسرار بن کر رہ گئی:

The Hebrews never saw him again, and the circumstances of his death and burial remain shrouded in mystery. (12/490)

پچھلے تمام پیغمبروں کے ساتھ یہی صورت پیش آئی۔ ہمارے عقیدہ کے مطابق بلاشبہہ وہ اللہ کے پیغمبر تھے۔ مگر خالص تاریخی معیار کے مطابق، ان کے واقعات ثابت شدہ نہیں۔ اس عموم میں صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا استثنا ہے۔ آپ کی شخصیت مکمل طور پر ایک تاریخی شخصیت ہے نہ کہ صرف اعتقادی شخصیت۔

پیغمبر اسلام اور دوسرے پیغمبروں کا یہ فرق اس لئے نہیں ہے کہ مسلمان اس پر فخر کریں۔ وہ اس سے برتری کی غذا حاصل کریں۔ یہ فرق صرف دعوتی ضرورت کے لئے ہے۔ وہ اس لئے ہے تاکہ دعوت کا کام زیادہ آسانی کے ساتھ انجام پاسکے۔

۴ جنوری ۱۹۹۴

مکہ سے نکلنے والے عربی اخبار العالم الاسلامی کے شمارہ ۱۹ دسمبر ۱۹۹۳ میں ایک انٹرویو چھپا ہے۔ یہ انٹرویو مصر کے الشیخ منصور الرفاعی کا ہے۔ اس انٹرویو میں ان کے ایک جواب کو

ان الفاظ میں عنوان بنایا گیا ہے: المسلمون دعاة محبة وسلام وكل مايلصق بهم من تهم هي من صنع أعدائهم۔ (مسلمان محبت اور امن کے داعی ہیں اور جو الزامات ان پر لگائے جاتے ہیں وہ سب کے سب ان کے دشمنوں کے گھڑے ہوئے ہیں)

شیخ کی یہ بات صحیح ہو تو وہ کلام اللہ کی تردید ہوگی۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ اگر تم دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کرو تو دشمن بھی تمہارا دوست بن جائے گا۔ اور یہاں یہ صورت حال ہے کہ، شیخ کے بقول، امن اور محبت کا پیکر بننے کے باوجود ساری دنیا ان کی دشمن بنی ہوئی ہے۔

ان لوگوں کے کلام میں اس تضاد کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اسلام اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کا مترادف سمجھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں جس آئیڈیل کی تعلیم دی گئی ہے اس پر عملاً سارے مسلمان قائم ہیں۔ وہ مسلمانوں کی تصویر کشی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کرتے ہیں نہ کہ خود مسلمانوں کی واقعی زندگی کی روشنی میں۔

۵ جنوری ۱۹۹۴

امریکہ میں ایک مسلمان مجھے اپنے گھر لے گئے۔ وہ سخت پریشان تھے۔ ان کا کاروبار ختم ہو گیا تھا۔ سودی قرضوں کی ادائیگی کا مسئلہ سوہان روح بنا ہوا تھا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے عافیت اور خوش حالی کی دعا بتائیے۔ میں نے ایک دعا لکھ کر دے دی۔ بعد کو ان کے ایک سگے رشتہ دار سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا مسئلہ اس لئے بگڑا کہ امریکہ آنے کے بعد ابھی انھیں معاشی استحکام حاصل نہیں ہوا تھا کہ انھوں نے حج کا پروگرام بنالیا۔ اپنی والدہ کو پاکستان سے بلایا اور پھر دونوں یہاں سے حج کرنے کے لئے گئے۔ حج کا پورا خرچ انھوں نے سودی قرض کے ذریعہ حاصل کیا تھا۔ حج کے لئے جانے سے پہلے ان کا کام آگے بڑھ رہا تھا۔ مگر مذکورہ قسم کے حج نے ان کی معاشیات کو تباہ کر دیا۔

میں نے کہا کہ پھر تو ان کے لئے توبہ کا مسئلہ ہے نہ کہ دعا کا۔ انھیں سب سے پہلے اپنی غیر ذمہ دارانہ روش کو ختم کرنا چاہئے۔ محض دعا کے الفاظ دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

۶ جنوری ۱۹۹۴

میرا تجربہ ہے کہ آدمی کے لئے سب سے زیادہ مشکل چیز اعتراف ہے۔ خاص طور پر

وہ اعتراف جس میں اس کی اپنی ذات کی نفی ہو رہی ہو۔ کسی کو اس قسم کے اعتراف کا موقع ملنا سب سے بڑی نیکی کا موقع ملنا ہے۔ کیوں کہ آدمی جب ایک ایسی حقیقت کا اعتراف کرتا ہے جس میں اس کی ذات کی نفی ہو رہی ہو تو یہ نفی کسی اور کے مقابلہ میں نہیں ہوتی بلکہ خدا کے مقابلہ میں ہوتی ہے۔ سچی حقیقت کا اعتراف خدا کا اعتراف ہے اور اس کے مقابلہ میں اپنی نفی خدا کے مقابلہ میں اپنی نفی۔ اور بلاشبہہ خدا کے مقابلہ میں اپنی ذات کی نفی کرنے سے زیادہ بڑا عمل اور کوئی نہیں۔

۷ جنوری ۱۹۹۳

دنیا میں سب سے زیادہ افراط کے ساتھ جو چیز پائی جاتی ہے وہ ناقص رائے ہے۔ اس کی مثال میرے نزدیک روزانہ آتی رہتی ہے۔ مثلاً ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان سے گفتگو ہو رہی تھی۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان کے مسائل کا حل یہ ہے کہ ایک شخص ڈکٹیٹر بن کر بیٹھ جائے۔ تاریخ میں تمام بڑے بڑے کام اسی طرح ہوتے ہیں۔ مثلاً خود پیغمبر اسلام ایک شخص تھے۔ انھوں نے اتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔

یہ سیرت کا ایک ناقص مطالعہ ہے۔ کیوں کہ پیغمبر اسلام نے جو کچھ کیا وہ محض ایک فرد کی حیثیت سے نہیں کیا۔ آپ کے ساتھ لائق انسانوں کی ایک بہترین ٹیم تھی جس کی تعداد آخر زمانہ میں ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔ صحابہ کو حذف کر کے سیرت کا مطالعہ کرنا صرف ناقص مطالعہ ہے۔ وہ صحیح مطالعہ نہیں۔

۸ جنوری ۱۹۹۴

میں ۲۲ دسمبر ۹۳ کو امریکہ کے لئے روانہ ہوا تھا۔ آج صبح وہاں سے واپس آیا۔ امریکہ میں تقریباً چھ ملین مسلمان آباد ہیں۔ اتنی ہی تعداد میں وہاں ہندو بھی بسے ہوئے ہیں۔ مگر وہاں کے ہندو ہر اعتبار سے مسلمانوں سے آگے ہیں۔ وہ زیادہ بڑا بزنس کرتے ہیں۔ ان کے اخبارات زیادہ اعلیٰ معیار کے نکلتے ہیں۔ ان کے مذہبی مراکز مسلمانوں سے کہیں زیادہ بڑے ہیں۔ تعلیم کے میدان میں وہ مسلمانوں سے بہت زیادہ آگے ہیں۔ باہمی اتحاد بھی ان میں زیادہ پایا جاتا ہے۔

ہندستان کے مسلمانوں کا کہنا ہے کہ وہ تعصب اور فرقہ واریت کی وجہ سے یہاں ترقی نہیں کر سکتے۔ مگر امریکہ میں تو تعصب اور فرقہ واریت کا کوئی وجود نہیں۔ وہاں تو ہر ایک کو بالکل یکساں

آزادی حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان عام طور پر محنت نہیں کرتے، اسی لئے وہ ہر جگہ دوسروں سے پیچھے ہو گئے ہیں۔

۹ جنوری ۱۹۹۴

صحیح مسلم کی ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم جزیرہ عرب میں غزوہ کروگے اور اللہ اس پر فتح دے گا۔ اور پھر تم فارس سے غزوہ کروگے اور اللہ اس پر فتح دے گا۔ پھر تم روم سے غزوہ کروگے اور اللہ اس پر فتح دے گا۔ پھر تم دجال سے غزوہ کروگے اور اللہ اس پر فتح دے گا۔ (تغزون جزیرۃ العرب فیفتحها اللہ ثم فارس فیفتحها اللہ ثم تغزون الروم فیفتحها اللہ ثم تغزون الدجال فیفتحہ اللہ) مشکاۃ المصابیح ۱۴۹۲/۳

اس حدیث کو اگر اس کے ظاہر مفہوم کے اعتبار سے لیا جائے تو اس میں صرف تین غزوات کو اسلام کی تصدیق حاصل ہے۔ ایک وہ جو زمانۂ رسالت میں عرب میں کیا گیا تاکہ جزیرہ عرب کو شرک سے پاک کر دیا جائے۔ دوسرا وہ جو خلافت راشدہ کے زمانہ میں ساسانی ایمپائر اور بازنطینی ایمپائر سے کیا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ جبر کے نظام کا خاتمہ کیا جائے۔ تیسرا وہ جو دور آخر میں فتنۂ دجال کے ظہور کے بعد پیش آئے گا۔ گویا کہ روم و ایران کی شہنشاہیت کے خاتمہ کے بعد پچھلے ہزار سال میں جو مختلف جنگیں کی گئیں وہ شرعی جنگیں نہ تھیں۔ وہ مسلمانوں کی قومی جنگیں تھیں۔ دور اول کے بعد اب صرف ایک ہی شرعی جنگ ہونا باقی ہے اور وہ دجال سے جنگ ہے۔ مزید یہ کہ ایک اور روایت کے مطابق دجال سے جنگ تلوار کے ذریعہ نہیں ہوگی بلکہ لا الٰہ الا اللہ کے ذریعہ ہوگی۔ گویا کہ یہ آخری جنگ بھی نظریہ کے میدان میں ہوگی نہ کہ ہتھیار کے میدان میں۔ (مشکاۃ المصابیح ۱۴۹۴/۳)

۱۰ جنوری ۱۹۹۴

ایک "انقلابی جماعت" کے جلسہ میں شریک ہوا۔ ایک نوجوان نے بڑے جوش و خروش سے ایک نظم پڑھی۔ اس کا ایک مصرعہ یہ تھا:

میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی

میں نے سوچا کہ موجودہ زمانہ الفاظ کے فتنہ کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں بے بنیاد بات کو بھی

اتنے خوبصورت الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے کہ آدمی اس کو سن کر مسحور ہو جائے۔ جلسہ میں تمام لوگوں نے اس شعر (میری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی) کی خوب داد دی۔ حالاں کہ عملی انطباق کے اعتبار سے نوجوانوں کو یہ کہنا چاہئے کہ میری زندگی کا مقصد ہے ترے دیں کی سرفرازی کے نام پر اپنی سرفرازی کا لایعنی ہنگامہ کھڑا کرنا۔

۱۱ جنوری ۱۹۹۴

قرآن میں یہود کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ وہ ظالموں کا تذکرہ کرکے ان سے لڑنے کی باتیں کرتے تھے۔ مگر جب انہیں ان ظالموں سے بالفعل لڑنے کا حکم دیا گیا تو چند ایک کو چھوڑ کر کوئی بھی لڑنے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ (البقرہ ۲۴۶)

آجکل مسلمانوں کا حال یہی ہو رہا ہے۔ موجودہ مسلمانوں کی تحریروں کو پڑھئے یا ان کی باتوں کو سنئے تو ہر جگہ ظالموں کا تذکرہ ہوگا اور ان سے ٹکراؤ کی باتیں کی جا رہی ہوں گی۔ مگر عملی طور پر ظالموں سے لڑنے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں۔ مثال کے طور پر ہندستان میں ہر مسلمان" بابری مسجد دوبارہ وہیں بناؤ" کی بولی بول رہا ہے۔ لیکن اگر ان سے کہئے کہ ہندو لاکھوں کی تعداد میں اجودھیا گھس گئے اور انھوں نے بابری مسجد کو توڑ کر وہاں عارضی مندر بنا دیا تم بھی لاکھوں کی تعداد میں اجودھیا میں داخل ہو جاؤ اور مندر کو توڑ کر وہیں دوبارہ بابری مسجد تعمیر کر دو۔ ایسی کال دی جائے تو عوام وخواص میں سے کوئی بھی اس کے لئے اپنے گھروں سے نکلنے والا نہیں۔

حدیث میں ہے کہ یہود اگر کسی گوہ کے بل میں گھسے ہیں تو تم بھی وہیں گھسو گے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ جو کچھ انھوں نے کیا وہی سب تم بھی کرو گے۔ مذکورہ معاملہ بھی اسی کی ایک مثال ہے۔

۱۲ جنوری ۱۹۹۴

آرمی ٹریننگ میں زیر تربیت فوجیوں کو جو باتیں بتائی جاتی ہیں ان میں سے ایک بات یہ ہوتی ہے کہ لڑائی میں آپ کو یہ نہیں بھولنا ہے کہ آپ کا مقصد مرجانا نہیں ہے بلکہ آئندہ کے لئے بھی زندہ رہنا ہے۔ برا فوجی لڑائی کے پہلے ہی دن اپنے کو ہلاک کر لیتا ہے۔ مگر اچھا فوجی

اگلے دن لڑنے کے لئے اپنے آپ کو زندہ رکھتا ہے:

A bad soldier dies on the first day; a good soldier lives to fight for the second day.

موجودہ زمانہ کے نام نہاد مجاہدین اس حقیقت سے آخری حد تک بے خبر ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بس لڑکر مر جانے سے دلچسپی ہے۔ انھیں اس کا شعور نہیں کہ اصل کام لڑائی کو کامیابی کے مرحلہ تک پہنچانا ہے نہ کہ لڑ بھڑ کر اپنا خاتمہ کرلینا۔

۱۳ جنوری ۱۹۹۴

حدیث میں ہے کہ خیر الامور اوسطہا (معاملات میں سب سے بہتر اس کا بیچ ہے) سادہ طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ انتہا پسندی کے بجائے اعتدال پسندی کا راستہ اختیار کرنا۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس میں ثنائی طرز فکر (dichotomous thinking) کی تردید ہے۔ بیشتر لوگوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ صرف دو انتہائی موقف کو سمجھ پاتے ہیں۔ مثلاً ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ نزاعی معاملہ میں یا تو لڑ جانا ہے یا بزدل بن کر چپ بیٹھنا۔ حالانکہ وہاں ایک درمیانی موقف بھی ہوتا ہے۔ اور وہ ہے ٹکراؤ سے اعراض کرتے ہوئے اپنے داخلی استحکام کی تدبیر کرنا۔

آجکل جو مسلمان میری مخالفت کرتے ہیں وہ زیادہ تر اسی بنیاد پر کرتے ہیں۔ غیر مسلموں سے میں نزاعی امور میں صبر و اعراض کی بات کرتا ہوں۔ یہ صبر و اعراض در اصل مذکورہ معنوں میں "درمیانی موقف" کے لئے ہوتا ہے۔ مگر وہ چونکہ درمیانی موقف کو نہیں جانتے اس لئے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ میں بزدلانہ پسپائی کی بات کرتا ہوں۔ اپنے ثنائی طرز فکر کی بنا پر وہ کسی تیسرے موقف کو سمجھنے سے قاصر ہو گئے ہیں۔

۱۴ جنوری ۱۹۹۴

اکتوبر ۱۹۹۲ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ اور آل انڈیا ملی کونسل کے لوگوں کا اجتماع جے پور میں ہوا۔ وہاں انھوں نے یہ تجویز پاس کی کہ پورے ملک میں اسلامی عدالت کا نظام قائم کیا جائے گا تاکہ مسلمان اپنے مقدمات کے لئے اس سے رجوع کریں۔ اس کے بعد ان لوگوں

نے دہلی میں پریس کانفرنس کر کے اس کا اعلان کیا۔ یہ اعلان انگریزی اخبارات میں اس طرح چھپا کہ مسلم لیڈروں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ملک میں اسلامک کورٹ کا متوازی نظام قائم کریں۔ اس کے بعد اخباروں میں اس کے خلاف کافی خطوط اور مضامین اور تبصرے شائع ہوئے۔

جامعہ ہمدرد کے دو استاد ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ اس اخباری بحث کے دوران دہلی کے کچھ اردو اخبار کے نمائندے مذکورہ کونسل کے لیڈر صاحب سے ملے۔ اور ان سے کہا کہ ہندستان میں پہلے سے مسلمانوں کے نزاعات کو حل کرنے کے لئے دارالافتار اور دارالقضار ہر جگہ کھلے ہوئے ہیں۔ پھر آپ نے اسلامی عدالت قائم کرنے کا اعلان کیوں کیا۔ لیڈر صاحب نے جواب دیا:

ہم نے دشمن کے خیمہ میں ایک ڈھیلا پھینکا جو ٹھیک نشانہ پر جا کر لگا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں اٹھنے والے مسلم لیڈر کتنے سطحی تھے۔ اپنی اسی سطحیت کی وجہ سے انھوں نے مسلمانوں کے معاملات کو صرف بگاڑا، وہ کسی بھی معاملہ کو بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

۱۵ جنوری ۱۹۹۴

کشمیر کے مسئلہ میں میرا نقطۂ نظر وہاں کے جنگجو مسلمانوں کو پسند نہیں۔ چنانچہ انھوں نے میرے قتل کی دھمکی شائع کر دی۔ اس کے بعد حکومت ہند کے محکمۂ داخلہ نے میری رہائش گاہ پر سیکورٹی لگا دی ہے۔ ایک پولیس افسر سے میں نے کہا کہ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے یہ سپاہی جنگجوؤں کے مقابلہ میں میری حفاظت کر سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سیکورٹی اگر محافظ بن سکتی تو اس ملک میں اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کا قتل نہ ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ اس قسم کی سیکورٹی ایک مانع طاقت (deterrent force) کا کام کرتی ہے۔ یہ بات مجھے ٹھیک معلوم ہوتی ہے، اور یہ وہی بات ہے جس کو قرآن میں قوت مرہبہ (الانفال ۶۰) کہا گیا ہے۔

۱۶ جنوری ۱۹۹۴

مسٹر ارن شرما (۴۶ سال) ایک انگلش جرنلسٹ ہیں۔ وہ ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے کہا کہ اجودھیا کے مسئلہ کے بارہ میں آپ کے فارمولا پر میری بات مسٹر دوا (اڈیٹر ہندستان ٹائمس)

سے ہوئی ۔ وہ تعصب کی حد تک آپ کے فارمولے کے حامی ہیں۔ مگر میرا کہنا ہے کہ آپ کے فارمولے میں ایک بہت بڑی کمزوری ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ اس معاملہ میں شریک ہندو لیڈر یہ ڈکلریشن جاری کریں کہ بابری مسجد کے بعد اب وہ کاشی، متھرا یا کسی اور مسجد کا سوال نہیں اٹھائیں گے۔ اگر موجودہ ہندو لیڈر اس قسم کے اعلان پر دستخط کر دیں تب بھی اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ آئندہ اٹھنے والے ہندو کہہ دیں کہ ہم اس اعلان کے پابند نہیں ہیں۔ اور اس کے بعد وہ دوسری مسجدوں کا چیپٹر کھول دیں۔

میں نے کہا کہ میرا اصل اعتماد خود ڈیکلریشن کے الفاظ پر نہیں ہے۔ بلکہ ڈیکلریشن کے بعد پیدا ہونے والی فضا پر ہے۔ اگر ایک بار ایسا ڈیکلریشن جاری ہو جائے تو اس کے بعد یہ ہوگا کہ ہندو مسلم تناؤ ختم ہو کر دونوں کے درمیان نارمل حالت قائم ہو جائے گی۔ یہی نارمل حالت میرے نزدیک سب سے بڑا چیک ہے۔ کیوں کہ بابری مسجد کو مسٹر ہندو نے نہیں توڑا بابری مسجد کو مسٹر ایگو نے توڑا۔ کچھ نا اہل مسلم لیڈروں نے بھڑکاؤ کی سیاست چلا کر ہندو کے فطری ذہن کو ڈسٹرب کر دیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندو کو دوبارہ اس کے فطری ذہن کی طرف لوٹا دیں۔ آپ صرف اتنا کیجئے کہ ہندو کو اس کی نارمل حالت پر پہنچا دیجئے اس کے بعد مسجد توڑنے کا سلسلہ اپنے آپ ختم ہو جائے گا، الّا یہ کہ کوئی نادان مسلم لیڈر دوبارہ ہندو کو بھڑکا کر پھر اس کو نارمل حالت سے ہٹا دے۔

۱۷ جنوری ۱۹۹۴

پاکستانی تحریک کے زمانہ میں اگست ۱۹۴۱ میں مسٹر محمد علی جناح نے عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد) کے طلبہ کے سامنے تقریر کی۔ اس تقریر میں انھوں نے کہا کہ پاکستان کے قیام کا مطالبہ ہم اس لئے کر رہے ہیں تاکہ ہم اسلام کی بنیاد پر ایک حکومتی نظام قائم کر سکیں۔ اسلامی حکومت قرآن کا ایک حکم ہے۔ اس قسم کی ایک حکومت قائم کرنے کے لئے علیحدہ ملک لازمی طور پر ضروری ہے:

Islamic government is the rule of the Quranic injunctions and principles. For the establishment of such government a separate country or a state is a must. *Speeches and Writings of Mr. Jinnah*, p.

197

پاکستان کے تصور کے بارہ میں ٹھیک یہی ذہن اقبال، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور بہت سے دوسرے لوگوں کا تھا۔ حالاں کہ یہ سراسر بے بنیاد تصور ہے۔ اسلامی حکومت اس طرح نہیں بنتی کہ غیر مسلموں سے لڑکر ایک زمینی ٹکڑا حاصل کیا جائے اور وہاں اسلامی قانون کا نظام قائم کر دیا جائے۔ اسلامی حکومت افراد سازی کے ذریعہ بنتی ہے نہ کہ ملک سازی کے ذریعہ۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ پاکستان میں یہ تجربہ آخری حد تک ناکام ہو چکا، اس کے باوجود کشمیر، افغانستان، بوسنیا، اراکان، فلپائن اور دوسرے بہت سے مقامات پر اسی ناکام سیاست کو دہرایا جا رہا ہے۔

۱۸ جنوری ۱۹۹۴

امریکہ کے سفر میں میری ملاقات مولانا سید سلیمان ندوی کے صاحبزادہ ڈاکٹر سلمان ندوی سے ہوئی۔ وہ اپنے والد کے ساتھ انڈیا سے پاکستان چلے گئے تھے۔ وہاں سے ڈربن (ساؤتھ افریقہ) گئے جہاں ایک یونیورسٹی میں وہ اسلامیات کے استاد ہیں۔

ڈاکٹر سلمان ندوی نے گفتگو کے دوران بتایا کہ پاکستان میں میں نے والد صاحب سے پوچھا کہ تحریک آزادی کے زمانہ میں مولانا حسین احمد مدنی کانگرس پارٹی کے حامی تھے۔ اور مولانا اشرف علی تھانوی مسلم لیگ کی حمایت کرتے تھے۔ اس معاملہ میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ ڈاکٹر سلمان ندوی کے بیان کے مطابق، سید صاحب نے جواب دیا: دماغ کانگرس کے ساتھ ہے مگر دل مسلم لیگ کے ساتھ۔

مولانا سید سلیمان ندوی ہندستان کے اکابر علماء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جب اتنے بڑے بڑے لوگوں کا حال یہ ہو کہ ان کے افکار میں انٹگریشن نہ پایا جائے تو ایسے افراد سے کیا امید کی جاسکتی ہے کہ وہ نازک معاملات میں قوم کی رہنمائی کریں گے۔

۱۹ جنوری ۱۹۹۴

قوموں کی نظر میں قربانی اتنی زیادہ اہم ہے کہ ان کا کوئی فرد اگر بے فائدہ طور پر اپنی جان دے دے تب بھی وہ لوگوں کی نظر میں ہیرو بن جاتا ہے۔ یہ ہر قوم کا حال ہے اور مسلمانوں میں مزید اضافہ کے ساتھ یہ رجحان موجود ہے۔ حالاں کہ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

امام حسین کا لڑ کر مر جانا اسلام کی تعلیم سے مطابقت نہ رکھتا تھا کیوں کہ احادیث میں مسلم حکمراں سے جنگ کو مطلق طور پر ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ مگر امام حسین کی شہادت نے لوگوں کی نظر میں ان کو صحابہ سے بھی زیادہ بڑا درجہ دے دیا۔ امام احمد بن حنبل کے زمانہ میں معتزلہ نے کہا کہ قرآن مخلوق ہے۔ امام موصوف نے اس کے مقابلہ میں یہ موقف اختیار کیا کہ قرآن غیر مخلوق ہے۔ اس پر انھیں حکومت وقت کی طرف سے غیر معمولی زیادتیوں کا شکار بنایا گیا۔ میرے نزدیک دونوں ہی موقف یکساں طور پر بے اصل تھے۔ صحیح بات یہ تھی کہ یہ کہا جاتا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور بس۔ مگر امام احمد بن حنبل کی قربانیوں نے انھیں عظیم ترین ہیرو بنا دیا۔

اسی طرح موجودہ زمانہ میں سید احمد بریلوی اور سید قطب جیسے افراد بہت سے لوگوں کی نظر میں ابطال اسلام کا درجہ پائے ہوئے ہیں۔ صرف اس لئے کہ انھوں نے اسلام کے نام پر اپنی جان دے دی ہے۔ حالاں کہ سید احمد بریلوی کی سکھ راجہ سے لڑائی یا سید قطب کا مصری حکمرانوں سے ٹکراؤ، دونوں ہی اسلامی نقطۂ نظر سے بے بنیاد تھا۔

۲۰ جنوری ۱۹۹۴

سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے دنیا بھر کے مسلمانوں میں اسلام کے نام پر دھواں دھار سرگرمیاں جاری ہیں۔ ان سرگرمیوں کو جب میں قرآن و سنت کے معیار پر جانچتا ہوں تو وہ مجھے بالکل بے اصل نظر آتی ہیں۔ مگر ان میں سے ہر ایک کے پاس اپنے حق میں شاندار دلائل موجود ہیں اور وہ مسلمانوں کے درمیان اسلام کے چیمپئن کا درجہ حاصل کئے ہوئے ہیں۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے قیمتی جنتیں سجائی گئی ہیں تو کم از کم میری فہم کے مطابق، خدا نے دو مختلف دین انسانوں کو دئے ہیں۔ ایک وہ جو پیغمبر کے ذریعہ بتایا گیا ہے۔ دوسرا وہ جو پیغمبر کے بعد کچھ اور افراد کے اوپر خواب، مکاشفہ، خود ساختہ تعبیرات، حتی کہ ابلیس کی مجلس شوریٰ کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔ پیغمبر نے اسلام کی بابت فرمایا تھا کہ لیلہا کنہارہا۔ مگر موجودہ زمانہ میں تعبیرات کی کثرت نے اس کو نہارہا کلیلہا کے ہم معنی بنا دیا ہے۔ اگر میں غلطی پر ہوں تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے۔ مگر جہاں تک انسانی سوچ کا تعلق ہے تو میری سوچ مجھ کو یہیں پہنچاتی ہے۔

۲۱ جنوری ۱۹۹۴

ضیاء الرحمان نیر دہلوی (بیسویں صدی) تبلیغی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ جنوری ۱۹۹۴ کے پہلے ہفتہ میں ایک جماعت کے ساتھ میرٹھ گئے۔ واپسی کے بعد میں نے تاثرات پوچھے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کی دینی حالت بہت زیادہ خراب ہے۔ جو لوگ نماز پڑھتے ہیں وہ بھی اخلاقی اعتبار سے عام لوگوں سے مختلف نہیں۔

انھوں نے کہا کہ میرٹھ کے سنجیدہ لوگوں نے بتایا کہ میرٹھ کا فساد ( ) خود مسلمانوں کی چھیڑ چھاڑ سے شروع ہوا۔ مسلمانوں نے میرٹھ شہر میں کچھ پولیس والوں کو مارا۔ میرٹھ شہر میں چوں کہ مسلمان طاقت ور تھے، یہاں زیادہ واقعات نہیں ہوئے۔ البتہ پولیس والوں نے اس کا بدلہ قریب کی آبادی ملیانہ میں لیا۔ وہاں انھوں نے بھرپور طور پر انتقامی کارروائی کی۔ اگر مسلمانوں نے میرٹھ شہر میں پولیس کو مارا نہ ہوتا تو ملیانہ کا فساد بھی نہ ہوتا۔

۲۲ جنوری ۱۹۹۴

مولانا محمد صدیق قاسمی (بھوپال) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ دسمبر ۱۹۹۲ بھوپال میں جو فساد ہوا وہ خود مسلمانوں کی حماقت کا نتیجہ تھا۔ ۶ دسمبر ۹۲ کو بابری مسجد ڈھانے کے بعد مسلمانوں نے بھوپال میں جلوس نکالا۔ انھوں نے ہندو دکانوں پر پتھراؤ کیا۔ ہندوؤں کی گاڑیاں جلا دیں۔ اس کے بعد ہندوؤں نے جوابی فساد شروع کیا تو مسلمانوں کی کمر توڑ دی۔ انھوں نے بتایا کہ میرے بھائی کا دس لاکھ روپیہ کا سامان جلا دیا گیا۔ ابھی تک وہ دوبارہ سنبھل نہیں سکے ہیں۔

میں نے کہا کہ ۶ دسمبر کے بعد ہندو فتح کی نفسیات میں مبتلا تھے۔ اس وقت انتہائی احتیاط کی ضرورت تھی۔ ایسے نازک موقع پر جلوس نکالنا اور چھیڑ چھاڑ کرنا سراسر غلط تھا۔ حدیث میں ہے کہ ان الفتنة نائمة لعن اللہ من ایقظھا۔ ۶ دسمبر کے بعد تو یہ فتنہ ہندوؤں میں سوئی ہوئی حالت میں نہیں بلکہ جاگی ہوئی حالت میں تھا۔ ایسی حالت میں مسلمانوں نے بمبئی، سورت بھوپال وغیرہ میں جلوس اور پتھراؤ کے جو واقعات کئے وہ ایقاظ فتنہ سے بھی زیادہ بڑی غلطی تھی —— یہ دنیا عالم اسباب ہے۔ یہاں یہ ممکن نہیں کہ غلطی کوئی شخص کرے اور اس کی قیمت کوئی دوسرا شخص ادا کرے۔

۲۳ جنوری ۱۹۹۴

قدیم زمانہ میں تعلیم کی صرف ایک صورت تھی۔ طالب علم اپنے استاد کے سامنے بیٹھ کر سنے۔ موجودہ زمانہ میں مواصلات کے نئے ذرائع نے سامنے موجودگی کو اضافی بنا دیا۔ اس سے اوپن یونیورسٹی کا تصور پیدا ہوا۔ اس نئے تصور کے تحت خط وکتابت، لٹریچر، ریڈیو ٹی وی، آڈیو اور ویڈیو کیسٹ کے ذریعہ وسیع پیمانے پر تعلیم دی جاتی ہے۔ اس ترقی نے ایک نئی اصطلاح پیدا کی ہے جس کو دوری سے تعلیم (distance education) کہا جاتا ہے۔

یہی معاملہ دعوت کا بھی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ ہر چھوٹے اور بڑے گھر میں اسلام کا کلمہ داخل ہوجائے گا۔ یہ عمومی ادخال کلمہ اس کے بغیر ممکن نہ تھا کہ نئے ذرائع اعلام دریافت ہوں جو دور سے پیغام رسانی کو ممکن بنا دیں۔

۲۴ جنوری ۱۹۹۴

فقہاء نے چار چیزوں کو اسلامی احکام کا ماخذ قرار دیا ہے ـــــ قرآن، سنت اجماع، قیاس۔ میں سمجھتا ہوں کہ چار کی تقسیم غیر ضروری ہے۔ اصل ماخذ صرف دو ہیں نص اور قیاس۔ نص شرعی میں قرآن اور سنت ثابتہ شامل ہیں۔ قیاس اگر عمومی اتفاق رائے کی بنیاد پر ہو تو وہ اجماع امت کہا جائے گا، ورنہ صرف قیاس۔ یہ ایک فطری تقسیم ہے جو ہر جگہ اور ہمیشہ موجود رہتی ہے۔

۲۵ جنوری ۱۹۹۴

تین سال پہلے امریکہ کے سفر میں میری تفصیلی ملاقات ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے ہوئی۔ وہ الرسالہ مشن سے کافی متاثر تھے۔ انھوں نے طے کیا تھا کہ وہ امریکہ میں الرسالہ مشن کو پھیلانے کا کام کریں گے۔ چنانچہ وہ ماہنامہ الرسالہ بڑی تعداد میں منگوا کر پھیلانے لگے۔ انھوں نے جمعہ کے دن الرسالہ کی مطبوعات کا اسٹال لگانا شروع کیا، وغیرہ۔ مگر تین سال بعد حال میں جب میں امریکہ گیا میں نے پایا کہ ان میں فرق آچکا ہے۔ فکری طور پر اگرچہ اب بھی وہ الرسالہ مشن سے متفق تھے۔ مگر عملاً وہ اس کو تقریباً چھوڑ چکے ہیں۔ آجکل وہ ایک اسلامک سنٹر کے چیئرمین ہیں۔ وہ اس سلسلہ میں مجھ کو کافی سرگرم نظر آئے۔ ایک گفتگو کے دوران انھوں نے کہا: اب میں نے لیڈرشپ

کا رول لے لیا ہے۔

اس تجربہ سے میں نے جانا کہ کیا وجہ ہے کہ بہت سے لوگ الرسالہ مشن سے پورا اتفاق کرتے ہیں۔ مگر عملاً وہ الرسالہ مشن میں زیادہ متحرک نہیں ہوتے۔ البتہ اگر انھیں کسی اسلامی ادارہ کی صدارت جیسا عہدہ مل جائے تو وہاں وہ خوب سرگرم عمل ہو جاتے۔ اس فرق کی وجہ ایک لفظ میں یہ ہے کہ ـــــ الرسالہ مشن میں خدمت کا رول ہے اور تسلیم شدہ قومی اداروں میں لیڈر شپ کا رول۔

۲۶ جنوری ۱۹۹۴

دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا کے شمارہ ۲۱ جنوری ۱۹۹۴ میں ایک نیوز آئٹم ہندستانیوں کا قبول اسلام (Indians convert) کے عنوان سے چھپا ہے۔ ایتھنز کی ڈیٹ لائنس کے ساتھ چھپنے والی اس خبر میں بتایا گیا ہے کہ پچھلے چھ مہینوں میں سعودی عرب میں مقیم غیر ملکیوں میں سے ایک ہزار ایک سو بیالیس لوگوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ ان میں سے ۱۹۷ ہندستانی ہیں:

A total of 1,142 expatriates including 197 Indians in Saudi Arabia have embraced Islam, within a period of six months. (p. 10)

یہ صرف سعودیہ کی بات نہیں، ہر عرب ملک میں اسی طرح انڈیا کے ہندو برابر اسلام قبول کرتے رہتے ہیں۔ میں نے اپنے بعض بیرونی سفروں کے درمیان اس معاملہ کی تحقیق کی۔ معلوم ہوا کہ اس کی اصل وجہ آزادانہ ڈائیلاگ ہے۔

عرب ملکوں میں ہندو مسلم تعلقات میں وہ تناؤ اور پیچیدگی نہیں ہے جو انڈیا میں دونوں فرقوں میں پائی جاتی ہے۔ اس لئے وہاں فطری ماحول میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ڈائیلاگ جاری رہتا ہے۔ اس کے برعکس انڈیا میں دو قومی سیاست اور فرقہ وارانہ نزاعات نے دونوں فرقوں کے درمیان معتدل فضا باقی نہیں رکھی ہے۔ اس لیے یہاں دونوں کے درمیان نہ معتدل فضا میں ملاقات ہوتی نہ بات چیت۔

ہندستان کے مسلمان اگر شکایت اور اشتعال والی باتوں میں یکطرفہ صبر کی پالیسی اختیار کر لیں تو انڈیا میں بھی دونوں فرقوں کے درمیان نارمل تعلقات قائم ہو جائیں گے اور

اس کے فطری نتیجہ کے طور پر دونوں کے درمیان آزادانہ ڈائیلاگ بھی شروع ہو جائے گا۔ اس کے بعد یقینی طور پر انڈیا میں بھی وہی دعوتی عمل جاری ہو جائے گا جو عرب ملکوں میں آج بھی جاری ہے۔

انڈیا کے مسلمانوں کو اللہ کے لئے جو اصل قربانی دینا ہے وہ یہی صبر کی قربانی ہے۔ لڑنے مرنے کی قربانی چودہ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے دے رہے ہیں، وہ اللہ کو مطلوب نہیں۔ مسلمان بطور خود اس کو قربانی کا نام دئے ہوئے ہیں۔ مگر میرے فہم دین کے مطابق وہ نہ شہادت ہے اور نہ قربانی۔

۲۷ جنوری ۱۹۹۴

خواب میں دیکھا کہ کوئی مقرر قسم کا آدمی اسلام کے موضوع پر بول رہا ہے۔ اس دوران اس نے کہا ـــــ مدنی دور نام ہے جہاد بالسیف کا، بدر وحنین کا معرکہ گرم کرنے کا۔

مجھے یہ سن کر غصہ آ گیا۔ میں اس سے کہتا ہوں کہ تم نے جھوٹ کہا۔ مدنی دور نام ہے قرآت اور تبلیغ کا، ٹکراؤ سے ہٹ کر ہجرت کر جانے کا، تعمیر مسجد اور اقامت صلاۃ کا، صبر اور داخلی استحکام کا، قرآن کی کتابت وحفاظت کا، تعلیم اور تدریس کا، یکطرفہ طور پر صلح کر لینے کا، قوموں کو دعوتی مکتوبات بھیجنے کا، اخوت ومواسات کا، دشمنوں کو معاف کر دینے کا، مجبورانہ دفاع کے سوا ہر حال میں جنگ سے اعراض کرنے کا، کردار سازی اور تعمیر سیرت کا، اپنی کمائی کو صرف اپنی ذات پر خرچ کرنے کے بجائے مصالح دین پر خرچ کرنے کا۔

جس دور کو مدنی دور کہا جاتا ہے اس دور میں یہ سب کام بہت بڑے پیمانہ پر کئے گئے۔ اس کے باوجود کہنے والے مذکورہ قسم کی باتیں کیوں کہتے ہیں، اس کا سبب غلط تفکیر ہے۔ یعنی وہی چیز جس کو وضع الشئ فی غیر موضعہ کہا گیا ہے، لوگوں نے یہ کیا کہ وقتی معاملہ کو ابدی معاملہ سمجھ لیا، استثنائی حکم کو عمومی حکم قرار دیدیا، جزئی پہلو کو کلی پہلو بنا لیا۔ جو بات اضافی تھی اس کو حقیقی کا درجہ دے دیا۔

۲۸ جنوری ۱۹۹۴

عرب کے ایک مسلم ادیب نے لکھا ہے کہ امت اسلامی کی صفت کھلا پن ہے، دوسری

قوموں کا معاملہ اس کے برعکس ہے، وہ بند معاشرہ کی حیثیت رکھتی ہیں (الامة الاسلامية من خصائصها الانفتاح - اما الشعوب الاخرىٰ فهي - على نقيض من ذالك - شعوب منغلقة)

میں سمجھتا ہوں کہ بات یوں نہیں ہے کہ کھلاپن (openness) صرف امت مسلمہ کی صفت ہے اور دوسری قوموں کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ کھلاپن دراصل زندہ قوم کی صفت ہے۔ قوم میں زندگی ہو تو اس کے اندر کھلاپن ہوگا، اور جب قوم طول امد کے نتیجہ میں مردہ ہوجائے تو اس میں کھلاپن کا ماحول بھی باقی نہیں رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں معاملہ بالکل برعکس ہوگیا ہے۔ آج مسلمانوں کا معاشرہ کھلے پن سے محروم ہے۔ اس کے برعکس مغربی قوموں میں عام طور پر کھلاپن پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ مسلمان اس وقت اپنے دور زوال کو پہنچ گئے ہیں۔ جبکہ مغربی قومیں اپنے عروج کی حالت میں ہیں۔

کسی معاشرہ میں کھلاپن صرف اس وقت آتا ہے جب کہ اس میں تنقید کو برداشت کرنے کی طاقت ہو۔ اس اعتبار سے تنقید ایک قطعی معیار ہے جس کے اوپر کسی معاشرہ کو جانچا جاسکتا ہے۔ آج ساری دنیا میں مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان کے اندر تنقید کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں۔ جبکہ مغربی معاشرہ میں تنقید کا استقبال کیا جاتا ہے۔ یہی ظاہرہ بتاتا ہے کہ آج کس معاشرہ میں کھلاپن ہے اور کس معاشرہ میں کھلاپن نہیں ہے۔

۲۹ جنوری ۱۹۹۴

دکتور عماد الدین خلیل (مصری) کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے اعادة تشكيل العقل المسلم۔ آجکل اس قسم کی تحریریں عرب دنیا میں بہت شائع ہو رہی ہیں۔ مگر مجھے شبہ ہے کہ ان لکھنے والوں پر یہ امر واضح نہیں کہ عقل مسلم ہے کیا۔ جہاں تک میرا خیال ہے، میں سمجھتا ہوں کہ مسلم عقل دراصل سائنٹفک عقل کا دوسرا نام ہے۔ سائنٹفک عقل سے میری مراد اہل مغرب کی عقل نہیں ہے بلکہ سچے فطرت شناس کی عقل ہے۔ سائنٹفک تھنکنگ اگر فی الواقع کسی کے اندر پیدا ہو جائے تو لازماً وہ اس کو خدا کی معرفت تک لے جائے گی۔ سائنسی سوچ، مطابق واقعہ سوچ کا دوسرا نام ہے۔ اور مطابق واقعہ سوچ ہی سے وہ چیز

پیدا ہوتی ہے جس کو خدا شناسی کہا جاتا ہے۔

۳۰ جنوری ۱۹۹۴

کشمیر کے جنگجوؤں نے ۱۹۸۹ میں سرینگر کی دو سرکاری عمارتوں میں بم مار کر اپنی پر تشدد تحریک کا آغاز کیا۔ اس سے پہلے میں بار بار کشمیر گیا ہوں۔ اس سے پہلے وادی کشمیر میں مکمل امن تھا۔ ہندستانی فوجیں اپنے محدود دائرہ میں رہتی تھیں۔ وہ آبادیوں میں کسی قسم کا ظلم یا تشدد نہیں کرتی تھیں۔

پاکستان کے فوجی صدر جنرل ضیاء الحق کے زمانہ اقتدار میں ۱۹۸۷ میں اسلام آباد میں "کشمیر آزادی سیل" قائم کیا گیا۔ یہ سیل پاکستان کے انٹر سروسز انٹلی جنس I.S.I. کے ماتحت ہے۔ پچھلے سالوں میں اس نے اس مد میں کروڑوں ڈالر خرچ کئے ہیں۔

کشمیر آزادی سیل عملاً کشمیر میں بلا اعلان جنگ چھیڑنے کے ہم معنی تھا۔ وہ اس لئے قائم کیا گیا تاکہ کشمیر کے نوجوانوں کو ہتھیار دے کر وہاں تخریب کرائی جائے اور اس طرح ہندوؤں کو پریشان کیا جائے۔ پاکستان کے نام نہاد اسلامی حکمرانوں کو یہ توفیق تو نہیں ہوئی کہ وہ اپنے یہاں دعوہ سیل قائم کریں اور اپنے پڑوسی ہندوؤں تک خدا کے دین رحمت کا پیغام پہنچائیں۔ البتہ وہ اپنے غیر مسلم پڑوسیوں کے خلاف نفرت اور تشدد کا طوفان برپا کرنے کے چیمپئن بنے ہوئے ہیں۔

دین کا جو فہم مجھے قرآن و سنت کے مطالعہ سے حاصل ہوا ہے، اس کی روشنی میں میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس قسم کی سرگرمیاں صرف خدا کے غضب کو دعوت دینے والی ہیں، اس قسم کی منفی سرگرمی پر کسی کو خدا کا انعام ملنے والا نہیں۔

۳۱ جنوری ۱۹۹۴

۳۰ - ۳۱ جنوری کو میں بنگلور میں تھا۔ وہاں عبد اللہ بری صاحب الرسالہ مشن کے لئے بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک صاحب کے مالی تعاون سے وہ یہاں "الرسالہ اکیڈمی" کے لئے ایک کمرہ کرایہ پر لئے ہوئے تھے۔ کسی "اسلام پسند" نے ان کو بہکایا اور انھوں نے اپنا مالی تعاون روک لیا۔ اس کے بعد سات مہینہ کا کرایہ باقی ہوگیا۔ آخر کار انھیں وہ کمرہ

چھوڑنا پڑا۔ اسی طرح ایک اور مسلمان تاجر نے عبداللہ ہری صاحب کو اس مقصد کے لئے دو لاکھ روپیہ دینے کا وعدہ کیا کہ الرسالہ مشن کی دعوتی کتابوں کا ترجمہ کناڑ ازبان اور جنوبی ہند کی دوسری زبانوں میں کیا جائے۔ مگر انھیں کسی اسلام پسند نے بہکایا اور انھوں نے وعدہ پورا کرنے سے انکار کر دیا۔

اس طرح کے واقعات جگہ جگہ پیش آ رہے ہیں۔ پچھلے ۳۰ سال کے دوران بہت سے لوگوں نے اور بہت سی جماعتوں نے میری مخالفت کی ہے۔ مگر میں نے آج تک اپنے کسی مخالف کی ضد میں اس قسم کی پست حرکت نہیں کی۔ میں ہمیشہ علمی تنقید کرتا ہوں۔ کسی کی کردار کشی یا کسی کو نقصان پہنچانے کے لئے سطحی حرکتیں کرنا میرے مزاج کے سراسر خلاف ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ جو لوگ اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں وہ کتنے زیادہ پست لوگ ہوں گے۔ وہ اسلام سے آخری حد تک دور ہیں، خواہ وہ اپنی اسلام پسندی کا کتنا ہی زیادہ اشتہار کریں۔ شریعت کے مطابق، اختلاف کا اظہار علمی تنقید کی صورت میں ہونا چاہئے نہ کہ الزام تراشی اور کینہ پن کی صورت میں۔

یکم فروری ۱۹۹۴

لاہور کے اخبار نوائے وقت (۲۵ جنوری ۱۹۹۴) کے مطابق، پاکستانی پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں بتایا گیا کہ "بھارت ساٹھ ہزار کشمیری مسلمانوں کو شہید کر چکا ہے"۔ اسی طرح نوائے وقت کے شمارہ ۲۴ جنوری کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ:

"کشمیر کا اہم مسئلہ معاشی مسئلہ ہے۔ کشمیر کی معیشت تباہ ہو چکی ہے۔ کشمیر کی صنعت مثلاً سیاحت کی صنعت، اور پھلوں کی صنعت تباہ و برباد ہو چکی ہے۔ اس کا متبادل بھی نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس کے لئے فنڈز موجود ہیں تاکہ لوگوں کے روزمرہ کے مسائل اور ضروریات پوری ہو سکیں۔ یہ انتہائی اہم اور ہنگامی مسئلہ ہے۔" صفحہ ۲

اس واضح تباہی کے باوجود پاکستان میں ہر لکھنے اور بولنے والا کشمیر کی جنگ کو تیز تر کرنے کا نعرہ لگا رہا ہے۔ کشمیر میں خود پاکستان نے ۱۹۸۹ میں مسلح جنگ شروع کرائی۔ یہ جنگ اسلام کے نام پر لڑی جا رہی ہے۔ اسلام کے یہ جھوٹے دعویدار بتائیں کہ اسلام کے دور اول میں جو کہ نمونہ کا دور ہے، وہ کون سی مثال ہے جب کہ اس تباہ کن انجام کے باوجود جنگ جاری رکھی گئی ہو۔

۲ فروری ۱۹۹۴

نوائے وقت (۲۳ جنوری ۱۹۹۴) کے ایک مضمون میں بتایا گیا ہے کہ مسٹر محمد علی جناح جب ۱۹۱۶ میں مسلم لیگ کے جلسہ کی صدارت کے لئے لکھنؤ آئے تو اُن کی شان میں مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک نظم پڑھی۔ اس کا ایک شعر یہ تھا:

ہر مریض قوم کے جینے کی ہے کچھ کچھ امید　　ڈاکٹر اس کا اگر محمد علی جینا رہا

۲۴ - ۲۵ مئی ۱۹۲۴ کو لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ تھا۔ اس کی صدارت کے لئے مسٹر جناح لاہور آئے۔ اس موقع پر ۲۵ مئی کو انھوں نے اسلامیہ کالج لاہور کے ہال میں ایک لکچر دیا۔ مسٹر جناح جب کالج کے حبیبیہ ہال میں داخل ہوئے تو ایک صاحب نے بلند آواز سے یہ شعر پڑھا:

آتی نہیں نظر میں کوئی صورت فلاح　　شاید بتائیں راہ محمد علی جناح

مسٹر محمد علی جناح نے اپنی تدبیر بتائی۔ قوم نے بہت بڑی تعداد میں اس کی تائید کرکے پاکستان بنوایا۔ قوم کو یہ حل اتنا پسند آیا کہ جناح صاحب "قائد اعظم" کہے جانے لگے۔ مگر برصغیر ہند کے مسلمانوں کے مسئلہ کا حل ہونا تو درکنار، وہ اور زیادہ بڑھ گیا۔ یہی موجودہ زمانہ کے تمام مسلم رہنماؤں کا حال ہے۔ شخصی طور پر ایک قائد اعظم بن رہا ہے۔ مگر مجموعی طور پر مسلمان ملت اعظم نہ بن سکے۔

۳ فروری ۱۹۹۴

جامعہ ملیہ سے ایم اے (اسلامک اسٹڈیز) کے تین طلبہ ملاقات کے لئے آئے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ آپ مسلمانوں کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ ہندوؤں کا جلوس خواہ مسجد کے سامنے باجا بجائے یا مسلم محلہ سے نعرہ لگاتا ہوا گزرے وہ بہر حال ان سے اعراض کریں اور کوئی روک ٹوک نہ کریں۔ آپ ایسا کیوں کہتے ہیں جب کہ اسلام میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ برائی کو روکو۔ آخر ہم برائی کو کیوں نہ روکیں۔

میں نے کہا کہ اسلام میں برائی کو روکنے کا حکم دیا گیا ہے، یہ حکم تو نہیں دیا گیا ہے کہ برائی کو بڑھاؤ۔ آپ لوگ تو برائی کو بڑھانے کا کام کر رہے ہیں۔ مسلمان جب نعرہ یا باجا کو

روک سکتے ہیں تو اس کا نتیجہ کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نعرہ اور باجا خونیں فساد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ برائی کو بڑھانا ہے نہ کہ برائی کو مٹانا۔

۴ فروری ۱۹۹۴

اس ملک میں ہندوؤں کے بارہ میں مسلمانوں کا رویہ نہایت منفی رہا ہے۔ اس روش کے جواز کے لئے مسلمان عام طور پر اس آیت کا حوالہ دیتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ اہل ایمان کے ساتھ دشمنی میں تم سب سے بڑھ کر یہود اور مشرکین کو پاؤ گے اور اہل ایمان کے ساتھ دوستی میں تم سب سے زیادہ ان لوگوں کو پاؤ گے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں (المائدہ ۸۲)

یہ حوالہ نہایت غلط ہے۔ اس آیت میں الذین اشرکوا سے مراد عمومی معنوں میں قوم مشرک نہیں ہے بلکہ وہ لوگ ہیں جو لمبے دعوتی عمل کے باوجود شرک پر مصر رہے۔ ایک لاکھ سے اوپر جو صحابہ تھے وہ سب اسی قوم مشرک ہی سے نکل کر تو آئے تھے۔ پھر ساری مشرک قوم کیوں کر اس سے مراد ہو سکتی ہے۔ یہ آیت صلح حدیبیہ کے بعد اتری ہے۔ تقریباً ۲۰ سالہ دعوتی عمل کے نتیجہ میں مشرکین کی قوم میں سے بہت سے لوگوں نے نکل کر اسلام قبول کر لیا۔ یہاں تک کہ حجۃ الوداع کے وقت ان کی تعداد ایک لاکھ سے اوپر ہو گئی۔ حدیث کے الفاظ میں، جب ان کے تمام خیار اسلام میں داخل ہو گئے اور ان میں صرف غیر خیار رہ گئے تو ان کے باقی ماندہ لوگوں کے بارہ میں یہ آیت اتری۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے پھل کا تمام رس نکال لیا جائے اور اس کے بعد کہا جائے کہ اب تو جو ہے وہ صرف چھلکا ہے۔ اگر اس سے قومی مفہوم مراد ہوتا تو شروع ہی میں یہ آیت اترتی کہ مشرکین تو ابدی دشمن اسلام ہیں۔ تم صرف نصاریٰ کے اوپر دعوتی کام کرو۔

مسلمانوں کو اس آیت کا حوالہ دینے کا حق اس وقت ہے جب کہ وہ پیغمبر کے انداز کی دعوتی مہم چلائیں اور اس کو کم از کم ۲۰ سال تک جاری رکھیں۔ اس پیغمبرانہ دعوتی عمل کے نتیجہ میں موجودہ مشرکین کے تمام بہترین افراد نکل کر توحید کے دائرہ میں آ جائیں۔ اس کے بعد جو ناکارہ افراد باقی رہ جائیں ان پر مذکورہ آیت کا اطلاق ہو گا۔ قرآن میں جہاں اس قسم کی آیتیں آئی ہیں ان کو دعوت سے الگ کر کے سمجھا نہیں جا سکتا۔

۵ فروری ۱۹۹۴

قدیم زمانہ میں ہزاروں سال سے بادشاہت کا دور چلا آرہا تھا۔ بادشاہ کا اثر لوگوں کے اوپر اتنا زیادہ ہوا کرتا تھا کہ یہ مثل بن گئی اَلنَّاسُ علیٰ دِیْنِ مُلُوکِہِمْ (لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش انھیں حالات میں ہوئی۔ مگر آپ اس مثل سے متاثر نہیں ہوئے۔ اس کے برعکس آپ نے فرمایا: کما تکونون کذالک یولی علیکم (جیسے تم ہوگے ویسے ہی تمہارے حکمراں ہوں گے) گویا عوامی مثل تو یہ تھی کہ جیسے بادشاہ ویسے عوام۔ مگر آپ نے فرمایا کہ جیسے عوام ویسے بادشاہ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول گویا دور بادشاہت میں دور جمہوریت کی پیشنگوئی ہے۔ اس اعتبار سے یہ حدیث دلائل نبوت میں سے ہے۔ کیوں کہ چودہ سو سال پہلے خدا کے پیغمبر کے سوا کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ مستقبل میں سیاست اس طرح بدلے گی کہ شاہی سیاست کے بجائے عوامی سیاست اس کی جگہ لے لے گی۔

۶ فروری ۱۹۹۴

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ اذا عمل احدکم عملاً اَنْ یتقنہ (اللہ کو یہ پسند ہے کہ تم میں سے کوئی شخص جب ایک کام کرے تو وہ اس کو محکم انداز سے کرے) اسی بات کو علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اس طرح فرمایا: ان قیمۃ المرء مایحسنہ۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: قیمۃ المرء مایحسن۔ یعنی آدمی کی قدر وقیمت اس کی حسن کارکردگی کے اعتبار سے ہوتی ہے۔

انسانوں کی دو قسمیں ہیں ـــــــ مفاد پرست انسان اور بااصول انسان۔ مفاد پرست انسان کسی کام کو صرف اس وقت بہتر طور پر انجام دیتا ہے جبکہ اس سے اس کا ذاتی مفاد وابستہ ہو۔ جس کام میں ذاتی فائدہ کا پہلو نہ ہو اس کو وہ بس سرسری طور پر کر کے چھوڑ دیتا ہے۔ مگر بااصول انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ بااصول انسان جو کام بھی کرتا ہے اس کو وہ ہمیشہ بہتر طور پر ہی انجام دیتا ہے خواہ اس میں اس کا ذاتی مفاد ہو یا اس کا ذاتی مفاد نہ ہو۔

۷ فروری ۱۹۹۴

میں ایک پیس مارچ میں شریک ہوا۔ یہ قافلہ دہلی ریلوے اسٹیشن سے شروع ہوا، اور لال قلعہ پر ختم ہوا۔ ہم لوگ ایک کھلی "رتھ" میں بٹھائے گئے تھے اور اس کے چاروں طرف بے شمار لوگوں کا ہجوم پر جوش نعرہ لگا رہا تھا : ایک بنو نیک بنو، ایک بنو نیک بنو۔

اس قسم کے نعرے پچھلے سو سال سے لگائے جا رہے ہیں۔ مگر ملک میں ابھی تک وہ سماج نہ بن سکا جس میں لوگ ایک اور نیک بن کر رہ سکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا تعلق نعرہ بازی سے نہیں ہے بلکہ مزاج سازی سے ہے۔ مزاج سازی کا کام لوگوں کو دیر طلب معلوم ہوتا ہے اس لئے کوئی اس کے لئے محنت نہیں کرتا۔ حالاں کہ سو سال تک نعرہ بازی کے بجائے اگر صرف ۲۵ سال تک واقعی معنوں میں مزاج سازی کی جاتی تو اب تک "ایک بنو اور نیک بنو" کا مقصد حاصل ہو گیا ہوتا۔

۸ فروری ۱۹۹۴

آج جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے کانفرنس ہال میں تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر بشمبھر ناتھ پانڈے نے ۱۹۴۷ سے پہلے کے کئی واقعات سنائے۔ ایک واقعہ یہ تھا کہ ۱۸۹۶ میں چاندنی چوک کے ایک مندر میں کسی نے گائے کا سر کاٹ کر پھینک دیا۔ یہ خبر مشہور ہوئی تو ہزاروں ہندو ہتھیار لے کر سڑکوں پر نکل آئے۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہندو مسلم فساد ہو جائے گا۔ تمام لوگ سخت بپھرے ہوئے تھے۔

حکیم اجمل خاں کا مطب قریب ہی میں تھا۔ ان کو معلوم ہوا تو وہ ننگے پاؤں نکل کر بھاگے وہ وہاں پہنچے جہاں مشتعل ہندوؤں کا مجمع اکٹھا تھا۔ ان میں سے بہت سے لوگ حکیم اجمل خاں سے اچھی طرح واقف تھے۔ حکیم اجمل خاں دونوں ہاتھ جوڑ کر مجمع کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ کل رات معلوم نہیں کون سا شیطان میرے دماغ میں گھس گیا۔ اور میں نے ہی گائے کا یہ سر لاکر اس مندر میں ڈال دیا۔ اب میں آپ کے سامنے حاضر ہوں۔ آپ لوگ میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیجئے مگر خدا کے لئے قوم کے ٹکڑے نہ کیجئے۔ لوگوں کے دلوں میں حکیم اجمل خاں کی بہت زیادہ عزت تھی۔ چنانچہ یہ سن کر تمام لوگ ٹھنڈے ہو گئے۔ ہر ایک خود

حکیم صاحب کے سامنے جھک گیا۔ ایک ہندو لالہ نے کہا کہ حکیم صاحب، ہم کو چھاپئے۔ آپ کے دماغ میں شیطان نہیں گھسا تھا۔ ہمارے ہی دماغ میں شیطان گھس گیا تھا۔ اس کے بعد حکیم اجمل خاں نے ایک لیڈر سے کہا کہ لالہ جی، گائے کا سر کسی گڑھے میں پھینکوا دیجئے اور مندر کو گنگا جل سے دھو دیجئے۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ قوم کا درد کیا چیز ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے کے مسلم لیڈروں میں یہ درد موجود تھا۔ آج جو لوگ مسلمانوں کی لیڈری کے دعویدار ہیں، وہ اس درد سے خالی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان نام نہاد لیڈروں کے ایسے واقعات سننے میں نہیں آتے۔ آج کے لیڈر مسلمانوں کو صرف لفظی تقریریں دے رہے ہیں جب کہ پہلے کے لیڈر قوم کو اپنا دل دئے ہوئے تھے۔

۹ فروری ۱۹۹۴

ہندی روزنامہ نوبھارت ٹائمس کے نمائندہ مسٹر منورنجن بھارتی نے دہلی کے بارہ میں میرا انٹرویو لیا۔ میں دہلی میں ۱۹۶۷ سے رہتا ہوں۔ اس مدت میں یہاں ہر قسم کا پلیوشن اتنا بڑھ گیا کہ اب دہلی رہنے کے قابل نظر نہیں آتی۔ لوگ دن بدن اتنے خود غرض ہوتے جارہے ہیں کہ انھیں اپنے ذاتی فائدہ کے سوا کسی اور چیز کا کوئی دھیان ہی نہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ دہلی کی کن جگہوں پر جانا پسند کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ پہلے تو یہاں کے پارک، مثلاً شانتی ون، لودی گارڈن وغیرہ جاتا تھا۔ مگر اب بڑھتے ہوئے پلیوشن کی وجہ سے کہیں جانے کا جی نہیں چاہتا۔ اب میری دلچسپی کا مقام صرف یہاں کی لائبریریاں ہیں۔

انٹرویو کافی لمبا تھا۔ آخر میں انھوں نے پوچھا کہ دہلی کے ناگرکوں کے لئے آپ کا سندیش کیا ہوگا۔ میں نے کہا ـــــ جس طرح آپ اپنا گھر بناتے ہیں، اسی طرح آپ پوری دلّی کو بنائیے۔

۱۰ فروری ۱۹۹۴

مسلمان داعی ہیں اور غیر مسلم ان کے مدعو۔ مسلمانوں کے اوپر غیر مسلموں کا یہ حق ہے کہ وہ ان کو دین حق کا پیغام پہنچائیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے، اپنے نااہل لیڈروں کی رہنمائی میں، ان غیر مسلموں سے سیاسی لڑائی چھیڑ دی۔ اس کے بعد غیر مسلم قوموں

نے جوابی کارروائیاں شروع کیں تو مسلمانوں کے علما اور دانشوروں نے یہ کہنا شروع کیا کہ یہ لوگ سب کے سب اسلام دشمن ہیں۔

مسلم دنیا میں شاید میں واحد شخص ہوں جو مسلمانوں کو یہ نصیحت کر رہا ہے کہ غیر مسلموں سے رقیبانہ تعلق ختم کرو اور ان سے داعیانہ تعلق قائم کرو۔ مگر مسلمانوں کا مزاج اتنا بگڑ گیا ہے کہ میری بات پر سوچنے کے بجائے ہر طرف یہ کہہ کر مجھ کو بدنام کیا جا رہا ہے کہ وہ تو اسلام دشمن طاقتوں کے ایجنٹ ہیں، ان کی مت سنو۔

۱۱ فروری ۱۹۹۴

ایک مسلمان شاعر نے کہا کہ ہر ملک ملکِ ماست کہ ملک خدائے ماست۔ مسلمان صدیوں سے ساری دنیا میں اسی احساس کو لے کر جی رہے ہیں۔ ان میں کوئی یہ کہنے والا نہیں اٹھا کہ ـــــ ہر انسان میرا اپنا ہے، کیوں کہ وہ میرے خدا کا پیدا کیا ہوا ہے۔ ان دونوں میں بہت زیادہ فرق ہے۔ پہلے نظریہ کے تحت دوسروں کے مقابلہ میں برتری کا احساس ابھرتا ہے اور دوسرے احساس کے تحت برابری کا۔ پہلے احساس کے تحت دوسروں سے دوری پیدا ہوتی ہے اور دوسرے احساس کے تحت قربت۔

۱۲ فروری ۱۹۹۴

میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک مسلمان لڑکے اور ایک مسلمان لڑکی سے ملتا ہوں۔ دونوں میاں بیوی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ابھی ہم کچھ نہیں کرتے۔ ابھی ہم صرف پڑھ رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ لوگوں کا خرچ کس طرح چلتا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم کو ہندستانی حکومت ماہانہ رقم دیتی ہے جس سے ہمارا خرچ پورا ہو جاتا ہے۔ پھر اسی خواب میں میری ملاقات حیدرآباد کے مولانا سید اکبرالدین قاسمی سے ہوتی ہے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ دیکھئے، ہندستان کتنا اچھا ملک ہے۔ یہ لوگ پڑھ رہے ہیں اور ان کا سارا خرچ انھیں حکومت کی طرف سے مل رہا ہے۔ کتنا اچھا ہے ہندستان۔ اس کو ہندستان نہ کہئے بلکہ ہمارا ہندستان کہئے۔ یہ بات میں جوش و مسرت کے جذبہ سے کہہ رہا ہوں۔

اس خواب کی تعبیر غالباً یہ ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لئے ہر قسم کے مواقع

موجود ہیں۔ مسلمان یہاں محنت کے ساتھ پڑھیں۔ پھر یہی ہندستان ان کے لئے اپنا ہندستان بن جائے گا، جو کہ ابھی ان کو غیر ہندستان دکھائی دے رہا ہے۔

۱۳ فروری ۱۹۹۴

ندوہ لکھنؤ سے نکلنے والے جریدہ تعمیر حیات (۲۵ جنوری ۱۹۹۴) میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ایک تقریر "اسلام کے مردان باوفا" کے عنوان سے چھپی ہے۔ اس میں مولانا نے "اللہ کے لئے سر کٹانے" کو خوب گلوریفائی کیا ہے۔ مجھے ان علماء کرام پر تعجب ہے۔ وہ خود تو اپنی ایک انگلی بھی کٹانے کے لئے تیار نہیں ہیں اور دوسروں کے سامنے سر کٹانے کا پر جوش وعظ کہہ رہے ہیں۔ یہی وہ تضاد ہے جس کی نشاندہی علماء یہود میں کرتے ہوئے حضرت مسیح نے کہا تھا: وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کو اٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں مگر آپ ان کو اپنی انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔ (متی ۲۳ : ۴)

مزید یہ کہ یہ تصور دین سراسر بے بنیاد ہے کہ نتیجہ کی پروا کئے بغیر بس اپنا سر کٹا دو۔ اگر یہی سچا دین ہو تو اس کی سب سے پہلی خلاف ورزی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی۔ کیوں کہ مکہ میں جب قریش کے لوگوں نے تلوار لے کر آپ کے مکان کو گھیر لیا تو آپ ان سے لڑنے کے لئے کھڑے نہیں ہوئے بلکہ خاموشی کے ساتھ عقبی دروازہ سے نکل کر مدینہ چلے گئے۔

۱۴ فروری ۱۹۹۴

قرآن میں کہیں بھی مطلق طور پر یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ اللہ کے لئے لڑ کر مر جاؤ۔ اس کے برعکس یہ فرمایا کہ اللہ کے لئے صبر کرو (ولربك فاصبر) قرآن میں پیغمبر اسلام کو رحمۃ للعالمین کہا گیا ہے، قرآن میں کہیں بھی آپ کو سیف اللہ علی العالمین نہیں فرمایا گیا ہے۔ قرآن میں الصلح خیر کی آیت ہے مگر قرآن میں الحرب خیر کے مضمون کی کوئی آیت موجود نہیں۔ قرآن میں ہے کہ انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب، مگر یہ کہیں نہیں فرمایا کہ انما یوفی المقاتلون اجرھم بغیر حساب۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی کلچر رحمت کلچر ہے۔ وہ گن کلچر نہیں۔ اسلام انسانوں کے درمیان

معتدل تعلقات قائم کرنے کے لئے یک طرفہ طور پر ایڈجسٹمنٹ کی تعلیم دیتا ہے جس کی ایک مثال صلح حدیبیہ ہے۔ اہل ایمان کا کام نہ سرکاٹنا ہے اور نہ سر کٹوانا۔ اہل ایمان کا کام یہ ہے کہ وہ دنیا میں خدا کے متواضع بندے بن کر رہیں۔ اور برے سلوک کے جواب میں اچھا سلوک کرکے لوگوں کے دلوں میں اللہ کی معرفت کے چشمے جاری کریں۔

۱۵ فروری ۱۹۹۴

تقابل سے باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ اس لئے عربی مثل ہے کہ: تعرف الاشياء باضدادها۔ قرآن کی تعلیمات کو سمجھنے کے لئے اس حکمت کا استعمال بہت مفید ہے۔

مثلاً قرآن میں ہے کہ وما ارسلناك الا رحمة للعالمين، یہ نہیں فرمایا کہ وما ارسلناك الا حاكما على العالمين۔ قرآن میں ہے کہ الصلح خير، یہ نہیں فرمایا کہ الحرب خير۔ قرآن میں ہے کہ انما يوفى الصابرون اجرهم بغير حساب، یہ نہیں فرمایا کہ انما يوفى المقاتلون اجرهم بغير حساب۔ پہلی آیت اتری تو فرمایا کہ اقرأ باسم ربك الذى خلق، یہ نہیں فرمایا کہ طهر الكعبة من الاصنام۔ قرآن میں ہے کہ وجاهدهم به (بالقرآن) جهادا كبيرا، یہ نہیں فرمایا کہ وجاهدهم بالسيف جهادا كبيراً۔ قرآن میں ہے کہ واعرض عن الجاهلين، یہ نہیں فرمایا کہ وقاتل عن الجاهلين

قرآن کی آیتوں کا اس طرح تقابلی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دو رویوں میں سے کون سا رویہ اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے اور کون سا غیر مطلوب۔

۱۶ فروری ۱۹۹۴

مسٹر عظیم الشان حیدر سے ملاقات ہوئی۔ وہ بہار میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ میں تقسیم کے بعد وہ ڈھاکہ چلے گئے۔ اس کے بعد کراچی گئے۔ اب وہ پاکستان کے پاسپورٹ پر کویت میں رہ رہے ہیں۔ مگر وہ اپنی زندگی سے مطمئن نہیں۔ وہ دوبارہ اپنے آبائی وطن (ہندستان) واپس آنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے وہ دہلی آئے۔ مگر قانونی مشکلات کی بنا پر بظاہر ایسا ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔

تقسیم کی تحریک نے ہندستانی مسلمانوں کو اپنے مقام سے اکھاڑ دیا۔ ۱۹۴۷ میں جو لوگ ہندستان چھوڑ کر پاکستان گئے۔ وہ وہاں مطمئن نہ ہو سکے۔ اور جو مسلمان ہندستان میں ٹھہرے وہ یہاں اسی طرح رہے جیسے کہ وہ کسی غیر ملک میں رہ رہے ہوں۔ دونوں جگہ کے مسلمان بے وطنی کے احساس میں جیتے رہے۔

اقبال نے تقسیم کی تجویز سوچی۔ مسٹر محمد علی جناح نے اس کو چلایا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس کی تائید کی۔ اس طرح کے بہت سے مسلمان ہیں جن کے نام اس تحریک سے وابستہ ہیں۔ میں حیران ہوں کہ ان لوگوں نے کیسے تقسیم کو برصغیر کے مسلمانوں کے مسئلہ کا حل سمجھا۔ حالانکہ وہ صرف ایک لغو تجویز تھی جس کا تعلق نہ اسلام سے تھا اور نہ عقل سے۔

۱۷ فروری ۱۹۹۴

قدیم عربی شاعر کا شعر ہے کہ تم یا تو عزت کے ساتھ جیو یا شرافت کے ساتھ مرجاؤ۔ تیروں کی بارش اور جھنڈوں کی پھڑپھڑاہٹ کے ہجوم میں:

عِش عزیزاً اَومِتْ واَنتَ کریمٌ   بَینَ طَعنِ القِنا وخَفقِ البُنُود

زمانۂ جاہلیت کے لوگ ثنائی طرز فکر (dichotomous thinking) میں مبتلا تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس دنیا میں جینے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ عزت کے ساتھ رہنا، اور اگر عزت کے ساتھ رہنا ممکن نہ ہو تو لڑکر مرجانا۔ اسلام نے بتایا کہ یہاں ایک تیسری صورت بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ عزت اور ذلت کے پہلو کو نظر انداز کر کے مواقع عمل کو تلاش کرنا اور حالات کے اعتبار سے جو مواقع کار ملیں ان کو استعمال کر کے زندگی کی تعمیر کرنا۔ اسی اصول کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے ہجرت فرمائی۔ اسی اصول کے مطابق آپ حدیبیہ میں صلح کر کے واپس لوٹ آئے۔ اگر آپ معاملہ کو عزت اور ذلت کی نظر سے دیکھتے تو مکہ اور حدیبیہ دونوں مقام پر مخالفین سے لڑ جاتے، خواہ اس کا نتیجہ یکطرفہ ہلاکت کی صورت میں کیوں نہ نکلے۔

مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان اس حکمت کو بھول گئے۔ اب دوبارہ وہ قدیم جاہلی طریقہ پر آگئے ہیں۔ وہ معاملات کو عزت اور ذلت کا سوال بنا کر لڑ جاتے ہیں اور اس کو غلط طور پر

جہاد اور شہادت سمجھتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی عمومی تباہی کا خاص سبب یہی ہے۔

۱۸ فروری ۱۹۹۴

مغرب کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص نے کہا کہ ہندستان کیسا عجیب ملک ہے۔ یہاں لوگ معمولی مذہبی سوالات (مثلاً مندر۔ مسجد مسئلہ) پر بھڑک اٹھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ ہندستان کا نہیں بلکہ قومی نفسیات کا معاملہ ہے۔ ہر قوم بعض معاملات میں حساس ہوتی ہے۔ ہندستان کے لوگ مذہبی معاملات میں حساس ہیں۔ مغرب کے لوگ مذہبی معاملات میں حساس نہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ بڑھی ہوئی حساسیت کا مسئلہ ان کے یہاں موجود نہیں۔ میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ سابق امریکی صدر جیرالڈ فورڈ کی بیوی نے ایک انٹرویو میں کہہ دیا کہ امریکی عورتوں کو گھر پر رہ کر اپنے بچوں کی پرورش اور تربیت کرنا چاہئے۔ یہ قوم کے لئے ان کی زیادہ بڑی خدمت ہوگی۔ اگلے دن جب جیرالڈ فورڈ نے اس بیان کو پڑھا تو انھوں نے کہا کہ میں نے کئی ملین ووٹ کھو دئے۔ چنانچہ اس کے بعد فورڈ کی مقبولیت گھٹ گئی۔ ۱۹۷۶ کے الکشن میں وہ ہار گئے۔

۱۹ فروری ۱۹۹۴

سعودی عرب کے اخبار العالم الاسلامی (۳۱ جنوری ۱۹۹۴) میں ایک مضمون بوسنیا کے تازہ احوال پر ہے۔ اس کی سرخی یہ ہے: مذابح المسلمین فی البوسنہ، هل هي اندلس جدیدة (بوسنیا میں مسلمانوں کے ذبح خانے، کیا یہ نیا اندلس ہے)

بوسنیا کے بارہ میں آجکل ہر مسلم اخبار میں اس قسم کے جذباتی مضامین چھپ رہے ہیں۔ کوئی بھی یہ نہیں سوچتا کہ جب قرآن میں یہ اصول بتایا گیا ہے کہ وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم (الشوریٰ ۳۰) تو بوسنیا کے مسلمانوں کا مطالعہ خود ان کے اپنے اعمال کی روشنی میں کرنا چاہئے۔ اور چونکہ لوگوں میں یہ قرآنی ذہن نہیں اس لئے اب تک بوسنیا کے مسلمانوں کی اپنی کوتاہیاں بھی پریس میں نہ آسکیں۔

۲۰ فروری ۱۹۹۴

ایک حدیث میں ہے کہ: المؤمن آلفٌ ومالوفٌ ولاخیر فیمن لایالف ولا یولف۔ مومن چاہنے والا اور چاہا جانے والا ہوتا ہے۔ اور اس آدمی میں کوئی بھلائی نہیں جو نہ

چاہنے والا ہو اور نہ چاہا جانے والا)

اس حدیث کو مطلق مفہوم میں یا کلی معنوں میں لینا درست نہیں۔ کیوں کہ حضرت عمر کے بارہ میں معلوم ہے کہ وہ مزاج کے سخت تھے۔ اس لئے بہت سے لوگ ان سے دور ہوگئے۔ حتی کہ یہ کہا جانے لگا کہ عمر کا کوئی دوست نہیں ہے۔ حالانکہ حضرت عمر کے مومن کامل ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اصل یہ ہے کہ کوئی بات خواہ عمومی الفاظ میں کہی جائے۔ مگر وہ بہر حال محدود مفہوم میں ہوتی ہے۔ کلام کا یہ اسلوب ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔

۲۱ فروری ۱۹۹۴

مراکو میں بادشاہی نظام ہے۔ وہاں کے سفر میں پہلی بار میں نے بادشاہت کے معاملات کو قریب سے دیکھا۔ وہاں روزانہ بادشاہ کے محل (القصر الملکی) میں دینی درس ہوتا تھا۔ بڑے بڑے علماء جمع تھے۔ ہر تقریر کرنے والا اپنی تقریر میں دیر تک بادشاہ کی تعریف کرتا اور اس کو دعائیں دیتا۔ حتی کہ یہ بھی کہتا کہ واقرّ اللّٰہ عینہ بسمو ولی عہدہ ... (خدا ولی عہد کے ذریعہ بادشاہ کی آنکھیں ٹھنڈی کرے۔ درس کے وقت بادشاہ درمیان میں اپنی مخصوص نشست پر بیٹھتا تھا۔ اور ان کے ولی عہد صاحبزادے ان کے دائیں طرف ایک مخصوص کرسی پر بیٹھتے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ وہاں ہر آدمی بادشاہ کے ذہن سے سوچتا ہے، تمام سرگرمیاں بادشاہ رخی ہو کر رہ گئی ہیں۔ آزادانہ فکر کا کوئی وجود نہیں۔ ایسے حالات میں تخلیقی ذہن کی پرورش ممکن نہیں۔

۲۲ فروری ۱۹۹۴

جرمنی کے ایک اسکالر ہندستانی مسلمانوں کے مسئلہ پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان میں میں نے بہت سے مسلمانوں سے ملاقات کی۔ آپ کے بارہ میں لوگوں نے یہ شکایت کی کہ آپ مسلمانوں کو ہمیشہ صبر کی تلقین کرتے ہیں اور ان کو اقدام سے منع کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اقدام ایک اچھی چیز ہے۔ مگر اقدام کا تعلق تمام تر حالات سے ہے ناموافق حالات میں اقدام کرنا اقدام نہیں بلکہ خودکشی ہے۔ میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ آپ لوگوں

نے نومبر ۱۹۸۹ میں برلن وال توڑنے کے لئے اقدام کیا، اور اس کو توڑ ڈالا۔ آپ مجھے بتائیے کہ دس سال پہلے اگر آپ برلن وال کو توڑنے کے لئے اٹھتے تو کیا آپ کامیاب ہو سکتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہرگز نہیں۔ دس سال پہلے اگر ہم ایسا اقدام کرتے تو برلن وال تو نہ ٹوٹتی البتہ ہم لوگ ٹوٹ کر رہ جاتے۔ میں نے کہا کہ اس مثال سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کیوں ایسا ہے کہ میں مسلمانوں کو اقدام نہ کرنے کا مشورہ دیتا ہوں۔

۲۳ فروری ۱۹۹۴

ایک عالم کی تقریر قرآن میں نسخ کے مسئلہ پر تھی۔ انھوں نے پر جوش انداز میں کہا کہ نسخ اب ختم ہو چکا ہے۔ جو ناسخ ہے وہ ہمیشہ کے لئے ناسخ ہے، جو منسوخ ہے وہ ہمیشہ کے لئے منسوخ ہے۔ اب قرآن میں کوئی مزید نسخ ہونے والا نہیں۔

عام طور پر علماء اور فقہاء کا یہی خیال ہے۔ مگر مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ یہ لوگ نسخ کے معاملہ کو صرف "تفسیر" کا ایک مسئلہ سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ نسخ ایک اصول کا مسئلہ ہے۔ نسخ کا تعلق صرف کسی آیت کی تفسیر سے نہیں ہے، وہ ایک شرعی اصول ہے۔ اور اصول کی حیثیت سے وہ ہمیشہ باقی رہے گا۔ مثلاً حالات کے اعتبار سے کبھی صبر مطلوب ہوتا ہے۔ اور کبھی اقدام۔ جب بھی حالات کا تقاضا یہ ہو کہ اقدام کے بجائے صبر کی روش اختیار کی جائے تو وہاں اقدام کا حکم منسوخ رہے گا اور صبر کے حکم پر عمل جاری رکھا جائے گا۔

۲۴ فروری ۱۹۹۴

ایک صاحب نے کہا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد نے اپنے مستقبل کی قربانی دے کر ملت کے کام کے لئے اپنے کو وقف کر دیا۔ مثلاً ڈاکٹر ذاکر حسین۔ مگر اب ایسا نہیں ہوتا۔ میں نے کہا کہ ۱۸۵۷ سے لیکر ۱۹۴۷ تک کا دور مسلمانوں کے لئے رومینٹک دور تھا۔ مغل سلطنت کا خاتمہ اور عثمانی سلطنت کا خاتمہ ایسے واقعات تھے جنھوں نے مسلمانوں میں زبردست جوش پیدا کیا۔ اعلیٰ تمناؤں کے ساتھ لوگ ملت کی قربان گاہ میں کود پڑے۔ مگر ان کی قربانیاں سراسر بے نتیجہ رہیں۔ اس معکوس انجام نے قومی سطح پر لوگوں سے ان کے حوصلے چھین لئے۔ رومینٹک دور ختم ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب ایسے افراد کہیں دکھائی نہیں دیتے۔

۱۹ ویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں جو روحانی دور تھا، اس میں اگر مسلمانوں کو دوراندیش اور زمانہ شناس اور حقیقت پسند رہنما مل جاتے تو ملت کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی۔

۲۵ فروری ۱۹۹۴

پیٹر ڈروکوز (Peter Drue Koz) کیمونزم کے موضوع پر اتھارٹی سمجھا جاتا ہے۔ اس نے اپنی ایک تازہ کتاب میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کیا وجہ ہے کہ سوویت یونین میں مذہب تو باقی رہا مگر کیمونزم فیل ہوگیا۔ اس سلسلہ میں اس نے لکھا ہے کہ کیمونزم کے پاس بحیثیت ایک نظام کے ہیرو موجود تھے۔ مگر کیمونزم بحیثیت عقیدہ کے اپنا کوئی سینٹ نہیں رکھتا تھا:

Communism as a system had its heroes, but Marxism as a creed did not have any saints.

یہ بات صحیح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح کیمونزم کے پاس بڑے بڑے جنگجو ہیرو موجود تھے، اسی طرح اس کے پاس بڑے بڑے سینٹ بھی موجود تھے۔ یہ سینٹ اس کے نظریاتی مبلغین تھے۔ البتہ یہ سوال ہے کہ مذہبی سینٹ کی طرح اشتراکی سینٹ کامیاب نہ ہوسکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مذہبی سینٹ کی حمایت میں انسان کی فطرت موجود تھی۔ جب کہ اشتراکی سینٹ کو فطرت کی حمایت حاصل نہیں ہوئی۔

۲۶ فروری ۱۹۹۴

میں ۱۱ فروری کی شام کو مراکو کے لئے روانہ ہوا تھا۔ آج صبح اس طویل سفر سے واپس آیا۔ وہاں بہت سے تجربات پیش آئے۔ مراکو کی وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیہ کی دعوت کے تحت الدروس الحسنیہ میں شرکت کے لئے یہ سفر ہوا۔

ایک روز میں اور صالح شوکات ہوٹل سے نکل کر قریب کی کالونی کی طرف گئے۔ ہم کسی مسجد کی تلاش میں نکلے تھے۔ راستہ میں مراکو کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ اپنے دو بچوں کو لئے ہوئے کہیں جا رہے تھے۔ دروس الحسنیہ کا ذکر ہوا تو مذکورہ مراکشی مسلمان اس کی

خوب تعریف کرنے لگا۔ یہ سن کر اس کے دس سالہ لڑکے نے کہا کہ ہمارے گھروں میں ٹی وی پر جب دروس حسنیہ کا پروگرام آتا ہے تو گھر والے کہتے ہیں کہ اس کو بدل دو، یہ دروس حسنیہ ہے۔ (قلّب هٰذه دروس حسنية)

یہی بات میں نے پاکستان میں سنی۔ لاہور میں ایک نوجوان نے مجھے بتایا کہ ہمارے یہاں ٹی وی پر اسلامی پروگرام دکھائے جاتے ہیں۔ مگر جب اسلامی پروگرام شروع ہوتا ہے تو گھر والے کہتے ہیں کہ اس کو بند کر دو، یہ تو اسلامی پروگرام آرہا ہے۔

موجودہ زمانہ کے اسلام پسند لیڈر ہنگامہ خیز سیاست چلا کر حکومت پر قبضہ کرتے ہیں تاکہ ریڈیو اور ٹی وی کو اسلامائز کریں۔ مگر سارے ہنگاموں کے بعد جب حکومت پر قبضہ کرکے وہ الیکٹرانک میڈیا پر اسلامی پروگرام چلاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ان کو سننے والا اور دیکھنے والا ہی نہیں۔

۲۷ فروری ۱۹۹۴

سڑک پر بے شمار سواریاں ہر وقت دوڑ رہی ہیں۔ انھیں میں سے کسی کی سواری دوسرے کی سواری سے ٹکرا جاتی ہے۔ اب اگر ٹکر کھانے والا مسافر یہ کہے کہ سڑک کی تمام سواریاں میری دشمن ہیں تو اس قول کے کوئی معنی نہیں ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ سڑک پر دوڑنے والی سواریوں کو یہ فرصت ہی نہیں کہ وہ کسی کی دشمن بنیں یا کسی کے خلاف سوچیں۔ سڑک کی ہر سواری صرف اپنے مفاد کی دوست ہے۔ یہ ایک اتفاق کی بات ہے کہ کبھی کسی کی سواری دوسرے کی سواری سے ٹکرا جاتی ہے اور کبھی نہیں ٹکراتی۔

۲۸ فروری ۱۹۹۴

انڈیا ٹوڈے (۲۸ فروری) میں ان جنگی تیاریوں کا ذکر ہے جو ہندستان اور پاکستان ایک دوسرے کے خلاف کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۵۴ اور ۱۹۹۱ کے درمیان انڈیا نے جوہری بم کی تیاری پر دو بلین ڈالر سے زیادہ سرمایہ خرچ کیا ہے:

Between 1954 and 1991, India pumped about $ 2.3 billion into its nuclear weapon programme. (p. 56)

دوسرے دفاعی اخراجات اس کے علاوہ ہیں۔ اس کو میں نے پڑھا تو میں نے سوچا کہ مفروضہ دشمن کے خلاف ہتھیار جمع کرنے کا کام ہر آدمی کرسکتا ہے۔ مگر ہوشیار آدمی وہ ہے جو ہتھیاروں میں دولت ضائع کرنے کے بجائے حکمت عملی کے ذریعہ اختلافی مسائل کو حل کرلے۔

یکم مارچ ۱۹۹۴

کل دہلی کے تمام اخباروں میں ایک روزہ اسٹرائک تھی۔ چنانچہ دہلی میں کوئی اخبار نہیں نکلا۔ ہمارے ہاکر نے آج جے پور سے نکلنے والا انگریزی اخبار راجستھان پتریکا لاکر دیا۔ اس کے ایڈیٹوریل صفحہ کے اوپر مارلے (Morley) کا یہ قول نقل کیا گیا تھا کہ اعلیٰ ذہن اس لامحدود صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے کہ وہ ٹرینوں کو پکڑ سکے:

Genius consists of an infinite capacity for catching trains.

اس دنیا میں بے شمار ٹرینیں ہیں۔ وہ خود اپنے مقرر ضابطہ کے مطابق چلتی ہیں، وہ کسی کا انتظار نہیں کرتیں۔ کم عقل لوگ ایک ٹرین کھوکر مایوسی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مگر عقل والا آدمی ایک ٹرین کھونے کے بعد دوسری ٹرین پا لیتا ہے۔ کوئی بھی چیز اس کے سفر کو روکنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔

۲ مارچ ۱۹۹۴

۲۳ مہینہ سے بوسنیا میں مسلم اور سرب کے درمیان خوں ریزی جاری تھی۔ مگر اقوام متحدہ یا امریکہ نے اب تک اس میں کوئی عملی مداخلت نہیں کی تھی۔ آج کے اخبار میں پہلی بار یہ خبر آئی ہے کہ سرب کے چار جہاز جو ممانعت کے علاقہ (no-fly zone) میں اڑ رہے تھے، ان کو امریکہ کے ماتحت ناٹو (NATO) کے جنگی جہازوں نے مار گرایا۔ فضا میں اڑتے ہوئے جہاز کو عام گن سے مارنا بے حد مشکل ہے۔ کیونکہ گن کی گولی سیدھی جاتی ہے اور اتنی دیر تک تیزی سے اڑتا ہوا جہاز آگے جا چکا ہوتا ہے۔ چنانچہ اڑتے ہوئے جنگی جہازوں کو مارنے کے لئے ایسے میزائل بنائے گئے ہیں جو جہازوں کا پیچھا کرکے اس کو مارتے ہیں۔

جنگی جہاز جب تیزی سے اڑتا ہے تو وہ فضا میں سخت گرمی پیدا کرتا ہے۔ یہ میزائل اس گرمی کی طرف دوڑتے ہیں، اس طرح وہ لازمی طور پر جہاز کو مارنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ

خبر (ٹائمس آف انڈیا ۲ مارچ) میں بتایا گیا ہے کہ گرمی کا پیچھا کرنے والے میزائل کے ذریعہ ان جہازوں کو مار گرایا گیا:

US F-16 fighters blasted the Yugoslav-made G-4 planes with heat-seeking missiles.

میں نے جب ہیٹ سیکنگ میزائل کا لفظ اخبار میں پڑھا تو اچانک قرآن کی یہ آیت یاد آگئی: فاتبعه شهاب ثاقب (الصافات ۱۰) قرآن میں پیچھا کر کے مارنے کی بات اس وقت سے موجود ہے جبکہ ساری دنیا میں کوئی شخص اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

۳ مارچ ۱۹۹۴

دھولا کنواں (نئی دہلی) میں ایک بڑے مسلمان افسر رہتے ہیں۔ ان کا ٹیلی فون آیا تھا کہ ہم اپنے یہاں ۳ مارچ کو افطار کی ایک مجلس کر رہے ہیں۔ آپ بھی اس میں شرکت کریں۔ میرے ذہن میں یہ تھا کہ کھانے کے بعد وہاں لوگ بیٹھیں گے اور کچھ دین کی باتیں کہنے کا موقع ہوگا۔ چنانچہ میں چلا گیا۔

یہ مسلمانوں کے اپر مڈل کلاس کی ایک مجلس تھی۔ لوگ دیر تک کھاتے پیتے رہے اور اپنی اپنی باتیں سناتے رہے۔ کسی نے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ قرآن و حدیث کی کوئی بات بتائیے۔ یہ مسلمانوں کا حال ہے۔ دوسری طرف ہندوؤں میں جب بھی میں جاتا ہوں تو وہاں وہ لوگ ہمیشہ کچھ اسلامی باتیں سننے کی خواہش کرتے ہیں۔ مثلاً رشی کیش کے سفر میں ایک مجلس میں چند ہندو تھے۔ ایک پنڈت جی نے مجھ سے کہا: اسلام کی کوئی وششیش بات بتائیے۔

۴ مارچ ۱۹۹۴

رباط (مراکو) کے الدروس الحسنیہ میں جو لوگ شرکت کے لئے آئے تھے ان میں سے ایک دکتور ابراہیم الرفاعی تھے۔ وہ کویت یونیورسٹی میں شعبۂ جیالوجی کے ہیڈ ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ کچھ مجلسی مزاج کے ہیں۔ اور اکثر تفریحی باتوں میں وقت صرف کرتے ہیں۔ ۲۶ فروری کو میں اور وہ دونوں رباط سے واپس ہوئے۔ آخری دن میں نے ان کو ایک بند لفافہ دیا اور کہا کہ اس کو آپ ابھی نہ کھولیں بلکہ کویت پہنچ کر وہاں اسے کھول کر پڑھیں۔ اس میں میں نے عربی میں یہ جملہ لکھا تھا:

الحياة اغلیٰ من ان تصرف فی شئ ادنیٰ مستوی من الغایة العلیا۔ (زندگی اس سے زیادہ قیمتی ہے کہ اس کو مقصد اعلیٰ سے کم تر کسی چیز میں صرف کیا جائے۔)

۵ مارچ ۱۹۹۴

مراکو کے سفر (فروری ۹۴) میں ایک نوجوان نے بوسنیا کے مسلم لیڈر علی عزت بیغوفتش کی کی کتاب کا عربی ترجمہ "البیان الاسلامی" دکھایا۔ اس کے مقدمہ میں مصنف نے ۱۹۸۰ میں لکھا تھا:

بهذا الایمان نعلن لاصدقائنا واعدائنا ان المسلمین قد عقدوا العزم علیٰ تولی زمام مصیر عالم الاسلامی بایدیهم وتدبیر شئونهم وفقا لمفهوم الاسلام عندهم۔

۶ مارچ ۱۹۹۴

انگریزی روزنامہ پائنیر نے ہندستان کے موجودہ کرپشن کے بارے میں ایک سروے کرایا۔ یہ سروے پائنیر کے شمارہ ۶ مارچ میں شائع ہوا ہے۔ اس سروے کے مطابق ۶۱ فیصد لوگوں نے یہ بتایا کہ سیاست داں بنیادی طور پر کرپشن کے ذمہ دار ہیں۔ چنانچہ اخبار نے رپورٹ کی سرخی حسب ذیل الفاظ میں قائم کی ہے:

Politicians to blame for corruption

عام طور پر لوگ یہی بات کہتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ سیاست داں عام انسانوں سے الگ کوئی مخلوق نہیں۔ وہ بھی دوسرے انسانوں کی طرح ہیں۔ اصل یہ ہے کہ سیاست کا پیشہ آدمی کو اقتدار تک پہنچاتا ہے۔ اور اقتدار آدمی کو کرپٹ بناتا ہے۔ لارڈ ایکٹن نے نہایت درست طور پر کہا کہ اقتدار بگاڑتا ہے اور کامل اقتدار بالکل بگاڑ دیتا ہے۔

Power corrupts and absolute power corrupts absolutely.

زیادہ صحیح بات یہ ہوگی کہ اس طرح کہا جائے کہ ارباب اقتدار کرپشن پیدا کرتے ہیں نہ کہ ارباب سیاست)، جن لوگوں نے مذکورہ سروے میں حصہ لیا ان کو اگر اقتدار حاصل ہو جائے تو یقینی ہے کہ وہ بھی وہی کریں گے جو موجودہ سیاست داں کر رہے ہیں۔
دوسرے کے بارے میں حکم لگانا کتنا آسان ہے اور خود اپنے بارے میں حکم لگانا کتنا مشکل۔

۷ مارچ ۱۹۹۴

مولانا انیس لقمان ندوی سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ شاہ ولی اللہ دہلوی کو بہت سے لوگ دور جدید کا امام کہتے ہیں۔ مگر یہ بالکل بے اصل بات ہے۔ دور جدید کا طرز فکر سائنٹفک طرز فکر ہے۔ جب کہ شاہ صاحب کے یہاں تقلیدی طرز فکر پایا جاتا ہے۔ پھر وہ دور جدید کے امام کس طرح ہو سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے وقت کے مسجع اسلوب کو چھوڑ کر ایک نیا اسلوب اختیار کیا جیسے ابن خلدون نے اختیار کیا تھا۔ مگر فکری اعتبار سے ان کو دور جدید کا امام نہیں کہا جا سکتا۔

سائنٹفک طرز فکر سے مراد تجزیاتی طرز فکر ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ۶۱۰ء میں ہوئی۔ اس وقت مکہ کے مشرکین نے حج کو شمسی کیلنڈر کے اوپر جاری کر رکھا تھا۔ رسول اللہ کے مشن کا ایک جز یہ بھی تھا کہ حج کو دوبارہ قمری کیلنڈر پر قائم کیا جائے۔ مگر آپ نے ۶۱۰ء میں اس مسئلہ کو نہیں چھیڑا۔ ۶۳۰ء میں مکہ فتح ہو گیا تب بھی آپ نے اس طریقہ کے خاتمہ کا اعلان نہیں کیا۔ آپ نے اس کا اعلان حجۃ الوداع کے موقع پر ۶۳۲ء میں کیا۔ سنین کا تقابل کر کے اس مسئلہ پر غور کرنا یہی تجزیاتی مطالعہ ہے، اور یہی جدید اسلوب ہے۔ مگر شاہ صاحب کے یہاں اس طرز مطالعہ کی مثال نہیں ملتی۔ ان کی تمام کتابیں قدیم روایتی اسلوب پر لکھی گئی ہیں۔

۸ مارچ ۱۹۹۴

آجکل میں اپنی کتاب "عظمت اسلام" کی تکمیل میں رات دن مصروف رہتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ میری آخری کتاب ہوگی یا مجھے کوئی اور کتاب لکھنے کی توفیق حاصل ہوگی۔ لوگوں کی بیہودہ دستیوں نے زندگی اتنی تلخ کر دی ہے کہ ہر لمحہ یہ دعا نکلتی ہے کہ خدایا مجھے معدوم کر دے۔ کیوں کہ ان ناانسان انسانوں کے درمیان جینے کی طاقت میرے اندر نہیں۔ اب اس کے سوا زندگی کی کوئی تمنا نہیں کہ میں اسلام کے بارہ میں کچھ کتابیں لکھ سکوں جو میرے ذہن میں سمائی ہوئی ہیں۔ تاہم یہ کوئی آسان کام نہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے لئے مجھے موت کے سمندر میں جینا پڑے گا۔

۹ مارچ ۱۹۹۴

پاکستان کے بانی مسٹر محمد جناح نے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے ۱۳ جنوری ۱۹۴۸ کو اسلامیہ کالج پشاور میں ایک تقریر کی۔ اس میں انھوں نے کہا: ہم نے پاکستان کا مطالبہ صرف ایک خطۂ زمین حاصل کرنے کے لئے نہیں کیا تھا، بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔

پاکستان کے اسلام پسند بانیٔ پاکستان کے اس قول کو بہت زیادہ دہراتے ہیں۔ پاکستان کی ہر حکومت کے خلاف مطالباتی مہم میں اس کو استعمال کیا گیا ہے۔ مگر پاکستان کے کسی عالم یا دانشور نے یہ نہیں سوچا تقسیم ملک کی پرشور تحریک چلا کر ایک خطۂ ارض حاصل کرنے سے اسلامی نظام کیسے قائم ہو جائے گا۔ اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے فکری انقلاب درکار ہوتا ہے نہ کہ ارضی تقسیم۔

ایک آدمی اگر درخت سے ایک شاخ کاٹ لے اور اس کو زمین میں گاڑ دے۔ اگلے دن جب وہ شاخ سوکھ جائے تو وہ لاؤڈ اسپیکر لگا کر چیخے کہ ہم نے شاخ کو درخت سے کاٹ کر یہاں اس لئے نہیں لگایا تھا کہ وہ سوکھ جائے بلکہ اس لئے لگایا گیا تھا وہ ایک ہرا بھرا درخت بنے، تو ایسے آدمی کے اس قول کو استعمال نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کی تصحیح کی جائے گی۔ یہ کہا جائے گا کہ ہرا بھرا درخت بیج سے بنتا ہے نہ کہ کٹی ہوئی شاخ سے۔ اسی طرح مسٹر جناح کا مذکورہ قول (یا اس طرح کے دوسرے اقوال) قابل اصلاح ہیں نہ کہ قابل استعمال۔

۱۰ مارچ ۱۹۹۴

مسٹر چکرورتی (Saurik Chakraverti) ایک ذہین ہندو نوجوان ہیں۔ وہ سری اروبندو مارگ میں رہتے ہیں۔ ان کا ٹیلیفون نمبر (663630) ہے۔ وہ ملاقات کے لئے آئے اور اپنی انگریزی کتاب (From Poverty to Ayodhya) پیش کی جو ۳۲۴ صفحہ پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے دکھایا ہے کہ آزادی کے بعد ہندستان کی تعمیر نو کے لئے جو نہرو ماڈل (سوشلسٹ ماڈل) اختیار کیا گیا وہ ایک غلط انتخاب تھا۔ اور یہی ہماری اکثر مصیبتوں کا سبب ہے۔

مسٹر چکرورتی سے میں نے پوچھا کہ ۱۹۵۵ میں آپ کی عمر کیا تھی۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت

تو میں دنیا میں موجود بھی نہیں تھا۔ کیوں کہ میری پیدائش ۱۹۵۰ میں ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ ۱۹۵۵ میں جب جواہر لال نہرو نے کانگریس کے آوڈی اجلاس میں (Socialistic pattern of society) کی تجویز منظور کرائی تھی، اسی وقت میں نے اس کے خلاف ایک مفصل آرٹیکل لکھا تھا اور اس کی سخت مخالفت کی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ سوشلسٹ پیٹرن ہمارے دیش کو تباہ کر دے گا۔ یہ سن کر مسٹر چکرورتی بہت خوش ہوئے۔

۱۱ مارچ ۱۹۹۴

دہلی میں ایک پولیس افسر مسٹر آر کے کھنا ہیں۔ ان کے گھر کا ٹیلیفون نمبر 387979 ہے۔ ایک دو بار ان سے ملاقات ہوئی ہے۔ آج صبح میں نے کسی وجہ سے ان کے گھر پر ٹیلیفون کیا۔ انھوں نے رسیور اٹھایا تو میں نے کہا "میں نظام الدین سے آپ کا بھائی بول رہا ہوں۔ انھوں نے غصہ اور نفرت کے لہجہ میں کہا کہ "گدھے" اور فوراً رسیور رکھ دیا۔

خدا کے فضل سے مجھے جوابی غصہ نہیں آیا۔ بلکہ میں سوچنے لگا کہ ایسا کیوں ہوا۔ میری سمجھ میں آیا کہ یہ خود میری غلطی تھی۔ دادا قسم کے لوگ انھیں تنگ کرنے کے لئے اس قسم کے ٹیلیفون کرتے ہوں گے۔ میں نے جب کہا کہ میں آپ کا بھائی بول رہا ہوں تو ان کو میری شناخت نہ ہو سکی۔ حسب معمول وہ سمجھے کہ یہ کوئی دادا بول رہا ہے۔

پانچ منٹ بعد میں نے دوبارہ ٹیلیفون ملایا۔ ربط قائم ہونے کے بعد میں نے کہا کہ میں نظام الدین ویسٹ سے وحید الدین بول رہا ہوں۔ انھوں نے فوراً کہا: اچھا، مولانا جی بول رہے ہیں۔ نمسکار۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ پہلے انھوں نے غصہ اور نفرت کے ساتھ جواب دیا تھا۔ اب وہ ادب اور احترام کے ساتھ بولنے لگے۔

یہ تجربہ بتاتا ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کو یہاں کی پولیس سے جو شکایت ہے، اس کی حقیقت کیا ہے۔ مسلمان پولیس کے سامنے ایسے انداز میں آتے ہیں جو دادا والا انداز ہوتا ہے۔ اس لئے پولیس والے ان کو دادا سمجھ کر بھڑک اٹھتے ہیں۔ مسلمان اگر "مولانا جی" کے روپ میں ان کے سامنے آئیں تو یہی پولیس والے ان کے سامنے جھک جائیں گے اور شرافت اور اخلاق کا سلوک کریں گے۔

۱۲ مارچ ۱۹۹۴

لاہور کے اردو روزنامہ نوائے وقت (۲۴ فروری ۱۹۹۴) میں ڈاکٹر مسعود عالم قاسمی (بھارت) کے نام سے ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں ایک مضمون چھپا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندستان کے ۲۰ کروڑ مسلمانوں کو اس ملک میں انتہائی سنگین مسائل کا سامنا ہے۔ حتی کہ ان کا بقاء اور تحفظ غیر یقینی ہوگیا ہے۔ اس سلسلہ میں ان سات باتوں کا ذکر ہے جن کو یہاں کی ہندو اکثریت نے اپنا نصب العین بنایا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے:

مسلمانوں کو ایسے سنگین مسائل میں الجھا دیا جائے کہ وہ ہندوؤں میں اسلام کی تبلیغ و دعوت کا کام ہی نہ کرسکیں اور ان کی ساری سرگرمیاں خود اپنے وجود کے سوال پر مرتکز ہو کر رہ جائیں۔

یہ بات لغویت کی حد تک غلط ہے۔ اگر دعوت و تبلیغ کی یہ شرط ہو کہ مدعو کی طرف سے نہایت موافق حالات فراہم کئے جائیں تاکہ وہ بسہولت اپنی دعوتی ذمہ داری کو ادا کرسکیں تو یہ اہتمام تو کسی بھی پیغمبر بشمول پیغمبر آخر الزماں، کے ساتھ نہیں کیا گیا۔ پھر وہ مسلمانوں کے ساتھ کیوں کر ممکن ہوسکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمانوں کے نااہل رہنماؤں اور دانشوروں نے کبھی بھی ہندوؤں کو مدعو نہیں سمجھا بلکہ صرف حریف سمجھا۔ اسی لئے انھوں نے ایسی لایعنی تحریکیں چلائیں جن کے نتیجہ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان داعی اور مدعو کا تعلق قائم ہی نہ ہوسکا۔ ان لایعنی تحریکوں میں پاکستان کی تحریک سرفہرست ہے جس نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان ابدی نفرت کا ایک پہاڑ کھڑا کر دیا۔

۱۳ مارچ ۱۹۹۴

بنگلور کے ڈاکٹر احمد سلطان صاحب کا ٹیلیفون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ بنگلور میں ان کے علاقہ میں ایک ہندو رہتے ہیں ان کا نام راما سوامی ہے۔ وہ اپنے لڑکے چندر اپا سے غصہ ہوگئے اور بولنا ترک کر دیا۔ یہ صورتحال چار سال سے قائم تھی۔ چندر اپا ڈاکٹر صاحب سے ملے اور کہا کہ میرے باپ چار سال سے مجھ سے غصہ ہیں اور بولتے نہیں ہیں اس لئے آپ کچھ کیجئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ تم اپنے باپ کے پاؤں پر گر پڑو۔ ان کے پاؤں کو بوسہ دو اور کہو کہ باپ مجھ کو چھما کیجئے۔ لڑکے نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد باپ نے بیٹے کو سینہ

سے لگالیا۔ دونوں رونے لگے ۔ چار سال کی ناراضگی چار منٹ میں ختم ہوگئی۔

بنگلور کے کچھ مسلمانوں کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپ نے بیٹے کو باپ کا سجدہ کروایا۔ یہ تو شرک ہے اور شرک کو اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے۔ ڈاکٹر احمد سلطان نے کہا کہ میں اس کو شرک نہیں سمجھتا۔ تاہم بالفرض اگر ظاہری طور پر وہ شرک بھی ہو تو رفع اختلاف کے لئے وقتی تدبیر کے طور پر وہ جائز ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو شرک کرتے ہوئے دیکھا مگر اس اندیشہ کی بنا پر خاموش رہے کہ اگر انھوں نے کوئی کارروائی کی تو بنی اسرائیل میں تفریق پڑ جائے گی۔ (طٰہٰ ۹۴)

۱۴ مارچ ۱۹۹۴

ڈاکٹر عبد الماجد صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر ہیں۔ اور ذاکر نگر میں رہتے ہیں۔ انھوں نے ٹیلیفون پر بتایا کہ میرے گھر کے سامنے چائے کا ہوٹل ہے۔ اس میں ریڈیو رات دن فل اسپیڈ سے بجتا رہتا ہے۔ اس کی تیز آواز میرے کمرہ میں آتی ہے جو مسلسل مجھے ڈسٹرب کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح میرے پڑوس میں روزانہ جوا ہوتا ہے۔ یہ جوا کیرم بورڈ پر ہوتا ہے۔ ہر ہارنے والا مالک مکان کو پانچ روپیہ دیتا ہے۔ گویا ایک دن اگر سو آدمی ہاریں تو مالک مکان کو گھر بیٹھے پانچ سو روپیہ مل گیا۔

ڈاکٹر ماجد صاحب ان چیزوں سے سخت پریشان تھے۔ یہ چیزیں ان کے علمی کام میں رکاوٹ بنی ہوئی تھیں۔ کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ آپ پولیس میں رپورٹ کیجئے۔ ڈاکٹر ماجد صاحب نے اپنے شیخ مولانا مسیح اللہ خاں صاحب (   ) کو خط لکھا اور پوچھا کہ اس صورت حال میں مجھے کیا کرنا چاہئے۔ مولانا نے جواب دیا کہ آپ کوئی جوابی کارروائی نہ کیجئے۔ بس اس سے اپنی توجہ ہٹا لیجئے اور اپنی کھڑکی بند کر لیجئے۔ ڈاکٹر ماجد صاحب نے بتایا کہ میں نے شیخ کے اس مشورہ کو پکڑ لیا اور اب خدا کے فضل سے میں اپنے گھر میں سکون کے ساتھ اپنا علمی کام کرتا ہوں۔

مولانا مسیح اللہ خاں صاحب کا یہ مشورہ نہایت درست تھا۔ مگر تعجب یہ ہے کہ اپنے ذاتی معاملات میں لوگ نہایت آسانی سے اس مشورہ کو مان لیتے ہیں۔ لیکن ملی معاملات میں اس کو

ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ الرسالہ میں مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے پیش آنے والی ناخوشگوار باتوں سے اعراض کا طریقہ اختیار کریں۔ یعنی اس سے اپنی توجہ ہٹالیں۔ ذاتی انٹرسٹ کے معاملات میں ہر آدمی اسی اصول کو اختیار کئے ہوئے ہے۔ مگر ملی انٹرسٹ کے معاملہ میں کوئی اس اصول کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ حتی کہ مشورہ دینے والے پر یہ لیبل لگا دیا جاتا ہے کہ وہ ہندوؤں کا ایجنٹ ہے۔ اس تضاد نے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو ہر جگہ برباد کر رکھا ہے

۱۵ مارچ ۱۹۹۴

عربی ہفت روزہ الدعوۃ (ریاض) کے شمارہ ۲۴ فروری ۱۹۹۴ کے مطابق، ملیشیا کے وزیر اعظم ماثر محمد نے کہا ہے کہ اشتراکیت کے خاتمہ کے بعد اب دنیا میں تمام انسانوں کے لئے ایک ہی انتخاب رہ گیا ہے، اور وہ اسلام ہے (ان الاسلام اصبح الیوم الخیار الوحید للبشریۃ بعد انھیار الشیوعیۃ فی العالم) صفحہ ۶۔

اس قسم کی باتیں آجکل بہت سے مسلمان کہتے ہیں۔ مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے اس حقیقت کو انھوں نے بطور فخر دریافت کیا ہے۔ اس کو انھوں نے دعوتی امکان کے طور پر دریافت نہیں کیا۔ اگر وہ اس کو دعوتی امکان کے طور پر دریافت کرتے تو اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے کہ اب آخری وقت آگیا ہے کہ ہم صبر کے اصول پر عمل کرتے ہوئے دنیا کی قوموں سے ہر قسم کا ٹکراؤ یک طرفہ طور پر ختم کر دیں۔ کیوں کہ ٹکراؤ کے ماحول میں اس عظیم دعوتی امکان کو استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

دعوت کی مصلحت کے لئے اسی یکطرفہ صبر کا نام حدیبیہ پرنسپل ہے۔ جو لوگ دعوت کی بات کریں مگر وہ حدیبیہ پرنسپل کی بات نہ کریں انھوں نے اصل حقیقت کا صرف ۵۰ فیصد دریافت کیا۔

۱۶ مارچ ۱۹۹۴

موجودہ زمانہ کی مسلم صحافت جذباتی صحافت کا دوسرا نام ہے۔ ہر ملک کے اخبارات کا اس معاملہ میں ایک ہی حال ہے۔ مکہ کے عربی اخبار العالم الاسلامی (۲۸ فروری ۱۹۹۴)

میں وجہاً لوجہ کے مستقل کالم میں منیر حسن منیر کا مضمون شائع ہوا ہے۔ اس کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو موجودہ حالات میں مسلمانوں کو تحمل کا مشورہ دے رہے ہیں۔ اس کا عنوان ہے: ضبط النفس، ضبط النفس ولکن الیٰ متی ؟ اس پرجوش اور جذباتی تحریر کا خاتمہ ان اشعار پر ہوا ہے:

الوحش یقتل ثائراً   والارض تنبتُ الف ثائر
یا کبریاء الجرح لومتنا   لحاربت المقابر

ترجمہ: درندہ ایک باغی کو قتل کرتا ہے   اور زمین ہزار باغی پیدا کردیتی ہے
اے عظمتِ زخم اگر ہم مر جائیں   تو ہماری قبریں تم سے لڑیں گی

یہ بلاشبہ لفظوں سے کھیلنا ہے۔ موجودہ زمانہ میں بدقسمتی سے اس قسم کے خطیب اور ادیب اور شاعر مسلمانوں کے رہنما بن گئے جو لفظوں سے کھیلتے تھے اور نتیجۃً مسلمانوں کا وہ حال ہوا جو اس عربی شعر میں بتایا گیا ہے:

اذا کان الغراب رئیس قوم   سیھدیھم الیٰ دار البوارِ

۱۷ مارچ ۱۹۹۴

مہاتما گاندھی نے ۱۹۴۷ سے پہلے کہا تھا: "ہم سوئے ہوئے تھے۔ انگریز ہمیں جگانے آئے ہیں"۔ یہ ایک سادہ سا جملہ ہے مگر وہ بہت اہم بات ہے۔ اگر آپ دشمن کو دشمن کہیں تو آپ کے اندر نفرت اور عناد کا مزاج پرورش پائے گا۔ لیکن اگر اپنے دشمن کے بارہ میں آپ یہ کہیں کہ وہ تو ہم کو جگانے کے لئے یہاں آئے ہیں تو اس صورت میں نفرت کے بجائے آپ کے اندر جاگ پیدا ہوگی۔ پہلی صورت میں آپ کے اندر نفرت کی آگ جلنے لگتی، مگر دوسری صورت میں آپ کے اندر یہ سوچ ابھرے گی کہ اس چیلنج کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔

علماء ہند کے تذکرہ میں اکثر یہ لکھا ہوا رہتا ہے کہ حضرت کو انگریزوں سے سخت نفرت تھی۔ اسی نفرت کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ انگریزوں کے مقابلہ میں موثر تدبیر اختیار نہ کرسکے۔ انھوں نے ایک طرف ان سے بے سود قسم کی مسلح لڑائی چھیڑ دی۔ دوسری طرف قوم کو انگریزی پڑھنے سے روکا۔ لیکن گاندھی اس قسم کی نفرت میں مبتلا نہیں ہوئے۔ اس لئے وہ انگریزوں کے مقابلہ کے لئے زیادہ موثر تدبیر سوچنے میں کامیاب ہوئے۔ نیز انھوں نے یہ غلطی نہیں کی

کہ انگریزوں کی ضد میں انگریزی زبان اور انگریزی علوم کے مخالف ہو جائیں۔

۱۸ مارچ ۱۹۹۴

جناب محمد اسلم صاحب ہوم منسٹری میں ایک افسر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہندستان کی پوری مسلم آبادی کا ۵۲ فیصد حصہ یوپی، بہار اور بنگال میں رہتا ہے۔ مگر اسی علاقہ کے مسلمان سب سے زیادہ پس ماندہ ہیں۔ یہ علاقہ جس کو عام طور پر شمالی ہند کہا جاتا ہے تعلیم میں بھی پیچھے ہے۔ اور اقتصادیات میں بھی پیچھے۔ اس کے مقابلہ میں جنوبی ہند کے مسلمان ہر اعتبار سے کافی آگے ہیں۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یوپی، بہار اور بنگال کے علاقہ میں علماء کی سرگرمیاں بہت زیادہ جاری رہی ہیں۔ جنوبی ہند کے مقابلہ میں شمالی ہند میں ہمارے علماء کئی سو سال سے سرگرم عمل ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ جس علاقہ میں علماء کی سرگرمیاں زیادہ ہیں وہ پیچھے ہے۔ اور جس علاقہ تک علماء کی سرگرمیاں نہیں پہنچیں یا بہت کم پہنچیں وہ مقابلۃً بہت آگے ہیں۔ اس سوال کا غالباً کوئی بھی ایسا جواب نہیں دیا جا سکتا جس میں علماء اس کی ذمہ داری سے بری قرار پاتے ہوں۔

۱۹ مارچ ۱۹۹۴

۱۷ مارچ کو میں پارلی منٹ انیکسی کے ایک اجتماع میں شریک ہوا۔ اس میں کئی بڑے بڑے ہندو آئے ہوئے تھے۔ مثلاً ایل کے اڈوانی، اٹل بہاری باجپئی، شیوراج پاٹل وغیرہ۔ یہ اجتماع ایک کتاب کو ریلیز کرنے کے نام پر ہوا جو پنڈت دین دیال اپادھیائے پر لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر مہیش شرما ہیں۔

پنڈت دین دیال اپادھیائے (۱۹۶۸ - ۱۹۱۶) جن سنگھ کے بانیوں میں سے تھے۔ مسلمان ان کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اکثر مسلمانوں کے خلاف بولتے تھے۔ مثلاً انھوں نے کہا کہ مسلمان کیوں ایسا کہتے ہیں کہ "میرے مولا بلا لے مدینے میں"۔ مسلمان بھارت میں رہتے ہیں اور مکے مدینے کا گیت گاتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دیش کے وفادار نہیں۔ حالانکہ اس کا آسان جواب یہ ہے یہ کچھ عوامی قسم کے لوگوں کے گیت ہیں۔ وہ مسلمانوں کا کوئی ملی گیت نہیں۔

مذکورہ کتاب میں پنڈت اپا دھیائے کے بعض قابل قدر واقعات ہیں۔ مثلاً ۱۹۶۲ میں وہ جون پور کے علاقہ سے لوک سبھا کی سیٹ کے لئے کھڑے ہوئے۔ ان کے مقابلہ میں کانگرس کا امیدوار تھا۔ الکشن ہوا تو پنڈت اپا دھیائے ہار گئے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے حریف کے خلاف پٹیشن دائر نہیں کیا بلکہ اپنی ہار کو تسلیم کرلیا۔ وہ کامیاب امیدوار کے گھر پر گئے، اس کو ہار پہنایا اور اس کی جیت پر اس کو مبارک باد دی۔

۲۰ مارچ ۱۹۹۴

کشمیر کے تین مسلم طالب علم ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے کشمیر یونیورسٹی سے ماس کمیونی کیشن اینڈ جرنلزم کا کورس کیا ہے۔ آجکل وہ انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس میں تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ گفتگو کے بعد آخر میں انھوں نے کہا کہ مسلم طالب علموں کے لئے آپ کا مشورہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ صرف طالب علم بنیں، اس کے سوا کچھ اور بننے کی کوشش نہ کریں۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ سخت مقابلہ کا زمانہ ہے۔ آج صرف امتیاز (excellence) کی قیمت ہے۔ اور امتیاز کا درجہ یکسوئی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

۲۱ مارچ ۱۹۹۴

پاکستان کے ایک مذہبی جریدہ نے لکھا ہے کہ ہندستان میں مسلمان خطرے میں ہے، اور پاکستان میں اسلام خطرے میں ہے۔ (ماہنامہ الفاروق، کراچی، رجب ۱۴۱۴ھ)

یہ ایک نادانی کا تبصرہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ ہندستان میں مسلمان غیر محفوظ ہے اور نہ پاکستان میں اسلام غیر محفوظ ہے۔ البتہ نا اہل مسلم رہنماؤں نے دونوں ملکوں میں مسلمانوں کے لئے اور اسلام کے لئے غیر ضروری مسائل پیدا کر رکھے ہیں۔ ہندستان میں ان رہنماؤں نے دو قومی تحریک اور احتجاجی تحریک جیسی سیاستیں چلا کر یہ نقصان پہنچایا کہ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تلخی اور کشیدگی کی فضا پیدا ہوگئی۔ یہی مصنوعی فضا مسلمانوں کے تمام مسائل کا اصل سبب ہے۔ یہاں کے مسلمان اگر ہوشمندی کے ساتھ رہنا سیکھ جائیں تو وہ ہندستان میں بھی اسی طرح امن کے ساتھ رہ سکتے ہیں جس طرح سعودی عرب یا امریکہ میں وہ رہ رہے ہیں۔

اسی طرح پاکستان کے تمام مسائل نام نہاد اسلام پسندوں کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ وہ نفاذ شریعت کے نام پر اٹھے تھے۔ اس لئے انھیں حکمت اور تدریج کے ساتھ کام کرنا چاہئے تھا۔ مگر انھوں نے نفاذ شریعت کے نام سے حکمرانوں سے ٹکراؤ شروع کر دیا۔ اسی غیر ضروری ٹکراؤ نے پاکستان کے موجودہ تمام مسائل پیدا کئے ہیں۔

۲۲ مارچ ۱۹۹۴

ہندستان میں مسلمانوں کو جو کام کرنا ہے اس میں سے ایک خاص کام یہ ہے کہ وہ ہر جگہ ایسے ابتدائی اسکول قائم کریں جو سرکاری گرانٹ یا عوامی چندے پر نہ چلائے جائیں، بلکہ تعلیمی فیس کی بنیاد پر چلائے جائیں۔ فیس کی مقدار اتنی کافی ہونی چاہئے کہ اسکول کا پورا خرچہ اس سے نکل سکے۔ ایسے اسکول کی کامیابی کا یقینی راز یہ ہے کہ اس کا تعلیمی معیار نہایت اچھا ہو۔ جب لوگ دیکھیں گے کہ اس کے طلبہ امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوتے ہیں تو بڑی بڑی فیس دے کر بھی وہ اپنے بچوں کو اس میں داخل کرائیں گے۔ یہ ایک زبردست امکان ہے جس سے فائدہ اٹھا کر ہندستان کے مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کر سکتے ہیں۔ کشمیر (راجوری) کے ایک صاحب سے ملاقات کے وقت میں نے یہ بات کہی۔

جناب فاروق مضطر صاحب جو الرسالہ مشن سے اول دن سے وابستہ ہیں وہ اسی نہج پر راجوری میں ایک تعلیمی ادارہ چلا رہے ہیں اور خدا کے فضل سے نہایت کامیاب ہیں۔ انھوں نے اس معاملہ میں ایک عمدہ مثال قائم کی ہے۔

۲۳ مارچ ۱۹۹۴

انڈیا کے موجودہ فائننس منسٹر ڈاکٹر من موہن سنگھ ملک کے اقتصادی ڈھانچہ میں انقلابی تبدیلی لارہے ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہے کہ وہ ملک میں فری اکانومی کا نظام قائم کریں۔ اس نظام میں ان لوگوں کو خطرہ محسوس ہو رہا ہے جو اب تک ریاستی اکانومی کے نظام میں بڑے بڑے فائدے حاصل کر رہے تھے۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۳ مارچ ۹۴) کے مطابق ڈاکٹر من موہن سنگھ نے لوک سبھا میں ان لوگوں کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ آپ لوگوں کے لئے دو ہی راستے ہیں ـــــ یا مقابلہ کیجئے یا مٹ جائیے:

ہندستان کے پہلے وزیراعظم جواہرلال نہرو اور ان کے ساتھیوں نے یہ سمجھا تھا کہ ان کے لئے مقابلہ اور تحفظ میں انتخاب ہے۔ چنانچہ انھوں نے مقابلہ کا راستہ چھوڑ کر اقتصادی تحفظ کا راستہ اختیار کیا۔ مگر ۴۴ سال کے تباہ کن تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ اس دنیا میں آدمی کے لئے حقیقی انتخاب مقابلہ اور ہلاکت کے درمیان ہے نہ کہ مقابلہ اور تحفظ کے درمیان۔ یعنی اگر آپ مقابلہ سے کترائیں گے تو آپ ہلاکت کے گڑھے میں گر پڑیں گے، مقابلہ سے کترا کر تحفظ کا مقام کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔

۲۴ مارچ ۱۹۹۴

محمد شعیب عالم ایک مسلم نوجوان ہیں، وہ جامعہ نگر کے علاقہ میں رہتے ہیں اور جامعہ میں بی اے کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ٹیلیفون نمبر 6835926 ہے۔

انھوں نے بتایا کہ ان کے علاقہ کے ایک درجن مسلم طلبہ نے مل کر ایک تنظیم بنائی ہے جس کا نام اسٹوڈینٹس اسکواڈ فار ایجوکیشنل پرموشن (SSEP) ہے۔ اس تنظیم کا واحد نشانہ تعلیم ہے۔ ان کا ماٹو یہ ہے: خود پڑھیں، دوسروں کو پڑھائیں۔

یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی۔ اوکھلا کے علاقہ کے بارہ میں عام تصور یہ ہے کہ یہاں کے مسلم نوجوان صرف تخریبی کاموں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ مگر مذکورہ تنظیم بتاتی ہے کہ اگر کچھ مسلم نوجوان تخریبی سرگرمیوں میں مصروف ہیں تو کچھ دوسرے مسلم نوجوان تعمیری کام بھی کر رہے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں لوگ عام طور پر اخباروں کے اتنا زیادہ عادی ہو گئے ہیں کہ وہ خود اپنے علاقہ کی باتوں کو بھی اخبار میں پڑھتے ہیں۔ چونکہ اخباروں میں صرف گرماگرم خبروں (hot news) کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ اس لئے لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ جو کچھ اخبار میں چھپا ہے وہی کل بات ہے۔ حالانکہ اس کے علاوہ بھی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو اگرچہ بطور واقعہ موجود رہتی ہیں مگر اخباروں کے صفحات میں ان کو جگہ نہیں ملتی۔ اس اخباری مطالعہ نے موجودہ زمانہ میں بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر حالات میں جاننا بھی گویا نہ جاننے کے ہم معنی ہوتا ہے۔

۲۵ مارچ ۱۹۹۴

مولانا انیس لقمان ندوی سے میں نے کہا کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کی تاریخ صدیوں سے رکی ہوئی ہے۔ اس کا اقرار سب کو ہے۔ مگر عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ اسلام کی تاریخ کو اسلام کے دشمنوں نے روک رکھا ہے۔ مگر یہ بات لغویت کی حد تک بے بنیاد ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کی تاریخ رک جانے کا واحد سبب "عزیمت" کا غلط تصور ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اقتدار کو چیلنج کرنا عزیمت ہے۔ حالانکہ قرآن میں فرمایا کہ فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل۔ اس سے معلوم ہوا کہ صبر کا نام عزیمت ہے نہ کہ بے صبری کے ساتھ ٹکرا جانے کا۔

اصل عزیمت یہ ہے کہ ارباب اقتدار سے اعراض کرتے ہوئے دوسرے مفتوح میدانوں میں اسلام کو مستحکم کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہی واحد نتیجہ خیز طریقہ ہے اور یہی دوبارہ اسلام کی تاریخ بنانے والا ہے۔

۲۶ مارچ ۱۹۹۴

مکہ کے عربی اخبار العالم الاسلامی (۱۸ رمضان ۱۴۱۴ھ، ۲۸ فروری ۱۹۹۴) میں پورے ایک صفحہ پر السید الصدیق حافظ (مصر) کی نظم چھپی ہے۔ اس کا ایک شعر یہ ہے کہ تم خدا کی قسم سب سے زیادہ معزز امت ہو، اگرچہ تم فربہ لوگوں کے درمیان دبلے اور کمزور ہو:

انتم لعمر الله أكرمُ امةٍ ولو انكم بين السِّمان عجاف

یہ شعر گویا پوری نظم کا خلاصہ ہے۔ چنانچہ اسی کے مطابق نظم کا عنوان اکرمُ امۃٍ مقرر کیا گیا ہے یہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی عام سوچ ہے۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں عزت کا مقام کھو دیا ہے۔ اب ان کے دانشور انھیں یہ کہہ کر تسکین دلا رہے ہیں کہ خدا کے نزدیک تم بہر حال معزز ہو۔ مگر یہ ایک لغو بات ہے۔ اگر مسلمان خدا کے یہاں معزز ہوں تو دنیا میں بھی لازماً ان کو عزت کا مقام ملے گا، جیسا کہ قرآن میں ہے: انتم الاعلون ان کنتم مومنین۔

ان مسلم دانشوروں کی غلطی یہ ہے کہ وہ مسلم امت اور مسلم نسل میں فرق نہیں کرتے۔ مسلم امت، اگر وہ فی الواقع مسلم ہو تو بلاشبہ وہ خیر امت ہے۔ وہ اللہ کی نصرت سے عزت

اور سربلندی کا مقام حاصل کرتی ہے۔ مگر موجودہ مسلم نسل کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ان کا حکم قرآن کی اس آیت میں ہے: بل انتم بشر ممّن خلق۔

۲۷ مارچ ۱۹۹۴

زوال یافتہ قوموں کی نفسیات کا ایک جزء عدم اعتراف ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں یہ صفت بہت بڑے پیمانہ پر پیدا ہوگئی ہے۔ وہ خود اپنے عمل کے انجام کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، بلکہ اس کو دوسرے کے اوپر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ملک کی تقسیم کا مسئلہ ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندستانی مسلمانوں نے ملک کی تقسیم کا مطالبہ کیا۔ اور انھیں کے مطالبہ کی بنا پر ملک تقسیم ہوا۔ مگر اب مسلمان یہ کہتے ہیں کہ ملک کی تقسیم کے ذمہ دار مسلمان نہیں ہیں بلکہ ہندو ہیں۔ زیادہ عمر کے مسلمان یہ کہتے ہیں کہ ہندوؤں کے تعصب کی وجہ سے ملک کو تقسیم کرنا پڑا۔ ان کی نوجوان نسل کہتی ہے کہ ہم تو ۱۹۴۷ میں پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ ہم نہیں جانتے کہ ملک کو کس نے تقسیم کرایا۔

آج انگریزی اخبار پانیر (۲۷ مارچ) میں ایک اور بات پڑھنے کو ملی۔ ایک ہندو صحافی جیوتی پنوانی (Jyoti Punwani) نے بمبئی کے جناح ہاؤس پر ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ اس سلسلہ میں بمبئی کے ایک مسلمان مسٹر رشید کے کچھ جوابات بھی انھوں نے نقل کئے ہیں۔ تقسیم کے مسئلہ کی بابت مسٹر رشید نے کہا کہ جو تقسیم ہوئی وہ انڈیا کی تقسیم نہ تھی بلکہ برٹش ایمپائر کی تقسیم تھی۔ انڈیا تو ۱۹۴۷ تک موجود ہی نہ تھا:

India was not partitioned; the British empire was. India wasn't a country till 1947.

اس قسم کی باتیں میرے نزدیک کمینہ پن کی حد تک غلط ہیں۔ ایسی لغو باتوں کا واحد انجام یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی فضا کبھی ختم نہ ہو اور ملک میں وہ معتدل ماحول پیدا نہ ہو جس میں مسلمان ترقی کی طرف اپنا سفر شروع کر سکیں۔

بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو گرامر کے لحاظ سے صحیح مگر حقیقت کے اعتبار سے بالکل غلط ہوتے ہیں۔

۲۸ مارچ ۱۹۹۴

قومی آواز (۲۷ مارچ) کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ رابطہ کمیٹی اتر پردیش کا اصلاحی کارواں علی گڑھ سے چل کر دیوبند، بجنور، سہارن پور، مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ یہاں شہر کی جامع مسجد میں ایک جلسہ ہوا جس میں مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔ مقامی رابطہ کمیٹی کے سکریٹری سلیم البارہی نے اس کارواں کا مقصد ملت میں پھیلی ہوئی برائیوں کو دور کرنا اور معاشرہ کی اصلاح کرنا بتایا۔ مدرسہ شاہی مراد آباد کے مولانا حفظ الرحمان صاحب نے کہا کہ ہمارے معاشرہ میں شراب کی لعنت عام ہوتی جا رہی ہے۔ پورے معاشرہ میں اگر ایک شخص بھی شرابی ہے تو وہ معاشرہ کے لئے ناسور ہے۔ کیوں کہ اس اکیلے شرابی کی اوچھی حرکتوں کی سزا پوری قوم کو بھگتنی پڑتی ہے۔ (صفحہ ۵)

مولانا موصوف جوش خطابت میں بھول گئے کہ شرابی افراد تو خود زمانہ رسالت میں اور عہد خلافت راشدہ میں موجود تھے۔ پھر ہمارے پاس وہ کون سی خصوصی طاقت ہے جس کے ذریعہ ہم شراب کا اس طرح خاتمہ کریں کہ معاشرہ میں ایک بھی شراب نوش باقی نہ رہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک یا چند غلط افراد ہی فساد برپا کرتے ہیں۔ مگر اس کا حل یہ نہیں کہ غلط کار افراد کو ایک ایک کرکے مٹا دیا جائے۔ اصل یہ ہے کہ اصلاح معاشرہ کی کوشش کرتے ہوئے ہمیں یہ کرنا ہے کہ ہر بستی اور ہر شہر میں ایسی کمیٹیاں بنائیں جو معاشرتی نگراں کا کام کریں۔ جہاں بھی کچھ غلط افراد مسئلہ پیدا کریں وہاں پہنچ کر معاملہ کو سلجھانے کی کوشش کریں۔

مثال کے طور پر ہندستان کا فرقہ وارانہ فساد زیادہ تر اس طرح ہوتا ہے کہ ہندوؤں کا جلوس سڑک پر نکلتا ہے۔ جب وہ مسلم محلہ میں پہنچتا ہے تو کچھ غلط یا غیر سنجیدہ افراد سامنے آکر جلوس کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے جلوس نزاع کی صورت اختیار کرتا ہے اور نزاع بالآخر خونیں فساد بن جاتا ہے۔ ایسے موقع پر کرنے کا کام یہ ہے کہ فوراً بستی کے کچھ سنجیدہ افراد حرکت میں آجائیں وہ موقع پر پہنچ کر مسلم نوجوانوں کو روکیں۔ فساد روکنے کی یہی واحد تدبیر ہے۔

کسی معاملہ میں اصول کو جاننا صرف اس وقت مفید ہے جبکہ آدمی اس کے عملی انطباق کو جانتا ہو۔

۲۹ مارچ ۱۹۹۴

۲۸ مارچ کو نئی دہلی کے برلا ہاؤس میں ایک میٹنگ تھی۔ مجھے اس میں بلایا گیا تھا۔ یہاں سابق مرکزی وزیر ایچ کے ایل بھگت (۷۰ سال) نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے میں لاہور میں پڑھتا تھا۔ ایک بار میں نے راجہ غضنفر علی خاں (لیڈر یونینسٹ پارٹی) سے پوچھا کہ کیا پاکستان بنے گا۔ انھوں نے کہا کہ ہندو چاہیں گے تو بن جائے گا، ہندو نہیں جاہیں گے تو نہیں بنے گا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ ہندو اگر تقسیم کی مخالفت کریں گے تو یہ تحریک زور پکڑے گی اور پاکستان بن جائے گا۔ لیکن اگر ہندوؤں نے اس کو نظرانداز کیا تو تحریک زیادہ ہیں بڑھے گی اور پاکستان بھی نہیں بنے گا۔

یہ جواب اصولی طور پر بالکل درست ہے۔ یہ اس بات کی تشریح ہے جو حضرت عمر نے رمایا تھا کہ: امیتوا الباطل بالصمت عنه۔ میں خود ذاتی طور پر اس کا تجربہ کر رہا ہوں۔ یری مخالفت میں زبردست طوفان اٹھایا گیا۔ کتابیں چھاپی گئیں۔ مستقل رسالے نکالے گئے۔ برے خلاف اتنا پروپگنڈہ کیا گیا کہ میں یورپ، امریکہ، عرب اور افریقہ جہاں بھی گیا وہاں س کا چرچا سنائی دیا۔ مگر میں نے کامل خاموشی اختیار کر لی۔ اب خدا کے فضل سے مخالفت کا یہ ال ہے کہ جیسے کسی غبارہ سے اس کی ہوا نکل گئی ہو۔

۳۰ مارچ ۱۹۹۴

کویت کا ماہنامہ الوعی الاسلامی (شوال ۱۴۱۴ھ، مارچ ۱۹۹۴) ڈاک سے موصول صول ہوا۔ اس کے صفحہ ۴۶ - ۴۷ پر محمود مفلح کی نظم ہے جس کا عنوان ہے: لماذا المسلمون ں کا ایک شعر یہ ہے کہ میرا خون ہر طرف بہہ رہا ہے، اور میرے ہی بھائی دھتکارے جا رہے ں اور قتل کیے جا رہے ہیں:

دمی فی کلّ ناحیة یسیلُ   واخوتی المشرّدُ والقتیل

ں مجلہ کے صفحہ ۹۸ پر ہے کہ مسلمان اس وقت دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہیں۔ تازہ اعداد و شمار مطابق، دنیا بھر میں ان کی تعداد ایک بلین اور دو ملین تک پہنچ چکی ہے۔ اس کے باوجود کا یہ حال ہے۔ اس کا جواب استاد محمد لبد اس نے یہ دیا ہے کہ، مالک بن نبی کے

الفاظ میں، مسلمانوں کے اندر الایمان الفاعل موجود نہیں۔

یہ جواب درست نہیں۔ کیونکہ پچھلے دو سو سال سے مسلمان ساری دنیا میں اسلام کے نام پر بے شمار قربانیاں دے رہے ہیں۔ اگر ایمان فاعل موجود نہ ہو تو وہ قربانی کیسے دے سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ پیش آرہا ہے وہ صرف ایک ناقابل معافی جرم کا نتیجہ ہے اور وہ ہے مدعو قوموں کو دشمن قرار دے کر ان کے خلاف لڑائی چھیڑ دینا۔ مدعو قوموں کی زیادتی پر مسلمانوں کو صبر کرنا تھا، مگر وہ مشتعل ہو کر ان سے لڑنے لگے۔

۳۱ مارچ ۱۹۹۴

مسٹر انل نوریا (Anil Nauriya) ایڈوکیٹ سپریم کورٹ سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہندو مسلم میل ملاپ کا کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے کئی فرقہ وارانہ فساد کو تدبیر کر کے روکا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ بتائیے کہ ہندو مسلم جھگڑے کی جڑ کیا ہے۔ انھوں نے فوراً جواب دیا:

Lack of communication.

انھوں نے کہا کہ دوری کی وجہ سے دونوں طرف یہ ہوتا ہے کہ ہر الٹی بات کا لوگ یقین کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح دونوں طرف اسٹیریو ٹائپ بن جاتے ہیں۔ اگر آپ دونوں فرقوں کو ایک دوسرے کی صحیح بات بتائیں تو اسٹیریو ٹائپ اپنے آپ ٹوٹ جائیں گے اور تعلقات نارمل ہو جائیں گے۔ میں نے کہا یہ بالکل درست ہے اور یہی اس معاملہ میں اصل بات ہے۔

یکم اپریل ۱۹۹۴

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ کو لاہور میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی تھی۔ اس مناسبت سے پاکستانی روزنامہ نوائے وقت نے ۲۳ مارچ ۱۹۹۴ کا شمارہ "یوم پاکستان اڈیشن" کے طور پر نکالا ہے۔ اس میں مختلف مضامین ہیں۔ ایک مضمون میں بتایا گیا ہے کہ اس زمانہ میں میاں بشیر احمد نے ایک نظم لکھی تھی جس کا یہ شعر ہر طرف گونج رہا تھا:

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح

ایڈیٹوریل نوٹ میں بتایا گیا ہے کہ قائد اعظم کی نظر پس پوری دنیائے اسلام پر تھیں۔ وہ

دنیا جو اس وقت مغربی استعمار کے خونخوار پنجہ میں گرفتار تھی۔ پاکستان اسلام کی غلام ملکتوں میں آزاد ہونے والا پہلا ملک تھا۔ یہ پاکستان عظیم الشان فقط برعظیم پاک ہندی کے مسلمانوں کا وطن اور حصار نہیں۔ قائد اعظم نے فرمایا تھا پاکستان پورے عالم اسلام کا حصار (او ر انحصار) ہے، ان کا جملہ یہ ہے :

Pakistan is the fortress of Islam.

مگر حال یہ ہے کہ تقریباً نصف صدی گزرنے کے باوجود پاکستان نہ مسلمانوں کا حصار بن سکا اور نہ اسلام کا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے قائدین کے بولے ہوئے الفاظ کو جانتے ہیں مگر وہ تاریخ کی حقیقتوں کو نہیں جانتے۔ مسلمانوں کی اسی بے خبری نے ان کو موجودہ زمانہ میں تباہ کر رکھا ہے۔ اس قسم کے الفاظ ہمیشہ فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ قوموں کے مستقبل کو جو چیز بناتی ہے وہ تاریخ کی حقیقتیں ہیں۔ مسلمان چونکہ تاریخی حقیقتوں سے بے خبر ہیں اس لئے وہ ان کے مطابق اپنا ملی منصوبہ بھی نہیں بنا پاتے۔ وہ صرف اپنے قائدین کے شاندار الفاظ میں گم رہتے ہیں۔ اور کسی انسان کے شاندار الفاظ کسی قوم کے مستقبل کی تعمیر کرنے والے نہیں۔

۲ اپریل ۱۹۹۴

چینی لیڈر ماوزے تنگ (۱۹۷۶ - ۱۸۹۳) نہایت سخت گیر آدمی تھا۔ تاہم اس نے بعض باتیں نہایت عمدہ کہی ہیں۔ اس کا ایک قول تھا کہ کسی اشو کو پرسٹیج اشو نہ بناؤ۔ یہ بہت بامعنی بات ہے۔ پرسٹیج اشو (وقار کا مسئلہ) بنانے سے پہلے معاملہ اپنے فطری دائرہ میں رہتا ہے۔ مگر جب معاملہ کو پرسٹیج اشو تک پہنچا دیا جائے تو معاملہ اپنے فطری دائرہ سے باہر نکل جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک سادہ معاملہ اتنا زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے جس کو کبھی حل ہی نہ کیا جاسکے۔

۳ اپریل ۱۹۹۴

جس زمانہ میں اجودھیا مسئلہ کا زور تھا، مسٹر ایل کے اڈوانی اکثر کہا کرتے تھے کہ مجھے ہندو ہونے پر فخر ہے۔ مگر میں ہندو مذہب پر عمل نہیں کرتا۔ ان کا یہ جملہ انگریزی اخبار میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے :

At the height of the Ayodhya controversy Mr. L.K. Advani used to say that he was a proud Hindu, but not a practising Hindu. (p. 14)

(ٹائمس آف انڈیا ۲ اپریل) یہی معاملہ ان مسلمانوں کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ مجھے مسلمان ہونے پر فخر ہے۔ یہ لوگ بھی حقیقی اسلام پر عامل نہیں ہیں۔ البتہ اسلام کی شاندار تاریخ سے اپنے آپ کو وابستہ کرکے اس سے قومی فخر کی غذا لے رہے ہیں۔

یہ کہنا خود غیر اسلامی ہے کہ "مجھے مسلمان ہونے پر فخر ہے"۔ حقیقی اسلام تواضع اور عبدیت کی روح پیدا کرتا ہے۔ جس آدمی کے اندر حقیقی اسلام کی اسپرٹ پیدا ہو جائے اس کی زبان سے تواضع کے کلمات نکلیں گے نہ کہ فخر و مباہات کے کلمات۔

۴ اپریل ۱۹۹۴

جمیل احمد صاحب جماعت اسلامی مدراس کے امیر ہیں۔ ان کا وطن وانمباڑی ہے۔ مگر وہ شہر مدراس میں رہتے ہیں۔ مدراس میں ان کے گھر کا ٹیلیفون نمبر یہ ہے: 585623

غالباً ۱۹۷۳ کا واقعہ ہے۔ وانمباڑی میں ایک عیسائی اپنی بیوی کے ساتھ آیا۔ وہ سروس مین تھا۔ وہاں وہ برکت اپارٹمنٹس میں ایک فلیٹ لے کر رہنے لگا۔ مرد کا نام جوزف اور عورت کا نام میری تھا۔ وانمباڑی کے زمانہ قیام میں جوزف اسلام سے متاثر ہو گیا۔ اس نے اسلام قبول کر لیا۔ مگر بیوی نے کہا کہ میں اپنے ماں باپ کا مذہب نہیں چھوڑوں گی۔ تاہم دونوں میں میاں بیوی کا تعلق باقی رہا۔

وہ جس مکان میں کرایہ دار تھا وہ مسلمان کا مکان تھا۔ کچھ مسلمانوں نے کہنا شروع کیا کہ جوزف کے لئے اس کی بیوی حرام ہو گئی۔ مگر اس نے اب تک اپنی بیوی کو نہیں چھوڑا۔ اس طرح وہ فعل حرام کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اس کو اس مکان سے نکال دینا چاہئے۔ چنانچہ مالک مکان نے اس سے مطالبہ کیا کہ تم میرا مکان خالی کر دو۔ جوزف روتا ہوا جمیل احمد صاحب کے پاس آیا۔ انھوں نے مکان دار سے کہا کہ جوزف کی بیوی تو کتابیہ ہے، پھر وہ اس کے لئے حرام کیسے ہو سکتی ہے۔ مکان دار نے کہا کہ علماء کا فتویٰ لاؤ تو میں مانوں گا۔ جمیل احمد صاحب مقامی علماء کے پاس گئے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کا کہنا صحیح ہے۔ مگر جب تک نظیر نہ ہو ہم فتویٰ نہیں دے

سکتے۔ اس کے بعد جمیل احمد صاحب نے کوشش کر کے ایک کتاب میں نظیر تلاش کی۔ یہ کتاب انھیں دکھائی۔ اس کو دیکھنے کے بعد انھوں نے فتویٰ لکھ کر دیا۔

جوزف اب مدراس میں رہ رہا ہے۔ اس نے اپنا نام یوسف رکھ لیا ہے، تقریباً ڈیڑھ سال بعد اس کی بیوی نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ اس کا نام مریم رکھ دیا گیا۔ جمیل احمد صاحب نے بتایا کہ مسلمانوں کے اس قسم کے رویہ کی بنا پر مولانا حامد علی صاحب کہا کرتے تھے کہ اگر ہمارے لئے ممکن ہو تا کہ نومسلموں کو ہم اسلام قبول کرنے کے بعد چاند پر بھیج سکیں تو ہم ان کو چاند پر بھیج دیتے۔

۵ اپریل ۱۹۹۴

سخت کرب کے عالم میں یہ جملہ میری زبان سے نکلا ——— اگر یہ کہا جائے کہ خدا نہیں ہے تو ساری کائنات ناقابل فہم بن جاتی ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ خدا ہے تو میرا وجود ناقابل فہم نظر آنے لگتا ہے۔

۶ اپریل ۱۹۹۴

موجودہ زمانہ کے مسلمان جس سب سے بڑے نقصان سے دوچار ہوئے ہیں وہ انسانی فطرت سے بدگمانی ہے۔ اسی بدگمانی کا یہ نتیجہ ہے کہ اب ان کے اندر صرف وہ منفی تحریکیں زور پکڑتی ہیں جو کسی مسلم دشمن کے خلاف اٹھائی گئی ہوں۔ جو تحریک کسی مثبت بنیاد پر اٹھائی جائے اس کو موجودہ مسلمانوں کے درمیان مقبولیت حاصل نہیں ہوتی۔ اس نفسیات نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو بے شمار نقصانات پہنچائے ہیں۔ اسی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ اگر کسی شخص کے بارہ میں کہا جائے کہ وہ اسلام دشمن طاقت کا ایجنٹ ہے تو مسلمان بلاتحقیق اس پر یقین کرلیں گے۔ اس نفسیات نے مسلمانوں کو اس صلاحیت سے محروم کر دیا ہے کہ وہ اپنے دوست اور دشمن کو پہچان سکیں۔

۷ اپریل ۱۹۹۴

مسلمانوں میں ایک قول بہت مشہور اور مقبول ہے ——— عیسائی مسلمانوں کے ایمان کے دشمن ہیں اور یہودی مسلمانوں کی جان کے دشمن ہیں۔ مگر میرے نزدیک دونوں ہی لغو ہیں۔

اسی طرح کی بے بنیاد باتوں نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی کل قوت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی بھی کسی کا دشمن نہیں۔ ہر آدمی صرف اپنے مفاد کا دوست ہے۔ اس میں شاید صرف موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا استثناء ہے جو اپنے مفاد کے دوست بھی نہیں۔

۸ اپریل ۱۹۹۴

کتاب "عظمت اسلام" تیار ہوگئی ہے۔ جلد ہی انشاء اللہ پریس میں جائے گی۔ اس کے ٹائٹل کی پشت کے لئے حسب ذیل مضمون لکھ کر آفس کو دیا:

اسلام کی سب سے بڑی طاقت اس کی فکری اور نظریاتی برتری ہے۔ ایک طرف وہ اہل ایمان کو اس اعلیٰ ذہنی سطح پر جینے کے قابل بناتا ہے جس سے زیادہ اعلیٰ ذہنی سطح اس دنیا میں کوئی نہیں۔ دوسری طرف موجودہ مسابقت کی دنیا میں وہ اہل ایمان کی ابدی برتری کی ضمانت ہے۔ دوسرے اگر مادی سپر پاور ہیں تو اسلام نظریاتی سپر پاور۔ اور نظریاتی فوقیت بلاشبہ ہر دوسری فوقیت سے زیادہ عظیم ہے۔

۹ اپریل ۱۹۹۴

دو چیزیں آدمی کو برائی سے روکتی ہیں۔ ایک حیا اور دوسرے اندیشۂ مآل۔ جس آدمی کے اندر ان دونوں میں سے کوئی بات نہ رہے۔ وہ ہر برائی کے لئے ڈھیٹ ہو جائے گا۔ اسی بات کو ایک عرب شاعر نے ایک حدیث کو شامل کرتے ہوئے اس طرح کہا ہے ـــــ اگر تم کو انجام کار کا ڈر نہ ہو اور نہ تمہارے اندر شرم و حیا ہو تو پھر جو تمہارے جی میں آئے کرو:

اذا لم تخش عاقبة اللّيالى ولم تستحى فاصنع ما تشاء

۱۰ اپریل ۱۹۹۴

عبدالرحمان کوندو کشیری نے بتایا کہ ۲۶ مارچ کو وہ سرینگر سے دہلی آرہے تھے۔ سرینگر سے جموں تک انھوں نے بس سے سفر کیا۔ اس دن ہولی کا تیوہار تھا۔ راستہ میں ایک جگہ سامنے سے ایک ٹرک آیا جس کا ڈرائیور ہندو تھا۔ اس نے بس کے مسلمان ڈرائیور کی طرف پانی پھینک دیا۔ اس پر مسلمان ڈرائیور غصہ ہو گیا۔ پہلے اس نے سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اس کو برا بھلا کہا۔ ہندو ڈرائیور نے بھی جواب دیا۔ اب مسلمان ڈرائیور بس سے اتر پڑا۔ اس کے

ساتھ پانچ چھ مسلمان مسافر بھی اس کی حمایت میں اتر گئے۔ اب دونوں میں جھگڑا ہونے لگا۔ ہاتھا پائی بھی ہوئی۔

اتنے میں بی ایس ایف کی ایک گاڑی آ گئی۔ یہ منظر دیکھ کر وہ لوگ اتر گئے۔ انھوں نے حالات پوچھے۔ اس کے بعد انھوں نے مسلمان ڈرائیور کو غلط بتا کر اس کو مارنا شروع کیا۔ اب مسلمان ڈرائیور گھبرا گیا۔ وہ بھاگ کر اپنی بس میں آیا اور اس کو نہایت تیزی کے ساتھ بھگانا شروع کیا۔ حتی کہ ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ ایکسیڈنٹ کر دے گا۔ مسلمان ڈرائیور نے ان مسلم مسافروں کو بھی سڑک پر چھوڑ دیا جو اس کی حمایت میں اترے تھے۔

عبد الرحمن کو ندوی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ڈرائیور نے اگر چند قطرے پانی کو برداشت کر لیا ہوتا تو وہ اس ذلت اور مار سے بچ جاتا۔ مگر یہی وہ بات ہے جو ہماری قوم کو نہیں معلوم۔

۱۱ اپریل ۱۹۹۴

مولانا اکبر الدین قاسمی نے بتایا کہ ۱۹۶۵ میں مولانا ابو الحسن علی ندوی آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے جلسوں میں کثرت سے جاتے تھے۔ اس وقت مجلس مشاورت 'کانگرس کو ہراؤ' کی مہم چلا رہی تھی۔ مولانا علی میاں کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ حکمراں پارٹی کو ضرر پہنچائیں۔ یعنی الکشن میں اس کے خلاف ووٹ دے کر اس کو ہرائیں۔ اس طرح لیڈروں کو ہوش آئے گا اور وہ مسلمانوں کے مسائل کو حل کر دیں گے۔ ان تقریروں میں مولانا علی میاں اکثر یہ شعر پڑھتے تھے:

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے — اگر کانٹوں میں ہو خوئے حریری

قرآن میں حفاظت کا راز دعوت الی اللہ میں بتایا گیا ہے (واللہ یعصمك من الناس) مگر موجودہ زمانہ کے نادان رہنما مسلمانوں کو یہ سبق دے رہے ہیں کہ وہ لوگوں کو ضرر پہنچا کر اپنے تحفظ کا بندوبست کریں۔

۱۲ اپریل ۱۹۹۴

مولانا اکبر الدین قاسمی اور حیدر آباد کے دو اور عالم ملاقات کے لئے۔ مولانا اکبر الدین قاسمی

دارالعلوم حیدرآباد میں استاد ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ جنوری ۱۹۹۴ میں مدرسہ میں ایک واقعہ ہوا۔ مدرسہ کی زمین پر ابھی تک تار کی معمولی فنسنگ تھی۔ اب چاروں طرف پتھر کی مضبوط باؤنڈری بنائی گئی ہے۔ باؤنڈری کی دیوار بننا شروع ہوئی تو پڑوس کے ایک ہندو نے کام رکوا دیا۔ اس نے کہا کہ آپ لوگوں نے آگے بڑھ کر میری زمین کو باؤنڈری کے اندر لے لیا ہے۔ پانچ فٹ چوڑی اور دس فٹ لمبی زمین کو اس نے اپنی زمین بتایا۔

مدرسہ والے راقم الحروف پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ میں مسلمانوں کو بزدلی کا سبق دے رہا ہوں۔ مگر مدرسہ کے ذمہ داروں نے یہ نہیں کیا کہ اس کے بعد لڑکوں کو جمع کرکے ہندو کے خلاف جہاد شروع کر دیں۔ اس کے بعد مدرسہ کے ذمہ دار جناب رحیم الدین انصاری نے شاندار دعوت کا انتظام کیا اور مذکورہ ہندو کو اس میں بلایا۔ اس دعوت میں مولانا اکبرالدین قاسمی بھی شریک تھے۔ کھانے کے بعد اس ہندو کو پورا مدرسہ دکھایا۔ اور بتایا کہ دیکھئے ہم یہاں غریب بچوں کو تعلیم دلا رہے ہیں۔ یہاں ہم ایک مفید قومی کام کر رہے ہیں۔ وغیرہ

اس کے بعد انھوں نے ہندو سے کہا کہ ہم آپ سے جھگڑا کرنا نہیں چاہتے۔ اگر آپ اصرار کریں گے تو ہم دیوار گرا دیں گے اور وہاں بنائیں گے جہاں سے آپ کہہ رہے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ ہم سے اس زمین کا معاوضہ لے لیں۔ ہندو کا دل نرم ہو چکا تھا، اس نے کہا کہ اب جو دیوار بن گئی ہے اس کو باقی رہنے دیجئے، مگر آئندہ ایسی غلطی نہیں ہونی چاہئے۔ اس نے زمین کا معاوضہ بھی نہیں لیا۔

۱۳ اپریل ۱۹۹۴

نئی دہلی کے امریکی سفارتخانہ کے فرسٹ سکریٹری (Eugene D. Price, Jr.) آج ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ انگریزی اخبارات میں میرے مضامین انھوں نے پڑھے ہیں۔ اس کی وجہ سے انھیں مجھ سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔

انھوں نے کہا کہ آپ کے خیالات عام مسلم رہنماؤں سے مختلف ہیں۔ پھر مسلمانوں کے درمیان آپ کے خیالات کا ردعمل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ جہاں تک میری دوسری کتابوں کا تعلق ہے، وہ عام طور پر بہت پسند کی جاتی ہیں۔ مگر قومی مسائل پر میں جو کچھ لکھتا ہوں، اس سے

کچھ مسلمان برہم ہیں۔ حتیٰ کہ مسلمانوں میں کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو مجھ کو سی آئی اے کا ایجنٹ بتاتے ہیں۔ حالانکہ آپ امریکی سفارت خانہ کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ ایک لغو الزام ہے۔ اور میرا سی آئی اے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بات سن کر وہ ہنسنے لگے۔ ان کو سخت تعجب ہوا کہ یہاں ایسے لوگ بھی ہیں جو میرے اوپر ایسے بے بنیاد الزام لگاتے ہیں۔

۱۴ اپریل ۱۹۹۴

اسلام کی دعوت کس طرح دی جائے۔ اس معاملہ میں مختلف رائیں ہیں۔ تبلیغی جماعت کا کہنا ہے کہ پہلے مسلمانوں کو درست کرو۔ اس کے بعد ان کے ذریعہ ہندوؤں میں دعوت پہنچاؤ۔ جماعت اسلامی کا لٹریچر کہتا ہے کہ اسلام کو مکمل نظام حیات کی حیثیت سے نافذ کر دو تاکہ اس کو دیکھ کر لوگ اسلام قبول کریں۔ شمس نوید عثمانی صاحب لکھتے ہیں کہ ہندو قوم قوم نوح ہے۔ ہندو قوم کو اس کی اپنی مذہبی کتابوں کی روشنی میں انھیں کی کتابوں کے رخ سے اسلام کی طرف بلایا جائے۔ وغیرہ

میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ مسلمان برادران وطن سے ہر قسم کی فرقہ وارانہ نزاع یکطرفہ طور پر ختم کر دیں۔ وہ ایذا پہنچائیں تب بھی مسلمان صبر و اعراض کریں۔ اس طرح یکطرفہ قربانی کے ذریعہ داعی اور مدعو کے درمیان نارمل حالت پیدا کی جائے اور دونوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ تعلقات بڑھائے جائیں۔ اس کے بعد دعوت کا عمل اپنے فطری انداز میں خود بخود جاری ہو جائے گا۔ یہی دور اول میں صلح حدیبیہ کے بعد ہوا تھا۔ تاتاریوں کے زمانہ میں یہی پیش آیا۔ خود ہندستان میں ۱۹۴۷ سے پہلے یہی عمل جاری تھا۔ مگر دو قومی تحریک نے سارا معاملہ بگاڑ دیا۔

۱۵ اپریل ۱۹۹۴

پاکستانی اخبار نوائے وقت (۷ اپریل ۱۹۹۴) میں ایک مضمون پڑھا۔ لکھنے والے مسٹر طاہر ملک ہیں۔ اور اس کا عنوان ہے: مسئلہ کشمیر پر سنجیدگی اختیار کیجئے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے:

' بھارتی کشمیر سے بھاگ کر آنے والے کشمیری مہاجرین آزاد کشمیر کے کیمپوں میں مقیم ہیں۔ مہاجرین کو بستی کیمپوں میں نمائش بنا کر رکھا گیا۔ انھیں سرکاری فقیر بنا دیا گیا ہے۔ ہر مہاجر کو ۵۰۰ روپیہ کے قریب ماہوار امداد ملتی ہے۔ مہاجرین سارا دن کیمپوں میں رہتے ہیں۔ ان

کے لئے مثبت سرگرمیوں کا کوئی انتظام نہیں۔ مہاجرین کو سکھایا گیا ہے کہ ہر آنے والے ملکی یا غیر ملکی فرد کو صرف اور صرف بھارتی مظالم بتاؤ۔ اور باقی وقت آرام کرو۔

بھارت کے خلاف نفرت اور ظلم کی باتیں پھیلانا، یہی پاکستان کی خارجہ سیاست کا اہم ترین رکن ہے۔ پاکستان اسلام کے نام پر بنا۔ مگر پاکستان کا پورا میڈیا گواہی دیتا ہے کہ اس کے پاس نفرت کے سوا جینے کے لئے اور کوئی بنیاد نہیں۔

۱۶ اپریل ۱۹۹۴

ماہنامہ الفرقان (جنوری ۱۹۹۴) میں سید عبداللہ طارق رامپوری کا مضمون مولانا شمس نوید عثمانی کے بارہ میں چھپا ہے۔ اس میں مولانا مرحوم کے بہت سے واقعات وحالات درج کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ —— مولانا شمس نوید عثمانی کا حال یہ تھا کہ رات میں اگر بتی گل ہوجاتی تو انا للہ پڑھتے، اس ہمیشہ یہ فقرہ بولتے: ایک دن ہماری زندگی کا چراغ بھی اسی طرح گل ہوجائے گا۔ (صفحہ ۳۵) موت کا استحضار ہو تو ہر واقعہ اسی طرح آخرت کی یاد دلانے والا بن جاتا ہے۔

۱۷ اپریل ۱۹۹۴

۱۶ - ۱۷ اپریل کو میں ناگپور میں تھا۔ وہاں پہلی بار آر ایس ایس کے ہیڈ کوارٹر میں جانا ہوا۔ میرے ساتھ دو اور مسلمان تھے۔ جب میں وہاں سے واپس آیا اور ہم لوگ قیام گاہ پر بیٹھے تو گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ دونوں صاحبان نے منفی رائے قائم کی ہے۔ ایک صاحب کی رائے یہ تھی کہ یہ لوگ نہایت غیر مہذب ہیں۔ وہ کپڑا پہننا بھی نہیں جانتے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ وہاں اکثر لوگ جانگھیہ پہنے ہوئے تھے۔ جب ہم لوگ پہنچے تو دوڑ کر کسی نے تولیہ لپیٹ لی اور کسی نے چادر لپیٹ لی۔ دوسرے مسلمان نے کہا کہ وہاں تو سب بوڑھے اور ریٹائرڈ لوگ تھے۔ مجھے تو یہ سنٹر ایک قبرستان جیسا دکھائی دیا۔

اس کے برعکس میرے ذہن میں ایک مثبت تصویر بنی۔ میں نے ان لوگوں سے کئی مثبت سبق سیکھے۔ مثلاً میں نے یہ معلوم کیا کہ آر ایس ایس والوں کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اپنی تعلیم کو مکمل کرو، اس کے بعد پارٹی کے کام میں لگو۔ اس تجربہ سے اندازہ ہوا کہ مسلمان عام طور پر

منفی سوچ والے کیوں ہو گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس سوچنے کے لئے اس کے سوا کوئی اور ڈھنگ موجود نہیں۔

۱۸ اپریل ۱۹۹۴

خدا برداشت کر رہا ہے، پھر ہم کیوں برداشت نہیں کرسکتے۔ مسجد والوں کو اگر مندر کو دیکھ کر غصہ آئے تو انھیں سوچنا چاہئے کہ خدا مندر کو برداشت کر رہا ہے، اسی لئے تو مندر کھڑا ہوا ہے۔ ورنہ دنیا میں مندر کا وجود ہی نہ ہوتا۔ اسی طرح اگر مندر والوں کو مسجد کو دیکھ کر غصہ آئے تو ان کو سوچنا چاہئے کہ بھگوان مسجد کو برداشت کر رہا ہے، اگر وہ برداشت نہ کرتا تو دنیا میں مسجد کا وجود نہ ہوتا۔ لوگ اگر اس طرح سوچیں تو اپنے آپ دنگا فساد ختم ہو جائے۔

۱۹ اپریل ۱۹۹۴

ڈاکٹر احمد سلطان صاحب بنگلور کے رہنے والے ہیں۔ دہلی میں انھوں نے ملاقات کے دوران بتایا کہ مارچ ۱۹۹۴ میں بنگلور میں یہ واقعہ ہوا کہ پولیس ایک مسلمان لڑکے کو پکڑ کر لے گئی۔ اس کا نام محمد حسین تھا۔ یہ لڑکا داداؤں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس پر غنڈہ گردی کا الزام لگایا گیا۔ محمد حسین کی پارٹی کے لڑکوں نے شور وغل کیا اور مسلمانوں کی ایک جماعت اکٹھا ہو گئی۔ ان کا ارادہ تھا کہ جلوس کی صورت میں پولیس اسٹیشن جائیں اور وہاں آگ لگا دیں۔ ڈاکٹر احمد سلطان ان نوجوانوں سے ملے۔ انھوں نے کہا کہ آپ پولیس اسٹیشن کو جلائیں گے تو بات بڑھے گی اور مسلمانوں پر مزید ظلم ہوگا۔ نوجوانوں نے کہا کہ ہم حق پر ہیں۔ پھر ہم کیوں چپ رہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے سمجھایا کہ اقدام کے لئے صرف حق پر ہونا کافی نہیں۔ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آخر آپ کیا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے آدمی کو وہ لوگ چھوڑ دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اچھا آپ تھوڑی دیر کے لئے ٹھہریے اور مجھے پرامن کوشش کا موقع دیجئے۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے بنگلور کے کمشنر پولیس مسٹر جے پرکاش کو ٹیلیفون کیا۔ اور کہا کہ یہاں صورت حال بہت نازک ہے، آپ فوراً آجائیں۔ انھوں نے کہا کہ میری گاڑی اس وقت موجود نہیں ہے۔ کچھ دیر آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی گاڑی بھیج

دی اور وہ فوراً آ گئے۔ معاملہ کو سمجھنے کے بعد وہ فوراً پولیس اسٹیشن گئے۔ محمد حسین کو اسی وقت رہا کر دیا اور اس کو دو ہزار روپیہ بھی علاج کے نام پر دیا۔ جس انسپکٹر نے اس کو گرفتار کیا تھا اس کو فوراً معطل کر دیا۔ اس طرح ایک فساد ہوتے ہوتے رہ گیا۔

مسلمان اگر خود سے کارروائی کرنے کے لئے نہ اٹھیں بلکہ امن وقانون کے دائرہ میں رہ کر معاملہ کو حل کرنے کی کوشش کریں تو ہر معاملہ نہایت آسانی سے حل ہو جائے اور کبھی فساد تک نہ پہنچے۔

۲۰ اپریل ۱۹۹۴

میمن عبد الغفار دادا بھائی (۵۰ سال) احمد آباد میں رہتے ہیں اور تبلیغ سے جڑے ہوئے ہیں۔ آج وہ ایک اور صاحب کے ساتھ ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ مسجد اقصیٰ میں آگ لگنے کے بعد احمد آباد میں مسلمانوں کا جلوس نکلا۔ اس جلوس کو نکالنے میں جماعت اسلامی جمعیۃ العلماء وغیرہ سب مسلم جماعتیں شریک تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں ایک لاکھ مسلمان شامل تھے۔ وہ لوگ اس قسم کا نعرہ لگا رہے تھے: ہم سے جو ٹکرائے گا، مٹی میں مل جائیگا۔ یہ واقعہ ۱۹۶۹ کا ہے۔

اس کا ردعمل ہندوؤں پر ہوا۔ انھوں نے سوچا کہ آتشزدگی کا واقعہ تو فلسطین میں ہوا ہے پھر مسلمان یہاں کیوں اس قسم کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ دونوں طرف سے کشیدگی بڑھی اور اس کی بنا پر معمولی واقعات بھی اشتعال کا سبب بننے لگے۔ کالوپور محلہ میں ایک ٹھیلہ پر کتابیں لدی ہوئی تھیں۔ ٹریفک پولیس نے ٹھیلہ کو ہٹانا چاہا۔ اس میں کچھ کتابیں گر گئیں۔ ٹھیلہ والے نے شور مچایا کہ اس میں قرآن تھا اور پولیس والوں نے قرآن کی بے حرمتی کی ہے۔ پولیس والوں نے معافی مانگی مگر مسلمانوں کا جوش ٹھنڈا نہیں ہوا۔

اس کے بعد جمال پور محلہ میں کچھ گائیں تھیں۔ مسلمان ان کو بھگانے لگے۔ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں تکرار ہو گئی۔ کچھ مسلمانوں نے وہاں جگناتھ مندر پر پتھر پھینک دیا۔ ہندوؤں میں خبر پھیل گئی کہ مسلمانوں نے جگناتھ مندر پر حملہ کر دیا ہے۔ اس افواہ نے کشیدگی کو آخری حد تک پہنچا دیا۔ چنانچہ فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا۔ اس میں یکطرفہ طور پر مسلمانوں کا جانی اور مالی نقصان ہوا۔

احمد آباد کے فساد کی رپورٹ اخبار میں چھپی تو تمام مسلم رہنما ایک ہی بولی بول رہے تھے۔ اور وہ تھا پولیس کو اور ہندو فرقہ پرستوں کو برا کہنا۔ کسی نے بھی اس نادانی کا ذکر نہیں کیا جو اس معاملہ میں مسلم رہنماؤں کی غلط رہنمائی کے نتیجہ میں مسلمانوں نے کی۔

۲۱ اپریل ۱۹۹۴

مولانا شکیل احمد قاسمی (میرٹھ) نے بتایا کہ اعظم گڑھ کے شفیق احمد صاحب جو اس وقت جلال آباد کے مدرسہ میں کام کرتے ہیں، وہ اس سے پہلے اعظم گڑھ کے ایک پرائمری اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ ایک روز کلاس کے طلبہ کو ہندو ماسٹر نے مارا، کیوں کہ حساب کا پرچہ سب نے غلط کیا تھا۔

یہ روزہ کا مہینہ تھا۔ ہندو ماسٹر کو خیال ہوا کہ شفیق ایک مسلمان لڑکا ہے، شاید وہ روزہ سے ہو۔ چنانچہ ماسٹر نے شفیق صاحب کو بلایا اور پوچھا کہ کیا تم نے روزہ رکھا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ اس کے بعد ہندو ماسٹر رونے لگا۔ اس نے کہا کہ شفیق مجھے معاف کر دو، آج میں نے نہایت پاپ کا کام کیا کہ روزہ کی حالت میں تم کو مارا۔

۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان میں دونوں فرقوں کے درمیان اسی قسم کے تعلقات تھے۔ لوگ ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی عزت لوگوں کے دلوں میں تھی۔ مگر تقسیم ملک کی تحریک چلا کر حالات کو آخری حد تک بگاڑ دیا گیا۔ تقسیم کی تحریک کا مطلب ہندو قوم کے سیاسی اور مادی مفاد سے ٹکرانا تھا، اور جب بھی کسی شخص یا قوم کے سیاسی اور مادی مفاد کو چیلنج کیا جائے تو ہر جگہ وہی صورت حال پیش آئے گی جو ہندستان میں پیش آئی۔ سعودی عرب میں شیخ عبد العزیز بن باز، شام میں مفتی کفتارو، مصر میں شیخ الازہر نہایت سکون سے دین کی خدمت کر رہے ہیں۔ جبکہ انھیں ملکوں میں "اسلام پسند" افراد یا تو جیلوں میں ہیں یا انھیں گولی ماردی گئی۔ اس فرق کی وجہ یہی ہے کہ مذکورہ شیوخ حکمرانوں کے سیاسی مفاد سے نہیں ٹکراتے جبکہ نام نہاد اسلام پسند اٹھتے ہی حکمرانوں کے سیاسی مفاد سے ٹکرا گئے۔

۲۲ اپریل ۱۹۹۴

آج اچاریہ منی سوشیل کمار کا انتقال ہو گیا۔ وہ ۱۹۲۶ میں گوڑگاؤں میں پیدا ہوئے۔

ان سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۷ میں ہوئی۔ نئی دہلی (رام لیلا گراؤنڈ) میں انھوں نے ورلڈ فیلو شپ آف ریلیجنز کا اجلاس کیا تھا۔ اس موقع پر مجھے ایک پیپر پیش کرنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ اس کے بعد چند بار کانفرنسوں میں ملاقات ہوئی۔ شانتی یاترا (دسمبر ۱۹۹۲) میں ان سے بہت قربت ہو گئی۔

نئی دہلی میں انھوں نے "اچاریہ سوشیل کمار آشرم" بنایا تھا۔ ایک بار میں ان کے دفتر میں تھا۔ کمرہ میں اس وقت صرف اچاریہ جی، سوامی چیدانند اور راقم الحروف تھے۔ میں اچاریہ جی سے قومی ایکتا سے متعلق کسی معاملہ پر بات کر رہا تھا۔ اتنے میں کسی کا ٹیلیفون آگیا۔ انھوں نے بات کرنے کے لئے ریسیور اٹھایا تو میں نے ریسیور ان کے ہاتھ سے چھین لیا۔ میں نے کہا کہ اتنے ضروری مسئلہ پر میں آپ سے بات کرنے آیا ہوں اور آپ ٹیلیفون اٹنڈ کر رہے ہیں۔ اچاریہ جی کی زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے ان کے ساتھ ایسی حرکت کی۔ مگر اچاریہ جی ذرا بھی غصہ نہیں ہوئے۔ انھوں نے مسکرا کر کہا: خاں صاحب اس وقت شنکر کے روپ میں ہیں۔

۲۳ اپریل ۱۹۹۴

آج میں انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) کے ایک سیمینار میں شریک ہوا۔ وہاں جسٹس سہانے تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ انگریزوں نے اپنے ۹۰ سالہ دور حکومت (۱۸۵۷-۱۹۴۷) میں تقریباً پانچ سو قانون بنائے تھے۔ مگر آزادی کے بعد اس کی نصف مدت (۱۹۴۷-۹۲) میں ہماری قومی حکومت نے پانچ ہزار سے زیادہ قانون بنا ڈالے۔

قانون کبھی پرفکٹ نہیں ہوتا۔ ہر قانون میں کچھ نہ کچھ منفذ یا رخنہ (loop-hole) ہوتا ہے۔ اس لئے جتنے زیادہ قانون بنیں گے اتنے ہی زیادہ رخنے بڑھتے جائیں گے اور مجرمین کے لئے یہ امکان بڑھتا جائے گا کہ وہ کسی ذہین وکیل کی خدمات حاصل کر کے قانون کی پکڑ سے اپنے آپ کو بچالیں۔ ۱۹۴۷ کے بعد عملاً یہی ہو رہا ہے۔ قوانین کے اضافہ نے جرائم کو بڑھا دیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ مجرمین کے لئے قانون کی پکڑ سے بچنا آسان تر ہو گیا ہے۔ اچھے سماجی نظام کا راز قانون کا کم ہونا ہے نہ کہ قانون کا زیادہ ہونا۔ ہمارا اصل مسئلہ قانون کی کمی نہیں ہے۔ ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ قانون کے باوجود مجرم کو سزا نہیں ملتی۔

۲۴ اپریل ۱۹۹۴

مولانا شکیل احمد قاسمی نے بتایا کہ مولانا علی میاں نے اپنی کتاب "نئے دور پرانے چراغ" میں لکھا ہے کہ تقسیم ۱۹۴۷ سے پہلے ایک بار مولانا سید سلیمان ندوی ڈھاکہ یونیورسٹی میں بلائے گئے۔ وہاں انھوں نے ایک مقالہ پڑھا۔ اس مقالہ میں انھوں نے بتایا کہ بنگلہ زبان پہلے اردو رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ بعد کو ہندی رسم الخط اختیار کرلیا گیا۔ اب اگر آپ لوگ دوبارہ اردو رسم الخط اختیار کرلیں تو آپ اسلامی تہذیب سے قریب ہو جائیں گے۔ اس سے وسیع تر اسلامی قومیت کی تشکیل میں مدد ملے گی۔ یونیورسٹی ہال میں جو مسلمان طلبہ جمع تھے وہ بپھر اٹھے۔ انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی کی سخت توہین کی۔ حتی کہ ان کے اوپر پتھر پھینکے۔ بڑی مشکل سے ان کو ہال کے باہر لایا گیا۔

اس طرح کے کثیر واقعات کے باوجود علامہ اقبال، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور خود مولانا سید سلیمان ندوی نے ملک کو تقسیم کرکے پاکستان بنانے کی حمایت کی۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ یہ زوال یافتہ اور جذباتی مسلمان جو طرح طرح کی عصبیتوں میں مبتلا ہیں وہ سیاسی اقتدار پاکر اور بگڑ جائیں گے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کے بعد وہ اسلامی نظام بنانے میں منہمک ہو جائیں۔

۲۵ اپریل ۱۹۹۴

ام السلام اپنے تین بچوں کو لئے ۲۲ اپریل کو آئی ہیں۔ ۲۷ اپریل کی صبح کو چلی جائیں گی۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ موجودہ دنیا میں کوئی آدمی بھی مصیبت سے خالی نہیں۔ کسی کو ایک قسم کی مصیبت ہے اور کسی کو دوسرے قسم کی۔ یہ خود خدا کی تخلیق کی بنا پر ہے، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: لقد خلقنا الانسان فی کبد (ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے) انسان کی کامیابی یہ نہیں ہے کہ وہ دنیا میں آرام کی زندگی حاصل کرلے، کیوں کہ وہ تو ممکن ہی نہیں۔ انسان کی کامیابی یہ ہے کہ وہ آخرت کے آرام کو پالے جو حقیقی بھی ہے اور ابدی بھی۔

۲۶ اپریل ۱۹۹۴

حضرت حسن بصری کا قول ہے کہ لا یصح القول الا بالعمل (عمل کے بغیر قول

درست نہیں) یہ کمزوری پہلے زمانہ کے انسان میں تھی ۔ مگر موجودہ زمانہ میں پریس اور پلیٹ فارم کی ایجاد نے اس برائی کو آخری درجہ میں پہنچا دیا ہے ۔ آجکل ہر آدمی میڈیا میں اور لاؤڈ اسپیکر کی مجلسوں میں شاندار الفاظ بکھیر رہا ہے ۔ حالاں کہ عمل کے اعتبار سے وہ صفر ہوتا ہے ۔ دور جدید نے لوگوں کی صرف دوعملی میں اضافہ کیا ہے ۔

۲۷ اپریل ۱۹۹۴

ہندستان ٹائمس (۲۷ اپریل) کے صفحہ اول پر کلکتہ کی ڈیٹ لائن کے ساتھ ایک رپورٹ چھپی ہے ۔ مسٹر شیر سنگھ ایک آئی اے ایس افسر ہیں ۔ وہ مغربی بنگال گورنمنٹ میں ین پاور شعبہ کے ڈائرکٹر ہیں ۔ وہ مسلمانوں کے اجتماعات میں بابری مسجد کے مسئلہ پر مسلم پسند تقریریں کرتے تھے اور مسلمان بہت خوش ہوتے تھے ۔ اب انھوں نے دو کتابیں شائع کی ہیں :

Babar, the secular emperor
Archaeology of Babri Masjid

ہندستان کی مسلم تنظیموں کی طرف سے اس کتاب کی زبردست نمائندگی کنگ فیصل فاؤنڈیشن میں کی گئی ۔ چنانچہ ۱۹۹۴ کے کنگ فیصل ایوارڈ میں مسٹر شیر سنگھ کے لئے چار ملین امریکی ڈالر انعام کا اعلان کیا گیا ۔ اگرچہ مغربی بنگال کی ریاستی حکومت نے ان کو فرقہ وارانہ سرگرمیوں کے الزام میں معطل کر دیا ہے ۔ اور ابھی تک وہ اس قیمتی انعام کو وصول نہیں کر سکے ہیں ۔

موجودہ زمانہ میں ساری دنیا میں مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ جو آدمی منفی کام کے لئے اٹھے اس کی وہ خوب پذیرائی کرتے ہیں ۔ اس کے برعکس جو آدمی مثبت کام کے لئے اٹھے اس کو مسلمانوں کی طرف سے کوئی حمایت نہیں ملتی ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان قومی اسلام پر ہیں نہ کہ اصولی اسلام پر ۔ قومی اسلام میں غیر قوموں کو حریف کے روپ میں دیکھا جاتا ہے ۔ اور اصولی اسلام میں غیر قوموں کو مدعو کے روپ میں ۔ قومی اسلام میں دوسری قومیں عداوت کا موضوع بنتی ہیں اور اصولی اسلام میں محبت کا موضوع ۔

۲۸ اپریل ۱۹۹۴

حدیث میں منافق کی ایک پہچان یہ بتائی گئی ہے : واذا خاصم فجر ۔ یہ حدیث

صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں کتاب الایمان کے تحت آئی ہے۔ ابن حجر اور نووی دونوں نے فجر کی تشریح مال عن الحق کے لفظ سے کی ہے۔ اس کے مطابق، حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ وہ شخص منافق ہے کہ جب اس سے اختلافی بحث پیش آئے تو وہ انصاف سے ہٹ جائے۔

حقیقت کا علم تو اللہ کو ہے، مگر مجھ سے اختلاف کرنے والے تمام مسلمان انصاف سے ہٹ گئے۔ میں نے کہا کہ مسلمان صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کریں تو مخالفین نے کہا کہ وہ بزدلی کی تعلیم دے رہے ہیں۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد میں نے کہا کہ مسلمان بابری مسجد کے مسئلہ پر اپنا ایجی ٹیشن ترک کر دیں تو مخالفین نے کہا کہ وہ کہتے ہیں مسلمان بابری مسجد کو ہندوؤں کے حوالے کر دیں۔ میں نے کچھ مفکرین پر علمی تنقید کی تو کہا گیا کہ دیکھو، یہ علماء پر کیچڑ اچھال رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہندو مسلم نزاعی معاملات میں مسلمان پر امن جدوجہد کا طریقہ اختیار کریں، تو کہنے والوں نے میرے بارہ میں کہا کہ وہ ملی تشخص سے دست برداری کی دعوت دے رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ موجودہ قومیں مسلمانوں کی حریف نہیں ہیں بلکہ وہ مدعو کے حکم میں ہیں، تو کہا گیا کہ یہ اسلام دشمنوں کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ وغیرہ۔

میں کسی کو منافق نہیں کہہ سکتا۔ مگر حدیث کی روشنی میں یہ ضرور کہوں گا کہ مذکورہ قسم کی باتیں بلاشبہ منافقت والی باتیں ہیں۔ یہ مخلصانہ ایمان والی باتیں نہیں۔

۲۹ اپریل ۱۹۹۴

مسلمان کم از کم نصف صدی سے اقبال کے اس شعر میں گم ہیں:

آ تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے　　شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

مگر امتوں کی تقدیر کے بارہ میں یہ بات صحیح نہیں۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ کوئی امت نفع بخشی کا ثبوت دے کر دنیا میں جگہ حاصل کرتی ہے، اور جب وہ نفع بخشی کی صلاحیت کھو دے تو وہ دنیا میں عزت و سربلندی کے مقام سے بھی محروم ہو جاتی ہے۔ یہی اصول قرآن سے ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: و اما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض۔

۳۰ اپریل ۱۹۹۴

نئی دہلی کے انگریزی پندرہ روزہ انڈیا ٹوڈے نے اپنے شمارہ ۳۱ مارچ ۱۹۹۴

میں جینوا کی میٹنگ کی رپورٹ شائع کی تھی۔ اقوام متحدہ کی طرف سے ہونے والی اس میٹنگ میں پاکستان نے انڈیا پر انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا الزام لگایا تھا مگر ممبر ملکوں کا تعاون نہ ملنے کی وجہ سے اس کو کامیابی نہ ہوئی۔ اس رپورٹ کے بارے میں قارئین کے خطوط انڈیا ٹوڈے (۳۰ اپریل) میں چھپے ہیں۔ ایک قاری نے لکھا ہے کہ پاکستان کی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو اس پیراٹروپر کی مانند ہیں جو جہاز سے باہر چھلانگ لگادے جب کہ وہ یہ نہ جانتا ہو کہ پیراشوٹ کیسے کھولا جائے:

Benazir Bhutto is like a paratrooper who jumps out of the aircraft without knowing how to open the parachute. (R. Batra, New Delhi)

مسٹر بترا کا یہ تبصرہ تمام مسلم لیڈروں پر صادق آتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے تمام مسلم لیڈر بار بار یہی کر رہے ہیں کہ وہ جوش میں آکر ایک چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ بعد کو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ چھلانگ کے تقاضے پورے کرنے کی طاقت ان کے اندر نہیں ہے۔ موجودہ زمانہ کا کوئی بھی مسلم رہنما مجھے اس سے مستثنیٰ نظر نہیں آتا، خواہ بارِیش رہنما ہو یا بے ریش رہنما۔

یکم مئی ۱۹۹۴

حافظ محمد اخلاق صاحب (۲۶ سال) ہردہ (مدھیہ پردیش) کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے ملاقات میں بتایا کہ ان کے یہاں ۱۹۴۷ سے لے کر اب تک کوئی فساد نہیں ہوا۔ وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں بہت اچھے تعلقات ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں فرقوں کے لوگ ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں۔ ہندو عید کے موقع پر مسلمانوں کا استقبال کرتے ہیں اور مسلمان دسہرہ کے موقع پر ہندوؤں کا استقبال کرتے ہیں۔ اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ تیوہار کے دن لوگ سڑکوں پر دونوں طرف کھڑے ہو جاتے ہیں اور لوگوں کو ہار پہناتے ہیں۔ سونف سپاری پیش کرتے ہیں۔ کہیں کہیں سڑک پر گیٹ بناتے ہیں۔ وغیرہ

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جب بابری مسجد توڑ دی گئی تو اس کے بعد ہردہ میں فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہوئی۔ باہر کے کچھ ہندو فرقہ پرست ہردہ آئے اور انھوں نے ہردہ میں ہندوؤں کا جلوس نکالا۔ وہ اس قسم کے نعرے لگا رہے تھے:

تیل لگاکر ڈابر کا نام مٹا دو بابر کا
جب جب ہندو جاگا ہے دیش سے دشمن بھاگا ہے
جس ہندو کا خون نہ کھولے خون نہیں وہ پانی ہے
بچہ بچہ رام کا ہندستان کے کام کا

اس سے مسلم نوجوانوں میں بھی کچھ ردعمل پیدا ہوا مگر بڑے لوگوں نے مسلم نوجوانوں کو روکا۔ انھوں نے جوابی کارروائی کرنے کے بجائے ذمہ دار ہندوؤں تک اپنی شکایت پہنچائی۔ یہ ہندو اپنے ہندو نوجوانوں کو روکنے کے لئے سڑک پر آگئے۔ انھوں نے ہندو نوجوانوں سے کہا کہ یہ وقت تو مسلمانوں سے معافی مانگنے کا ہے نہ کہ اس طرح کا نعرہ لگانے کا۔ ہردہ کے لوگوں نے اس صورتحال کا منفی جواب دینے کے بجائے مثبت انداز میں اس کا جواب دیا۔ یعنی انھوں نے اپنی امن کی کوششیں تیز تر کردیں۔ پہلے صرف ایک ایک تیوہار پر استقبال کیا جاتا تھا۔ اب انھوں نے اس کو ڈبل کرکے دو دو تیوہار پر استقبال شروع کردیا۔ یعنی مسلمانوں نے دسہرہ کے ساتھ دیوالی کے موقع پر بھی استقبال کا انتظام کیا۔ اسی طرح ہندوؤں نے عید کے ساتھ میلادالنبی کے موقع پر بھی مسلم جلوس کا استقبال کیا۔ چنانچہ فرقہ واریت کی آگ ٹھنڈی ہوگئی۔

۲ مئی ۱۹۹۴

دسمبر ۱۹۹۳ میں میں امریکہ (لاس اینجلیز) میں تھا۔ وہاں میری ملاقات مولانا سید سلیمان ندوی کے صاحبزادے ڈاکٹر سلمان ندوی سے ہوئی۔ ڈاکٹر سلمان ندوی انڈیا سے پاکستان گئے۔ اب وہ ساؤتھ افریقہ میں رہ رہے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ سید صاحب گڈول مشن (خیرسگالی مشن) پر ۱۹۴۸ میں پاکستان گئے۔ اور پھر لوٹ کر واپس نہیں آئے۔ اخلاقی اعتبار سے یہ بات درست نہ تھی۔ ایسا انھوں نے کیوں کیا۔

ڈاکٹر سلمان ندوی نے کہا کہ میں اس سفر میں سید صاحب کے ساتھ تھا۔ وجہ یہ ہوئی کہ سید صاحب کو ویزا میں توسیع کی ضرورت پیش آئی۔ میں نے درخواست دی تو کلرک نے کہا کہ درخواست دہندہ کو خود یہاں آنا چاہئے۔ چنانچہ سید صاحب کو دھوپ میں کراچی قونصل خانہ کی کھڑکی پر کھڑا ہونا پڑا۔ کلرک نے سید صاحب سے پوچھ گچھ کے بعد کہا کہ آپ کو پاکستان میں رہنا ہے تو رہ جائیے ہم ویزا میں توسیع نہیں

کریں گے۔ اس سے بددل ہو کر سید صاحب وہاں رہ گئے۔

ہندستان واپسی کے بعد میں نے ایک صاحب سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں اس معاملہ کو جانتا ہوں۔ انھوں نے بتایا کہ وزیر اعظم جواہر لال نہرو کو جب یہ قصہ معلوم ہوا تو انھوں نے بہت افسوس کیا۔ انھوں نے کہا کہ اگر سید صاحب واپس آکر مجھے یہ قصہ بتاتے تو ان کی خاطر میں سفارتخانہ کے پورے عملہ کو سزا دیتا۔

۳ مئی ۱۹۹۴

جمیل اختر صاحب بیگو سرائے (بہار) کے رہنے والے ہیں۔ آجکل وہ دہلی میں ہیں یہاں انھوں نے پلاسٹک کا کام شروع کیا ہے۔ ان کا دہلی کا فون نمبر یہ ہے: 6849997

انھوں نے بتایا کہ ستمبر ۱۹۹۳ء میں وہ بھٹنڈا (پنجاب) گئے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ ایک مسجد میں مرمت اور صفائی کا کام ہو رہا ہے۔ اس کے نیچے دکانیں تھیں اور اوپر کی منزل میں نماز ہوتی تھی۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ یہ مسجد ابھی چند مہینے پہلے واگزار ہوئی ہے۔ ۱۹۴۷ کے ہنگامہ میں یہ ہندوؤں کے قبضہ میں چلی گئی تھی۔ یہاں چوں کہ مسلمان بہت کم تھے، اس لئے کوئی احتجاجی تحریک نہیں چلی۔ وقف بورڈ نے خاموشی کے ساتھ اس کا مقدمہ عدالت میں ڈال دیا۔ لمبی مدت کے بعد اب عدالت نے مسلمانوں کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ اس مسجد کو ہندوؤں نے اپنے قبضہ میں لے کر اس کے نیچے دکانیں بنالی تھیں اور اوپر ان کی رہائش گاہ تھی۔ عدالت کے فیصلہ کے بعد پولیس نے اس کو خالی کرا کر مسلمانوں کو دے دیا۔

یہ ایک نہایت سبق آموز مثال ہے۔ اجودھیا میں مسلمانوں نے ایجی ٹیشن اور ہنگامہ کے ذریعہ مسجد کو حاصل کرنا چاہا مگر مسجد ان کو نہیں ملی۔ بھٹنڈا میں انھوں نے عدالتی عمل (Judicial activism) کے ذریعہ مسجد کو حاصل کرنے کی کوشش کی اور مسجد انھیں مل گئی۔

۴ مئی ۱۹۹۴

جمیل اختر صاحب تین سال سعودی عرب (مدینہ) رہ کر واپس آئے ہیں۔ وہاں وہ ایک فیکٹری میں آپریٹر تھے جو پولی تھین بیگ بناتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ میں وہاں مطمئن نہیں تھا۔ کیوں کہ وہاں بہت امتیاز ہے۔ مثلاً میں آپریٹر تھا اور مجھ کو ۹۰۰ ریال ماہانہ ملتا تھا۔

اور میرا ہلپر (کامل) ایک عرب تھا جو میرا ماتحت تھا۔ اس کو ۱۲۰۰ ریال ماہانہ ملتا تھا۔ عرب اور غیر عرب کے درمیان یہی امتیاز نیچے سے لے کر اوپر تک ہر جگہ ہے۔

ہندستان کے علما اور رہنما اس بات پر ہنگامہ کیے ہوتے ہیں کہ یہاں ہندو اور مسلمان کے درمیان امتیاز برتا جا رہا ہے۔ مگر یہی امتیاز اس سے زیادہ بڑے پیمانہ پر عربوں اور غیر عربوں کے درمیان عرب ملکوں میں پایا جاتا ہے اور اس پر کوئی رہنما شور وغل نہیں کرتا۔

۵ مئی ۱۹۹۴

امریکہ کے سفر میں ۱۳ دسمبر ۱۹۹۳ کو میری ملاقات ڈاکٹر مرغوب احمد قریشی (پیدائش ۱۹۳۱) سے ہوئی۔ انھوں نے ایک مسلم تحقیقی ادارہ (Think tank) قائم کیا ہے اور کئی سال کے ریسرچ کے بعد ایکشن پلان تیار کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں کامیابی کے لئے ہمیں ایک ذہنی جنگ (intellectual warfare) برپا کرنی ہوگی۔ ہمیں گہرا مطالعہ کرکے جاننا ہوگا کہ ہمیں کس کو گرانا ہے اور کس کو اٹھانا ہے اور اپنے مقصد کو کس طرح حاصل کرنا ہے۔

انھوں نے کہا کہ اس سلسلہ میں ایک عمدہ مثال خلیج میں ملتی ہے۔ امریکہ نے اپنے خاتون عراقی سفیر ایپرل گلاسپی (April Gliaspy) کے ذریعہ ایک طرف شاہ فہد سے کہا کہ صدام حسین تمہارے اوپر حملہ کرنے والا ہے اور دوسری طرف صدام حسین سے کہا کہ اگر تم کویت میں اپنی فوجیں داخل کر دو تو ہم اس میں کوئی دخل نہیں دیں گے۔ اس کا جو نتیجہ ہوا وہ آپ کو معلوم ہے۔ یہ ہے وہ تدبیر جس کے ذریعہ ایک اقلیت ایک اکثریت کو کنٹرول کر سکتی ہے:

This is how the minority controls the majority.

انھوں نے کہا کہ ہندستانی مسلمانوں کے مسئلہ کا واحد حل یہ ہے کہ وہ ملک کو مزید تقسیم کرائیں۔ اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ مسلمان دو لیول پر اپنی دو تنظیم قائم کریں۔ ایک خفیہ سطح پر اور دوسری ظاہری سطح پر۔ وہ ایک قوت کو ابھار کر اسے دوسری قوت سے لڑائیں۔ ہندستان جب تک ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائے اس وقت تک مسلمان ہندستان کے ظلم سے محفوظ نہیں ہو سکتا۔

یہ بدترین قسم کی بے دانشی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم دانشور ساری دنیا میں اسی قسم کی بے دانشی میں مبتلا ہیں۔

۶ مئی ۱۹۹۴

ڈاکٹر مہیش شرما نے پنڈت دین دیال اپادھیائے پر ایک ہندی کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کے اجرا پر ایک خصوصی اجتماع نئی دہلی میں پارلیمنٹ انکسی کے ہال میں ہوا۔ اس میں آر ایس ایس اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے بڑے بڑے لیڈر شریک تھے۔ مثلاً لال کرشن اڈوانی اور اٹل بہاری باجپئی وغیرہ۔ ان کی دعوت پر میں نے بھی شرکت کی۔

پنڈت دین دیال اپادھیائے جن سنگھ کے بانیوں میں سے تھے۔ جن سنگھ بعد کو بھارتیہ جنتا پارٹی میں ضم ہوگئی۔ ایک صاحب نے اپنی تقریر میں بتایا کہ جب بھارتیہ جن سنگھ کا دستور لکھا گیا تو اس میں یہ درج تھا کہ جن سنگھ کا مقصد بھارت میں دھرم راج لانا ہے۔ اس موقع پر پنڈت دین دیال اپادھیائے نے مداخلت کرکے دھرم راج کے آگے رول آف لا (Rule of law) لکھوایا۔ یہ ترمیم کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہم ایسا اس لئے کر رہے ہیں تاکہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ جس طرح پاکستان میں تھیاکریسی ہے اسی طرح انڈیا میں بھی تھیاکریسی ہوگی۔

مسلم اخباروں میں یہ بات تو بہت چھپی کہ جن سنگھ ملک میں دھرم راج لانا چاہتا ہے مگر جہاں تک مجھے یاد ہے کسی بھی مسلم اخبار یا رسالے نے یہ نہیں بتایا کہ جن سنگھ کے دستور میں دھرم راج کی تشریح رول آف لا کے لفظ سے کی گئی ہے۔ جماعت اسلامی کے لوگوں سے اگر یہ کہا جائے کہ آپ نے اپنے دستور میں اپنا مقصد حکومت الٰہیہ قائم کرنا بتایا ہے تو فوراً وہ کہیں گے کہ حکومت الٰہیہ سے ہماری مراد اقامت دین ہے۔ مگر جماعت اسلامی کے دانشوروں نے یہ نہیں بتایا کہ دھرم راج سے جن سنگھ کی مراد رول آف لا ہے۔

۷ مئی ۱۹۹۴

پال فنڈلے امریکہ کے ایک سیاست داں ہیں۔ وہ ۲۲ سال تک امریکی کانگرس کے ممبر رہے۔ انھوں نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے ــــــ وہ سچ بولنے کی جرأت کرتے ہیں:

Paul Findlay, They Dare to Speak Out

پال فنڈلے نے اس کتاب میں یہودیوں کے بارہ میں کچھ حقائق کا انکشاف کیا۔ انھوں نے بتایا کہ امریکہ میں چھ ملین (ساٹھ لاکھ) یہودی ہیں۔ وہ اقلیت میں ہوتے ہوئے انتہائی منظم ہیں۔ وہ

امریکہ کے مفاد کے مقابلہ میں ہمیشہ اپنی قوم کے مفاد کا ساتھ دیتے ہیں۔ ان میں دو لاکھ اصل فعال یہودی ہیں۔ انھوں نے مالی اداروں اور میڈیا پر قبضہ کرکے امریکہ کو اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے۔ وہ مجرمانہ سازش کے تحت امریکہ کو اسرائیل کا ساتھی بنائے ہوئے ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد امریکہ کے یہودی پال فنڈلے کے دشمن ہو گئے۔ اپنے میڈیا کے ذریعہ انھوں نے پال فنڈلے کی اتنی زیادہ کردار کشی کی کہ ۲۲ سال کے بعد امریکی کانگرس کے الکشن میں وہ ہار گئے۔

ٹھیک یہی تجربہ مجھے اپنے سلسلہ میں مسلم شخصیتوں کی طرف سے ہو رہا ہے۔ میں نے ان پر تنقید کی تو ان شخصیتوں کے حلقے میرے دشمن ہو گئے۔ انھوں نے اپنے تمام ذرائع سے میری کردار کشی شروع کر دی۔ یہ لوگ نہایت سرگرمی کے ساتھ مسلمانوں کو سمجھا رہے ہیں —— میں ایک بکا ہوا آدمی ہوں۔ میں ہندوؤں کا ایجنٹ ہوں۔ میں سرکاری مولوی ہوں۔ وغیرہ۔ جو لوگ اللہ سے بے خوف ہوں ان کے درمیان سچ بولنے کی یہی قیمت ہمیشہ دینی پڑتی ہے۔

۸ مئی ۱۹۹۴

مولانا ابوالہاشم بنگالی متحدہ بنگال مسلم لیگ کے آخری جنرل سکریٹری تھے۔ ان کا ایک انٹرویو لاہور کے روزنامہ نوائے وقت کے شمارہ ۲۹ اپریل ۱۹۹۴ (فرائڈے میگزین) میں چھپا ہے۔ انٹرویو لینے والے مسٹر محمد بدر منیر ہیں۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے:

"گاندھی کے بارہ میں ان کا خیال تھا کہ وہ اس صدی کا سب سے بڑا منافق تھا۔ مولانا ابوالہاشم نے بتایا کہ گاندھی نے جب نواکھالی کے فسادات کے بعد وہاں ستیہ گرہ شروع کی تو میں وہاں گیا اور گاندھی کو اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کرکے انھیں اسلام لانے کی ترغیب دی۔ گاندھی جی نے جواب میں کہا: مولانا آپ نے بہت دیر کر دی۔ اب جبکہ میں مرنے والا ہوں تو ان باتوں کا کیا فائدہ۔ مولانا کے بقول، جب انھوں نے مولانا حسرت موہانی سے اس کا تذکرہ کیا تو وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولے: اجی مولانا صاحب، خدا کا شکر ادا کریں کہ گاندھی مسلمان نہ ہوا، ورنہ مسلمانوں کا وہ حشر کرتا کہ خدا کی پناہ۔ اجی، مولانا، اسلام نے آپ کا کیا بگاڑا تھا۔ مولانا ابوالہاشم کہتے تھے کہ میں ہندوؤں کو ملعون کہتا ہوں"

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستانی تحریک نے مسلمانوں میں کس قسم کا ذہن بنایا تھا، بدقسمتی سے یہی ذہن آج بھی سرحد کے دونوں طرف کم و بیش موجود ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے بھی مسلمانوں کا سب سے بڑا سرمایہ نفرت اغیار تھا۔ اور آج بھی ان کا سب سے بڑا سرمایہ نفرت اغیار ہے۔ یہی منفی مزاج ہے جس نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو تباہ کر رکھا ہے۔

۹ مئی ۱۹۹۴

مکہ سے نکلنے والے عربی ہفت روزہ العالم الاسلامی (۲۵ اپریل ۱۹۹۴) میں ابراہیم ابو کریمہ کے قلم سے ایک مضمون ہے۔ اس کا عنوان ہے: الصبر فی القرآن الکریم والسنة النبویة۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم کے مطابق صبر کا مادہ اور اس کے مشتقات قرآن میں ۱۰۳ بار آئے ہیں۔ اسی طرح احادیث میں صبر کے فضائل کثرت سے بیان کئے گئے ہیں۔ مضمون کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے: لهذا كان الصبر من اعظم اخلاق المومنين وله منزلة من ارفع وارقى منازل الصالحين

ایک طرف اس میں صبر کو مومنین صالحین کا اعلیٰ وارفع اخلاق بتایا گیا ہے۔ دوسری طرف اخبار کا بیشتر حصہ ظلم و زیادتی کی باتوں سے بھرا ہوا ہے۔ مثلاً اسی اخبار کے صفحۂ اول پر بوسنیا اور کشمیر کے مسلمانوں پر کئے جانے والے مظالم کا تذکرہ نمایاں سرخیوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہی موجودہ زمانہ میں تمام مسلم اخباروں اور رسالوں کا حال ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلم علما اور دانشور صبر سے صرف روایتی طور پر واقف ہیں۔ انھوں نے صبر کی حقیقت کو از سر نو اپنے حالات کے اعتبار سے دریافت نہیں کیا۔ صبر اگر ان کی دریافت ہوتی تو وہ جانتے کہ بوسنیا اور کشمیر میں مسلمانوں سے صبر کا حکم مطلوب تھا نہ کہ جہاد کا۔ دونوں جگہ کے مسلمانوں کو سیاسی اقتدار اعلیٰ کو چھوڑ کر بقیہ تمام چیزیں حاصل تھیں۔ ان کو چاہئے تھا کہ وہ سیاسی اقتدار اعلیٰ کے معاملہ میں صبر کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے دوسرے میدانوں میں حاصل شدہ امکانات کو استعمال کریں۔ مگر غلط سوچ کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ ملی ہوئی چیز ان کی نظر میں غیر اہم ہو گئی اور نہ ملی ہوئی چیز سب سے اہم قرار پائی۔ چنانچہ دونوں جگہ انھوں نے انتہائی غیر ضروری طور پر مقامی اقتدار سے لڑائی چھیڑ دی۔ بوسنیا اور کشمیر میں جس چیز کو ظلم بتایا جاتا

ہے وہ حقیقۃً ظلم نہیں ہے بلکہ خود مسلم رہنماؤں کی بے صبری کی قیمت ہے۔ اس کا علاج دوبارہ صبر کی روش کی طرف لوٹنا ہے نہ کہ دوسروں کے خلاف شکایت اور احتجاج کا طوفان برپا کرنا۔

۱۰ مئی ۱۹۹۴

دہلی کے ایک صاحب کا انتقال ہوگیا۔ وہ مجھ سے کم عمر اور مجھ سے زیادہ تندرست تھے۔ مادی اعتبار سے وہ بڑی بڑی ترقیاں کر رہے تھے۔ بہت سی کاریں، کئی بلڈنگیں، اعوان و انصار کی کثرت، پیسہ کی افراط۔ مگر اچانک دل کا دورہ پڑا اور چند منٹ میں انتقال ہوگیا۔

ان کے انتقال کے بعد میں ان کے یہاں گیا۔ ایک بڑے کمرہ میں ان کا جسم ایک گدے پر لٹایا ہوا تھا۔ ان کا جسم بظاہر خاموش تھا، مگر وہ ایک عظیم پیغام نشر کر رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ ان کا مردہ جسم زبان حال سے کہہ رہا ہو: میں سب کچھ کھو چکا۔ پانے والی چیزوں میں سے کوئی چیز اب پانے کے لئے باقی نہیں رہی سوا جنت کے۔ اب میرے آگے صرف ایک ہی پانے کے قابل چیز ہے اور وہ جنت ہے۔ یا تو میں اس کو پاؤں یا اس کو بھی کھو کر ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاؤں۔

۱۱ مئی ۱۹۹۴

آج تمام اخباروں کے صفحہ اول کی اہم ترین خبر ساؤتھ افریقہ کے بارے میں تھی۔ ڈاکٹر نیلسن منڈیلا آزاد ساؤتھ افریقہ کے پہلے صدر منتخب ہوگئے جس کی بنیاد نسلی حکومت کے بجائے جمہوری حکومت ہوگی۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۱ مئی) نے اس خبر کی سرخی حسب ذیل الفاظ میں قائم کی ہے:

From prisoner to president Mandela

ساؤتھ افریقہ ایک انتہائی زرخیز ملک ہے۔ اس کی آبادی تین کروڑ ہے۔ سفید فام اقلیت یہاں ساڑھے تین سو سال سے حکومت کر رہی تھی۔ ڈاکٹر منڈیلا نے اس کے خلاف تحریک چلائی۔ وہ ۲۷ سال تک جیل میں رہے۔ آخرکار ان کی تحریک کامیاب رہی۔ سفید فام

حکومت آزاد الکشن پر راضی ہوئی۔ الکشن ہوا تو ووٹروں کی دو تہائی اکثریت نے نیلسن منڈیلا کی پارٹی (ANC) کو ووٹ دیا۔

نیلسن منڈیلا مہاتما گاندھی سے متاثر ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریک عدم تشدد کی بنیاد پر چلائی۔ عین اسی زمانہ میں فلسطین کی آزادی کی تحریک تشدد کی بنیاد پر چلائی گئی۔ فلسطینی ۵۰ سالہ قربانیوں کے باوجود ناکام ہیں۔ اور ساؤتھ افریقہ کی سیاہ فام نسل اسی مدت میں پر امن جدوجہد کے ذریعہ کامیاب ہو گئی۔ یہ واقعہ ایک تاریخی ثبوت ہے کہ تشدد کی طاقت کے مقابلہ میں عدم تشدد کی طاقت زیادہ بڑی ہے۔

۱۲ مئی ۱۹۹۴

ٹائمس آف انڈیا کے سابق اڈیٹر گری لال جین نے ٹائمس آف انڈیا (۱۴ اگست ۱۹۹۲) میں برصغیر ہند کے مسلمانوں کے بارہ میں لکھا تھا کہ ہندستانی اسلام کو ۱۹۶۵ اور ۱۹۷۱ میں ایک اور انقلابی تبدیلی کو جھیلنا پڑا جب کہ مسلمانوں کی عظیم بہادری کا افسانہ میدان جنگ میں دفن کر دیا گیا:

Indian Islam underwent another radical change in 1965 and 1971 when the myth of superior Muslim valour was laid to rest on the battlefield.

اس تبصرہ کو پڑھ کر مسلم دانشوروں کو غصہ آئے گا۔ مگر مجھے خود مسلم دانشوروں اور مسلم رہنماؤں پر غصہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو جوش دلا کر غیر ضروری طور پر لڑا دیتے ہیں۔ اس کا واحد نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمان شکست کھاتے ہیں اور تاریخی روایات کے نتیجہ میں لوگوں کے اوپر ان کا جو ایک بھرم قائم تھا وہ بھی ٹوٹ کر ختم ہو جاتا ہے۔

۱۳ مئی ۱۹۹۴

مولانا انیس لقمان ندوی سے میں نے کہا کہ میں فلم نہیں دیکھتا۔ مگر آجکل کے زمانہ میں فلمی گانے اس طرح فضا میں بکھیرے جا رہے ہیں کہ آدمی کو بہر حال انھیں سننا پڑتا ہے۔ اس طرح کا ایک گانا بار بار میرے کان میں پڑا جس میں ہیرو اپنی محبوبہ سے کہتا ہے کہ: ہم تڑپ تڑپ کر تمہارے گیت گائیں گے۔

میں نے کہا کہ میرا بھی یہی حال ہو رہا ہے۔ میں مسلسل طور پر اتنے زیادہ شدید غم میں رہتا ہوں کہ زندگی میرے لئے ایک ناقابل برداشت بوجھ بن گئی ہے۔ مگر خدا اور خدا کے دین کے لئے جو کچھ میں لکھتا ہوں اس کو میں چھوڑ بھی نہیں سکتا۔ کیوں کہ اس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔

۱۴ مئی ۱۹۹۴

اخبارات کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کچھ خبروں کو نمایاں طور پر چھاپتے ہیں۔ اور کچھ دوسری خبروں کو وہ سرے سے اپنے کالموں میں جگہ نہیں دیتے۔ مثلاً ہندستان میں ایک مسجد (بابری مسجد) ڈھائی گئی تو تمام اخباروں نے اس کو بار بار چھاپا۔ مگر اسی ہندستان میں ساڑھے تین لاکھ مسجدیں آباد ہیں تو اس کی خبر کسی اخبار میں نہیں ملے گی۔ میں نے ایک جرنلسٹ سے بات کرتے ہوئے کہا کہ یہ غیر متوازن رپورٹنگ (unbalanced reporting) ہے۔ اور یہی غیر متوازن رپورٹنگ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ اس طریقہ نے تمام لوگوں کی سوچ کو منفی بنا دیا ہے۔

۱۵ مئی ۱۹۹۴

اصول فقہ کی کتابوں میں ایک متفقہ اصول یہ بتایا جاتا ہے کہ دفع مضرت، جلب منفعت پر مقدم ہے۔ (درء المفسدة مقدم على جلب المصلحة) شاطبی

فقہاء کے یہاں یہ ایک متفق علیہ شرعی اصول ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے جن مسلم مصلحین نے بھی کوئی اقدام کیا انھوں نے اس اصول کی خلاف ورزی کی ہے اور یہی سب سے بڑی وجہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بربادی کی ہے۔

۱۶ مئی ۱۹۹۴

جدید مورخین کی اکثریت ابن خلدون کو اپنے فکر و نظر اور اسلوب بیان کے اعتبار سے تاریخی مفاجات (المفاجأة التاريخية) کہتی ہے۔ ابن خلدون کے زمانہ میں مسجع عبارت لکھنا ہی واحد اعلیٰ اسلوب سمجھا جاتا تھا۔ مگر ابن خلدون نے انتہائی منفرد طور پر غیر مسجع نثر میں اپنی کتاب لکھی۔ فکری اعتبار سے بھی ابن خلدون کی کتاب (مقدمہ) اپنے زمانہ سے بہت مختلف نظر آتی ہے۔ یہ دور فکری جمود کا دور تھا۔ مگر ابن خلدون نے

حیرت انگیز طور پر فکری اجتہاد کی مثال قائم کی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی بھی تنزل کسی قوم کا کلی طور خاتمہ نہیں کرتا۔

۱۷ مئی ۱۹۹۴

نومبر ۱۹۹۳ کے ریاستی الکشن میں خود اجودھیا میں بھارتیہ جنتا پارٹی کا امیدوار ہار گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اجودھیا کی مقامی ہندو آبادی بی جے پی کو پسند نہیں کرتی تھی۔ اگر نا اہل مسلم لیڈر سارے ملک میں ہنگامہ کرکے ہندو فرقہ کو اس اشو پر نہ جگاتے تو بھارتیہ جنتا پارٹی کو خود اجودھیا کے ہندوؤں کی تائید بھی حاصل نہ ہوتی اور مسجد کے خلاف ان کی 'سازش' اپنی موت آپ مرجاتی۔

۱۸ مئی ۱۹۹۴

۱۹۷۷ میں مسٹر سید حامد آئی اے ایس Subordinate Services Commission کے چیرمین تھے۔ اس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے ان سے اور کچھ دوسرے مسلمانوں سے کہا کہ ہمارے ایڈمنسٹریشن میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہوگئی ہے۔ اس طرح ہمارا ایڈمنسٹریشن یکطرفہ (top-sided) ہوجائے گا۔ آپ لوگ مسلمانوں کو آئی اے ایس کے مقابلہ میں بٹھائیے۔ گورنمنٹ اس معاملہ میں پورا تعاون کرے گی۔

اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر خسرو تھے۔ چنانچہ علی گڑھ میں آئی اے ایس کے امیدواروں کے لئے کوچنگ سنٹر کا خصوصی انتظام کیا گیا۔ اس زمانہ میں جب بھی کوئی دانٹ نکلتی تو سید صاحب درخواست کا فارم بڑی تعداد میں لے کر علی گڑھ جاتے اور طلبہ کو شوق دلاکر انھیں فارم پر کرنے پر آمادہ کرتے۔ جو طلبہ فارم پر کرتے ان کے لئے مفت کوچنگ کرائی جاتی۔ اس اسکیم کے ذریعہ بہت سے مسلم نوجوان آئی اے ایس کے امتحان میں شریک ہوکر آئی اے ایس افسر بن گئے۔

اس کے بعد ۱۹۸۰ میں سید حامد صاحب وائس چانسلر ہوکر علی گڑھ گئے اور ۱۹۸۵ تک وہاں وائس چانسلر رہے۔ مگر ان کی وائس چانسلری کے زمانہ میں یہ سلسلہ بند ہوگیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ سید صاحب نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نظام میں بعض خرابیوں کی

اصلاح کرنا چاہا۔ اس پر طلبہ کی طرف سے سخت ردعمل ہوا انھوں نے وی سی لاج پر جارحانہ حملہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کیمپس میں پولیس بلانی پڑی۔ اسی دوران ۱۹۸۲ میں کچھ طلبہ نے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کی۔ اس وقت پولیس نے گولی چلائی جس میں ایک لڑکا آفتاب احمد نام کا مرگیا۔ اس کے بعد یونیورسٹی میں زبردست ہنگامہ ہوا اور اس ہنگامہ میں مذکورہ اسکیم ٹھپ ہوکر رہ گئی۔

کسی بھی اصلاحی اسکیم میں نصف حصہ زیر اصلاح افراد کا ہوتا ہے۔ اگر زیر اصلاح افراد اپنے حصہ کا کردار ادا نہ کریں تو اصلاحی اسکیم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔

۱۹ مئی ۱۹۹۴

مسٹر جیرالڈ روسکو (Gerald Roscoe) کی کتاب (The Good Life) دیکھی۔ یہ کتاب بدھزم کے بارے میں ہے۔ وہ بنکاک سے ۱۹۹۲ میں چھپی ہے۔ اس کے تیسرے باب میں وہ لکھتے ہیں کہ بدھزم میں رسمی تبدیلی مذہب کا طریقہ نہیں ہے۔ میں نے ایک بار ایک انگلش آرٹسٹ سے پوچھا جو بدھسٹ ہوگیا تھا کہ تم نے بدھزم کیسے اختیار کیا۔ اس کا جواب یہ تھا کہ میں بدھسٹ نہیں بنا بلکہ میں نے دریافت کیا کہ میں ایک بدھسٹ ہوں:

I didn't become a Buddhist. I realized that I am a Buddhist. (p. 20)

ٹھیک یہی بات میں نے ایک یورپی نومسلم کے بارے میں پڑھی۔ اس سے پوچھا گیا تھا کہ تم نے کیسے اسلام قبول کیا۔ اس نے جواب دیا:

I didn't become a Muslim. I realized that I am a Muslim.

دونوں میں یہ مشابہت کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے اندر دین فطرت کی طلب پیدائشی طور پر موجود ہے۔ انسان جب خارجی حقیقت کو پاتا ہے تو وہ دراصل اسی اندرونی تقاضے کو اس سے مربوط کرتا ہے۔ البتہ مسلم کا ربط حقیقی ربط ہے اور بدھسٹ کا ربط مصنوعی ربط۔

۲۰ مئی ۱۹۹۴

پہلی جنگ عظیم کے بعد فاتح ملکوں (امریکہ، برطانیہ وغیرہ) نے انٹرنیشنل کوآپریشن

کے لئے جمعیۃ اقوام League of Nations بنائی۔ اس وقت کے مسلم رہنماؤں نے اس کے خلاف نہایت سخت رائیں دیں۔ مثلاً اقبال نے کہا :

چیست جمعیت اقوام کفن دزدے چند بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

اس قسم کے منفی تبصروں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو مغربی قوموں سے نفرت پیدا ہو گئی۔ یہ نفرت سراسر بے معنی تھی۔ یہ قومیں کفن چور نہیں تھیں۔ وہ جدید قوتوں کی حامل تھیں۔ اگر مسلمان ان سے متنفر نہ ہوتے تو ان سے بہت کچھ سیکھتے۔ مگر نفرت کی نفسیات نے ان کے اندر سیکھنے کا ذہن پیدا ہونے نہیں دیا۔ دوسری جنگ عظیم میں جاپان کو امریکہ سے نہایت تلخ تجربہ ہوا تھا۔ مگر جاپانی امریکیوں سے متنفر نہیں ہوئے۔ چنانچہ امریکیوں سے انھوں نے بہت سی نئی چیزیں سیکھیں اور ترقی کی۔ مگر مسلمان ایسا کرنے میں ناکام رہے۔

۲۱ مئی ۱۹۹۴

آج آل انڈیا ریڈیو (نیشنل چینل) میں ایک ٹاک ریکارڈنگ کے لئے جانا ہوا۔ وہاں لکشمی شنکر باجپئی سے ملاقات ہوئی۔ گفت گو کے دوران انھوں نے کہا کہ شیواجی اور رانا پرتاپ کے بارے میں بہت سی غلط باتیں مشہور کی گئی ہیں۔ حالاں کہ وہ بہت اچھے لوگ تھے۔ مثلاً شیواجی کے سپاہی ایک بار ایک مسلمان کو پکڑ لائے۔ شیواجی نے اپنے سپاہیوں کی اس بات کو ناپسند کیا اور اس مسلمان کو پالکی میں بٹھا کر اس کے گھر واپس بھیجا۔ اسی طرح مہارانا پرتاپ کی ملاقات عید کے دن کچھ مسلمانوں سے ہوئی۔ اس وقت مہارانا پرتاپ کے پاس کوئی اور چیز انھیں دینے کے لئے نہیں تھی۔ مہارانا پرتاپ کے ہاتھ میں سونے کا کڑا تھا۔ انھوں نے وہ کڑا اتار کر مسلمانوں کو دے دیا۔ اور کہا کہ یہ آپ لوگوں کے لئے عید کا تحفہ ہے

اس ملاقات کے بعد میں نے سوچا کہ اس کے باوجود اس ملک میں ہندو مسلم تعلقات کیوں خراب ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ سمجھ میں آئی کہ مختلف اسباب سے ایسا ہوا ہے کہ ہندوؤں کے ذہن میں اپنے بڑوں کی اچھی باتیں آگئیں۔ اور مسلمانوں کے بڑوں کی بری باتیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے ذہن میں ہندو بڑوں کی بری باتیں بسی ہوئی ہیں۔ اور اپنے

بڑوں کی اچھی باتیں۔ اسی غلط سوچ نے دونوں فرقوں کے درمیان خلاف واقعہ طور پر بدگمانیاں پیدا کیں اور دونوں ایک دوسرے کو نفرت کی نظر سے دیکھنے لگے۔

۲۲ مئی ۱۹۹۴

آج عیدالاضحیٰ تھی۔ نماز کے بعد دہلی میں ایک صاحب کے یہاں ملنے گیا۔ گھر کے ایک لڑکے نے کہا کہ آج یہاں پانی نہیں آیا۔ لڑکے کے والد نے پرفخر انداز میں کہا کہ، ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے یہاں پانی کا بہت انتظام ہے۔ میں نے سوچا کہ میرا حال تو یہ ہے کہ پانی موجود ہو تب بھی میں اپنے کو بے پانی سمجھتا ہوں۔ اور لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ پانی کے بغیر بھی اپنے کو پانی والا سمجھ رہے ہیں۔ کتنا زیادہ فرق ہے ایک انسان اور دوسرے انسان میں۔

۲۳ مئی ۱۹۹۴

اکثر لوگ مجھ سے پوچھتے کہ آپ کے بعد آپ کے مشن کو کون چلائے گا۔ جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے، واضح طور پر میں کسی کا نام نہیں لے سکتا۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ میرے مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ یہاں ضرور کسی نہ کسی کو اٹھائیں گے اور وہ اس مشن کو لے کر آگے بڑھے گا۔

البتہ عالم عرب میں ایک واضح نام میرے پاس موجود ہے، اور وہ شیخ محمد سلیمان القائد (طرابلس) کا ہے۔ ان کے اندر اعلیٰ درجہ کی قائدانہ صلاحیت موجود ہے، اسی کے ساتھ انھوں نے اس مشن کو بخوبی طور پر سمجھا ہے۔ طرابلس کے اخوان سے میں نے کہا تھا کہ محمد سلیمان القائد ہمارے مشن کے "لینن" ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے بعد وہ اس مشن کو کامیابی کے ساتھ چلائیں گے۔ ۲۶ اگست ۱۹۹۱ کو قذافی کی حکومت نے ان کو گرفتار کر لیا تھا۔ تادم تحریر وہ قید میں ہیں۔ یقیناً ایک روز وہ باہر آئیں گے، اور جب باہر آئیں گے تو ان شاء اللہ زیادہ بہتر طور پر وہ اس مشن کا کام کرنے کے قابل ہو چکے ہوں گے۔

۲۴ مئی ۱۹۹۴

قرآن میں سورہ المزمل میں ہے کہ واصبر علی ما یقولون (اور لوگ جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر کرو۔) آج اس آیت کو عربی تفاسیر میں دیکھ رہا تھا۔ ہر ایک نے اس کو

منسوخ قرار دیا ہے۔ ہر ایک نے لکھا ہے کہ قتال کی آیت اترنے کے بعد یہ آیت منسوخ ہو گئی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی تفسیریں قرآن فہمی کے لئے پردہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس آیت میں قول پر صبر کا حکم ہے نہ کہ جارحیت پر صبر کرنے کا حکم۔ ہجرت سے پہلے اہل ایمان جارحیت پر صبر کرتے تھے۔ ہجرت کے بعد جارحیت کے مقابلہ میں قتال کا حکم نازل ہوا۔ مگر جہاں تک ناپسندیدہ قول پر صبر کرنے کا معاملہ ہے، وہ ہجرت کے پہلے بھی مطلوب تھا اور ہجرت کے بعد بھی مطلوب ہے۔ حتی کہ عین میدان جنگ میں بھی اہل ایمان کو قول پر صبر ہی کرنا ہے۔ قولی اذیت رسانی پر صبر ایک عبادت ہے، اور یہ عبادت ہمیشہ باقی رہتی ہے، وہ کبھی منسوخ نہیں ہوتی۔

۲۵ مئی ۱۹۹۴

سید حامد صاحب (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) نے حیدر آباد کے مدینہ ایجوکیشنل سنٹر میں تقریر کی۔ موضوع تھا: مسلم مسائل اور ان کا حل۔ تقریر کے دوران انھوں نے کہا کہ ملت میں تعلیمی بیداری پر سب سے زیادہ کام حیدر آباد میں ہو رہا ہے۔ لیکن آپس کی مخاصمت اور دشمنی کے باعث حیدر آباد" حسد آباد" بنتا جا رہا ہے جو انتہائی تکلیف دہ ہے (رہنمائے دکن ۲۱ نومبر ۱۹۹۳) یہی حال آجکل ہر جگہ کے مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔

کسی آدمی کا اپنا لڑکا ترقی کرے تو وہ خوش ہوتا ہے۔ لیکن اگر کسی دوسرے شخص کا لڑکا ترقی کرے تو وہ اس پر حسد کرتا ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ آدمی اپنے بیٹے کی ترقی میں اپنی بڑائی دیکھتا ہے۔ مگر دوسرے کی ترقی میں وہ اپنی بڑائی نہیں دیکھ پاتا۔ اگر مسلمانوں کے اندر ملی احساس بیدار ہوتا تو وہ دوسرے کی ترقی کو ملت کی ترقی سمجھتے۔ اس طرح وسیع تر معنوں میں ہر مسلمان کی ترقی انھیں خود اپنی ترقی نظر آتی۔ مگر بدقسمتی سے یہ احساس مسلمانوں میں موجود نہیں۔

۲۶ مئی ۱۹۹۴

ٹائمس آف انڈیا (۲۶ مئی) کے وسط میں ایک مضمون چھپا ہے۔ اس میں بتایا گیا

ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی (جن سنگھ) نے ۱۹۸۴ کے الکشن میں حصہ لیا تو اس کے صرف دو ممبر چن کر لوک سبھا میں آسکے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۸۹ کے جنرل الکشن میں اس کے ۸۶ ممبر کامیاب ہو کر لوک سبھا میں پہنچے۔ پھر ۱۹۹۰ کے الکشن میں اس کے ۱۱۹ ممبر لوک سبھا میں کامیاب ہو گئے۔

مضمون میں یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ تیز رفتار اضافہ کیسے ہوا۔ خود بھارتیہ جنتا پارٹی کے لوگوں نے تسلیم کیا ہے کہ مسلم لیڈروں کی طرف سے اٹھائی ہوئی شاہ بانو تحریک اور بابری مسجد تحریک ہمارے لئے نہایت معاون ثابت ہوئی۔ ان دھواں دھار تحریکوں کی وجہ سے ہمارے لئے یہ ممکن ہوا کہ ہم ہندوؤں کو فرقہ وارانہ لائن پر موبیلائز کریں۔ اس کے بغیر یہ سیاسی کامیابی ناممکن تھی۔

جن سنگھ نے آریہ سماج کو ساتھ لے کر ۶۷-۱۹۶۶ میں گئو ہتھیا اندولن چلایا۔ یہ در اصل پولٹیکل اسٹنٹ تھا۔ مگر مسلمانوں نے اس کے خلاف کوئی ردعمل نہیں دکھایا۔ اس معاملہ میں انھوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ چنانچہ یہ اندولن ناکام ہوگیا۔ اور ہندو انتہاپسند عناصر کو اسمبلی میں اپنی تعداد بڑھانے کا موقع نہیں ملا۔ مگر شاہ بانو کے بارہ میں جسٹس چندرا چوڑ کے فیصلہ کے بعد آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے جو دھواں دھار تحریک چلائی۔ اور بابری مسجد کے نام پر مسلم لیڈروں نے جو احتجاجی ہنگامے برپا کئے، اس نے ہندوؤں کو جگا دیا۔ اس کا نتیجہ بھارتیہ جنتا پارٹی کی مذکورہ سیاسی کامیابی تھی۔

۲۷ مئی ۱۹۹۴

۲۴ مئی کو حج کا دن تھا۔ منیٰ میں رمی جمرات کے موقع پر حاجیوں نے پتھر مارنے کے لئے ہجوم کیا۔ اور غیر ضروری جوش دکھایا۔ اسی دوران کسی وجہ سے بھگدڑ مچ گئی۔ اس بھگدڑ میں ایک ہزار سے زیادہ حاجی خود حاجیوں کے پیروں کے نیچے دب کر مر گئے۔ حج کے زمانہ میں ایک معمولی چڑیا مارنا بھی حرام ہے۔ مگر حاجیوں نے اپنی نادانی اور بےشعوری کے نتیجہ میں ایک ہزار حاجی مار ڈالے۔

انگریزی روزنامہ ہندستان ٹائمس (۲۶ مئی) نے اپنے ایڈیٹوریل نوٹ میں لکھا ہے کہ اس بار ۲۵ لاکھ آدمی حج کے لئے مکہ پہنچے تھے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن ملکوں سے

وہ لوگ آئے تھے انھوں نے ان کو ضروری تربیت نہیں دی تھی۔ حاجیوں کو بتانا چاہئے تھا کہ جمرات پر پتھر پھینکنا ایک علامتی عمل ہے۔ اور اس کی اہمیت نہیں کہ ان کے پھینکے ہوئے پتھر واقعۃً ستون پر پہنچے یا نہیں۔ اگر وہ اس کو جانتے تو یہ بھگدڑ واقع نہ ہوتی :

The pilgrims could have been told that throwing stones at Jamrat was a symbolic act and it did not matter whether the stones really hit the pillar. Had they realized this, the stampede might not have occurred.

۲۸ مئی ۱۹۹۴

ٹائمس آف انڈیا (۲۷ مئی) نے مکہ میں ٹریجڈی Tragedy in Mecca کے عنوان سے ایک نوٹ لکھا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۷۹ میں کچھ انتہا پسندوں نے مکہ کے حرم میں داخل ہو کر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد فوج نے حرم کا محاصرہ کر لیا اور انتہا پسندوں پر گولی چلائی گئی جس کے نتیجہ میں ۲۰۰ آدمی مر گئے۔ ۱۹۸۷ میں ایرانی حاجیوں کا تصادم دوسرے حاجیوں سے ہوا۔ اس موقع پر بھی امن قائم کرنے کے لئے گولی چلانی پڑی اور ۴۰۰ آدمی مر گئے۔ ۱۹۹۰ میں ایک ٹنل سے گزرتے ہوئے حاجیوں میں بھگدڑ میں ۱٫۴۲۶ حاجی دب کر مر گئے۔ اب ۱۹۹۴ کے حج میں رمی جمرات کے موقع پر بھگدڑ ہوئی اور اس میں ایک ہزار سے زیادہ حاجی دب کر ہلاک ہو گئے۔

اس قسم کی ہلاکت اگر ہندستان میں ہو تو فوراً تمام مسلم رہنما اخباروں میں بیان شائع کریں گے جس میں "انتظامیہ" کی مذمت کی گئی ہو۔ مگر سعودی عرب میں اس قسم کے واقعات پر کسی ایک عالم نے بھی سعودی حکومت کو ذمہ دار قرار دے کر کوئی مذمتی بیان شائع نہیں کیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مذکورہ واقعات پر علماء کو سعودی حکومت کی مذمت کرنا چاہئے۔ میرا کہنا صرف یہ ہے کہ ہمارے علماء اور رہنماؤں کو ڈبل اسٹینڈرڈ نہیں ہونا چاہئے۔ ان کے لئے فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ یا تو دونوں جگہ بولیں یا دونوں جگہ چپ رہیں۔

۲۹ مئی ۱۹۹۴

الرسالہ مشن کی عمر تقریباً اتنی ہی ہے جتنی کہ میری عمر ہے۔ اگرچہ الرسالہ کے

نام سے وہ باقاعدہ طور پر ۱۹۷۶ میں شروع ہوا۔ اس مشن کا مقصد یہ تھا کہ موجودہ مسلم نسلوں کے لئے اسلام کو از سر نو دریافت بنایا جائے۔ اور اسی کے ساتھ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں داعی۔ مدعو کا رشتہ قائم کیا جائے تاکہ دعوت کا عمل دوبارہ جاری ہو سکے۔ مگر بظاہر یہ سادہ سا کام اتنا زیادہ مشکل ہے کہ اس سے زیادہ مشکل کوئی اور کام نہیں۔ اسلام کو دریافت بنانے کے لئے تنقید کا اسلوب ناگزیر ہے مگر آج کوئی تنقید سننے کے لئے تیار نہیں۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم کرنے کے لئے مدعو کے حق میں کلمات خیر کہنا پڑتا ہے، اور مسلمانوں کا موجودہ مزاج یہ ہے کہ مدعو کے حق میں کلمات خیر کو سنتے ہی وہ مشتعل ہو جاتے ہیں۔

۳۰ مئی ۱۹۹۴

اس سال نارتھ انڈیا میں اتنی سخت گرمی پڑی ہے کہ پچاس سال کا ریکارڈ ٹوٹ گیا۔ بعض مقامات پر نقطۂ حرارت تقریباً ۵۰ درجہ تک پہنچ گیا ہے۔ عوام اس گرمی میں مر رہے ہیں یا بیمار ہو رہے ہیں۔ خواص نے کولر اور ایر کنڈیشنر لگا کر مصنوعی طور پر اپنے گرد ایسا ماحول بنا لیا ہے کہ گرمی کی شدت اب ان کے لئے اخبار کی ایک خبر ہے نہ کہ کوئی ذاتی تجربہ۔ بظاہر ایک مصیبت میں ہے اور دوسرا آرام میں۔ مگر دونوں میں سے کوئی نہیں جس نے قدرت کے اس واقعہ سے کوئی گہرا سبق لیا ہو۔ اول الذکر اگر رَبِّیٓ اَہَانَنِ کی تصویر بنا ہوا ہے تو ثانی الذکر رَبِّیٓ اَکْرَمَنِ کی تصویر۔

۳۱ مئی ۱۹۹۴

سعید بن حسن الحلبی ۱۱۸۸ھ میں حلب میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۵۹ھ میں دمشق میں ان کی وفات ہوئی۔ وہ حنفی تھے اور اپنے زمانہ میں شام کے بڑے فقیہہ شمار کئے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک روز وہ دمشق کی مسجد میں درس دے رہے تھے۔ کسی وجہ سے وہ اپنا پاؤں پھیلائے ہوئے تھے۔ اسی دوران شام کا حاکم ابراہیم پاشا (م ۱۲۶۴ھ) ادھر سے گزرا۔ شیخ کا درس سننے کے شوق میں وہ مسجد میں داخل ہوا۔ وہ شیخ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا، لیکن شیخ بدستور اپنا پاؤں پھیلائے رہے۔ اور اپنے درس میں مشغول رہے۔

وہ نہ حاکم کی طرف متوجہ ہوئے اور نہ اپنا پاؤں سمیٹا۔ کچھ دیر کے بعد ابراہیم پاشا واپس چلا گیا۔ لوگ ڈرے کہ اب شیخ کے خلاف کوئی سخت حکم جاری ہوگا۔ مگر اس کے برعکس ابراہیم پاشا نے واپسی کے بعد دینار (سونے کا سکہ) سے بھری ہوئی ایک تھیلی شیخ کی خدمت میں بھیجی۔ شیخ نے تھیلی قبول نہیں کی اور یہ کہہ کر اس کو واپس کر دیا کہ تم اپنے آقا سے میرا سلام کہنا اور یہ کہہ دینا کہ جو آدمی اپنا پاؤں پھیلاتا ہے وہ اپنا ہاتھ نہیں پھیلاتا:

سَلِّمْ علی مولاک وقل له   انّ الذی یمدّ رجله لا یمدّ یدہٗ

بعینہٖ یہی قصہ ہندستان کے مشہور بزرگ نظام الدین اولیاء کے بارہ میں بتایا جاتا ہے۔

رسول اور اصحاب رسول دین میں نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر ان کے یہاں ایسا کوئی واقعہ نہیں پایا جاتا۔ یہ واضح طور پر مومنانہ تواضع کے خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس پورے قصہ میں عجب کی نفسیات جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور عجب اور تقویٰ دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے۔ اس قصہ کو اگر صحیح مانا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ مذکورہ دونوں بزرگ تقویٰ کے مقام پر نہ تھے، اس لئے میں کہتا ہوں کہ یہ ایک گھڑی ہوئی کہانی ہے۔ وہ قصہ گویوں کی ایجاد ہے۔ وہ کوئی تاریخی واقعہ نہیں۔

یکم جون ۱۹۹۴

اجودھیا کی بابری مسجد کو ہندوؤں کے ایک ہجوم نے ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو توڑ دیا۔ اب ہندستان کے علماء کا موقف یہ ہے کہ بابری مسجد کو دوبارہ عین اسی مقام پر بنایا جائے۔ اس مطالبہ کے جواز کے لئے وہ فقہاء اسلام کا یہ مسلک بیان کرتے ہیں کہ "مسجد از قیام تا قیامت از فرش تا عرش مسجد رہتی ہے"۔

اگر یہ مسلک اتنا ہی قطعی اور حتمی ہے تو کیا یہ مسلک صرف ہندستان کی ایک خاص مسجد کے لئے ہے۔ ہندستان میں ۱۹۴۷ میں اور اس کے بعد ہزاروں مسجدیں کسی نہ کسی وجہ سے ڈھائی گئی ہیں۔ خود اجودھیا میں عین اسی دن ایک درجن مزید مسجدیں ڈھائی گئی ہیں۔ مگر ان دوسری ہزاروں مسجدوں کے لئے یہ علماء وہ مطالباتی مہم لے کر نہیں اٹھے جس کا مظاہرہ

انھوں نے بابری مسجد کے لئے کیا ہے۔ حدیث کے مطابق، تین مسجدوں کو چھوڑ کر تمام مسجدیں یکساں حیثیت رکھتی ہیں۔ پھر ان نام نہاد علما کو یہ حق کس شرعی اصول کی بنا پر ملا کہ وہ اجودھیا کی ایک مسجد کو استثنائی حیثیت دے سکیں۔

اسی طرح بیشتر مسلم ملکوں میں مسجدیں ڈھائی گئی ہیں۔ اور اس کا باقاعدہ ثبوت موجود ہے۔ مثلاً مصر میں، شام میں، الجزائر میں، عراق میں، پاکستان میں اور خود سعودی عرب میں۔ مگر ان علما نے مذکورہ بالا فقہی اصول کی بنا پر ایسا نہیں کیا کہ وہ ان مسلم ملکوں سے منہدم مساجد کی اسی مقام پر تعمیر نو کا مطالبہ کریں۔ اور جب وہ اس مطالبہ کو نہ مانیں تو وہ ان مسلم ملکوں سے تعلق توڑ دیں۔ یہ دوعملی سراسر خلاف اسلام ہے، اور شریعت میں اسی کا نام منافقت ہے

۲ جون ۱۹۹۴

اوکھلا کے علاقہ میں مسلمانوں کی ایک کالونی ہے جس کا نام ذاکر باغ ہے۔ یہاں کالونی سے متصل مسجد کی ایک جگہ تھی۔ مگر کئی سال تک وہاں مسجد کی تعمیر نہ ہو سکی۔ خانۂ خالی را دیومی گیرد کے اصول پر یہاں ایک ہندو نے کچھ مورتیاں رکھ کر اسے مندر کی صورت دے دی۔ اور پوجا پاٹ شروع کر دیا۔ قریبی علاقہ کے ہندو وہاں آنے لگے۔

یہ ایک سنگین مسئلہ تھا۔ مگر کالونی کے کچھ سمجھ دار لوگوں نے مسلمانوں کو سمجھایا کہ اگر اس اشو پر جوش دکھایا گیا تو فساد ہوگا اور وہ لوگ ہماری پوری کالونی کو جلا دیں گے۔ انھوں نے خاموشی سے سوچ کر ایک منصوبہ بنایا۔ اس طرح کے مندر عام طور پر تجارتی مقصد کے تحت بنائے جاتے ہیں۔ ایک آدمی نے مندر کے پجاری سے تنہائی میں ملاقات کی اور کہا کہ تم جو جگہ بتاؤ وہاں ہم ان مورتیوں کو اٹھا کر رکھ دیں گے۔ تم رکاوٹ نہ ڈالو، ہم تم کو دو لاکھ روپیہ نقد دے دیں گے۔ پجاری اس پر راضی ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے مقامی پولیس اسٹیشن سے رابطہ پیدا کیا اور اس کو ۲۵ ہزار روپیہ دیدئے۔ اس طرح پجاری اور پولیس کو راضی کر لینے کے بعد رات کے اندھیرے میں کچھ مسلم نوجوان ایک ٹرک لے کر آئے۔ انھوں نے مورتیوں کو اور وہاں کی تمام چیزوں کو آہستگی سے اٹھا کر ٹرک پر لادا اور مقررہ مقام پر لے جا کر نصب کر دیا۔ اور راتوں رات عارضی مسجد بنا دی۔

صبح کو جب مقامی ہندؤوں نے دیکھا کہ مورتیاں غائب ہیں تو انھوں نے شور کیا اور پولیس والوں کو بلا کر لائے۔ مسلمانوں نے پولیس والوں سے کہا کہ ہمارا اس میں کوئی دخل نہیں۔ دیوی جی خود اپنی مرضی سے یہاں سے اٹھ کر فلاں جگہ چلی گئی ہیں، وہاں جا کر دیکھ لو۔ پولیس کی ہمراہی میں ہندو وہاں گئے۔ دیکھا تو واقعی وہاں مورتیاں موجود تھیں۔ اب پولیس والوں نے ہندوؤں سے کہا کہ دیوی جی نے جب خود اپنی مرضی سے اپنا استھان بدل لیا تو اب ہم اس میں کیا کر سکتے ہیں۔ یہ واقعہ آج جناب ضیاء الرحمٰن صاحب دہلوی نے بتایا۔

۳ جون ۱۹۹۴

دہلی ۔ جے پور روڈ پر ایک ٹاؤن دیورالا ہے۔ یہاں ایک راجپوت لڑکی روپ کنور کی شادی ایک راجپوت لڑکے سے ہوئی۔ جلد ہی ۴ ستمبر ۱۹۸۷ کو شوہر کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت روپ کنور کی عمر صرف ۱۸ سال تھی۔ بیوہ ہونے کے بعد روپ کنور نے ۱۹۸۷ میں ستی کی مقدس رسم کے مطابق خود سوزی کے ذریعہ اپنا خاتمہ کر لیا۔ پولیس کے بیان کے مطابق اس واقعہ کے وقت وہاں تقریباً ایک ہزار آدمی مشاہد کے طور پر موجود تھے۔ ٹاؤن کے لوگ اس واقعہ کو اپنے لئے فخر سمجھتے ہیں۔ نکاح کے وقت شادی پارٹیاں وہاں جاتی ہیں اور اس کو نیک فال سمجھتی ہیں۔ اب تک وہاں ستی کا ایک نشان کھمبے کی شکل میں قائم تھا۔ اب وہاں باقاعدہ روپ کنور مندر بنایا جانے والا ہے۔ ہائی کورٹ کی طرف سے اس مقام پر مجمع کرنے کی ممانعت ہے۔ اس کے باوجود واقعہ کے ۱۳ دن بعد وہاں چنری مہوتسو کے نام سے ایک میلا ہوا جس میں تقریباً تین لاکھ آدمی اکٹھا ہوئے۔ ہر سال ستی کے دن ہزاروں آدمی اس مقام پر جمع ہوتے ہیں تاکہ ستی ماتا کا آشیرواد حاصل کریں۔

پائنیر (یکم جون ۱۹۹۴) میں نیناد سیٹھ (Ninad D. Seth) نے اس قسم کی تفصیلات دیتے ہوئے انڈیا ٹوڈے کا تبصرہ نقل کیا ہے کہ ایک واحد ستی نے ہندستان کو ۲۱ ویں صدی میں داخل ہونے سے روک دیا:

It took a single sati to stop the Indian march into the 21st century.

اس قسم کی رسوم کا خاتمہ تعلیم میں اضافہ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

۴ جون ۱۹۹۴

الور (راجستھان) میں ایک مولانا محمد حنیف صاحب ہیں۔ وہ پابندی سے الرسالہ پڑھتے ہیں۔ ایک بار ان سے ایک میو غصہ ہو گیا۔ وہ ان کو گالی دینے لگا۔ مولانا حنیف صاحب نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کھڑے ہوئے ہنستے رہے۔ میو نے کہا کہ میں تم کو گالی دے رہا ہوں اور تم ہنس رہے ہو۔ آخر کیوں۔ مولانا حنیف صاحب نے جواب دیا کہ میں تو تمہاری جہالت پر ہنس رہا ہوں۔ یہ سن کر میو بہت شرمندہ ہوا اور ان سے معافی مانگنے لگا۔ مولانا حنیف صاحب اس وقت الور شہر کی جامع مسجد میں امام ہیں۔

۵ جون ۱۹۹۴

ہندستان ٹائمس (۲ جون ۱۹۹۴) میں واشنگٹن کی ڈیٹ لائن کے ساتھ ایک رپورٹ آخری صفحہ پر چھپی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ کے ایک سیاسی لیڈر لی ہملٹن (Lee Hamilton) نے ۲۹ اپریل ۱۹۹۴ کو واشنگٹن میں ایک تقریر کی۔ اس میں انھوں نے کہا کہ کشمیر کے مسئلہ کا حل یہ ہے کہ لائن آف ایکچول کنٹرول کو بین اقوامی سرحد مان کر جموں اور کشمیر کی تقسیم کر دی جائے۔ انھوں نے کہا کہ اقوام متحدہ کی تجویزیں جن میں جموں وکشمیر میں استصواب رائے کے لئے کہا گیا تھا وہ اب تاریخ کی نذر ہو چکی ہیں:

> The UN resolutions that envision a plebiscite in Jammu & Kashmir have been overtaken by history.

امریکہ میں پاکستان کی خاتون سفیر ڈاکٹر ملیحہ لودھی نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ فیصلہ کرنا کشمیر کے عوام کا کام ہے۔ عوام کی خواہشات کا اظہار ہی وہ بنیاد ہے جس پر کشمیر کے معاملہ کا فیصلہ کیا جائے گا:

> The popular expression of the wishes of the people will be the basis for a settlement.

یہ صرف کشمیر کا معاملہ نہیں۔ بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کی سوچ یہی ہے۔ وہ اپنی خواہشوں کے مطابق اپنے مستقبل کا فیصلہ لینا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ مستقبل کا فیصلہ جو چیز کرتی ہے وہ تاریخ

کی طاقتیں ہیں نہ کسی کی اپنی طاقت۔ کشمیر کے عوام کے لئے اپنی خواہش کے استعمال کا موقع ۱۹۴۷ میں تھا۔ اس وقت انھوں نے غلطی کرکے اس معاملہ کو تاریخ کے ہاتھ میں دے دیا۔ اب ان کے لئے دو میں سے ایک کا انتخاب ہے۔ یا تو تاریخ کے فیصلہ کو قبول کریں یا تاریخ کی چٹان سے ٹکرا کر اپنے آپ کو تباہ کرلیں۔

۶ جون ۱۹۹۴

زندگی میں روایات کی بے حد اہمیت ہے۔ زندگی کا نظام قانون سے زیادہ روایات پر چلتا ہے۔ کسی روایت کو توڑنے سے آخری حد تک بچنا چاہئے۔ کیوں کہ ایک بار اگر روایت توڑ دی جائے تو اس کے بعد کسی بھی چیز کے ذریعہ اس کی تلافی نہیں کی جاسکتی۔ روایت بنانے یا توڑنے کا یہ کام سب سے زیادہ بڑے لوگ کرتے ہیں۔ اس لئے بڑے لوگوں کو اس معاملہ میں اور بھی زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ آپ کے بعد ابو بکر صدیق رضؓ خلیفہ بنیں۔ مگر آپ نے ان کو نامزد نہیں فرمایا۔ اسی طرح آپ نے خلیفہ کے انتخاب کے لئے شوریٰ (جمہوریت) کی روایت قائم کی۔ یہ سیاسی روایت آپ کے بعد ایک عرصہ تک چلتی رہی۔

حضرت امیر معاویہ نے اس روایت کو توڑا اور اس کی جگہ اپنے بیٹے کی جانشینی کی روایت قائم کی۔ اس کے بعد اسلام کی سیاسی تاریخ اسی رخ پر چل پڑی۔

اورنگ زیب نے اس روایت کو بھی باقی رہنے نہیں دیا۔ اس نے اپنے باپ کو معزول کرکے اسے قید کر دیا۔ اپنے بھائی کو تہ تیغ کیا۔ اور زبردستی مغل تخت پر بیٹھ گیا۔ اس طرح اس نے حکومت میں چھین جھپٹ کی روایت قائم کی جو اس کے بعد جاری ہوگئی۔ یہاں تک کہ سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ختم ہوگئی۔

خواہ گھر کا معاملہ ہو یا سماج کا معاملہ یا حکومت کا معاملہ، ہر جگہ قائم شدہ روایات کا آخری حد تک احترام کرنا چاہئے۔ خاص طور پر بڑے لوگوں کو تو روایت شکنی کے قریب بھی نہیں جانا چاہئے۔ کیوں کہ یہ دراصل سماج کے بڑے لوگ ہیں جو کسی روایت کو قائم کرتے ہیں یا کسی بنی ہوئی روایت کو توڑ دیتے ہیں۔

۷ جون ۱۹۹۴

مولانا محمد اسماعیل صاحب ناگپور کے رہنے والے ہیں۔ (Tel. 539563) وہ پراپرٹی ڈیلر ہیں۔ اور اسی کے ساتھ تبلیغی جماعت سے جڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اپریل ۱۹۹۴ میں ناگپور میں تبلیغی جماعت کا جلسہ ہوا۔ یہ لوگ کھلی زمین پر شامیانہ لگا کر جلسہ کرتے ہیں۔ پہلے انھوں نے ایک مسلمان کی زمین منتخب کی۔ مگر اس مسلمان نے جلسہ کے لئے زمین دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے جائزہ لیا تو ایک اور خالی زمین انھیں جلسہ کے لئے موزوں نظر آئی۔ یہ زمین ایک ہندو کی تھی جو کہ آر ایس ایس کا ممبر ہے اور کٹر آر ایس ایس کا آدمی سمجھا جاتا ہے۔ یہ ہندو زمین دینے پر راضی ہو گیا۔ چنانچہ اسی زمین پر شامیانہ لگا کر جلسہ کیا گیا۔

مولانا اسماعیل صاحب سے ۶ جون کو ہمارے دفتر میں ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا کہ ہمارے بارہ میں جو جھوٹا پروپگنڈہ کیا جاتا ہے اس کی حقیقت آپ اپنے اس تجربہ سے سمجھ سکتے ہیں۔ کیا ناگپور کے اس واقعہ کی بنا پر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ تبلیغ والے آر ایس ایس کے ایجنٹ ہیں۔ وہ مسلمانوں سے کٹ گئے ہیں۔

۸ جون ۱۹۹۴

قرآن کی جو تفسیریں ہیں اور حدیث کی جو شرحیں لکھی گئی ہیں، ان سب میں ایک مشترک کمی ہے۔ ان میں فنی انداز کی تفصیلات تو کافی رہتی ہیں مگر سبق آموز اور نصیحت والی باتوں پر ان میں بہت کم مواد ملتا ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے فاصبر کما صبر اولو العزم من الرسل ولا تستعجل لهم (الاحقاف ۳۵) اس آیت کی تشریح میں مفسرین سب سے زیادہ اس پر بحث کرتے ہیں کہ اولو العزم پیغمبر کون کون ہیں۔ کسی نے کہا چھ ہیں، کسی نے کہا اٹھارہ ہیں۔ کسی نے کہا کہ سارے ہی انبیاء اولو العزم تھے اور یہاں من تجنیس کے لئے ہے نہ کہ تبعیض کے لئے (القرطبی ۱۶/ ۲۲۰) حالانکہ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ عاجلانہ روش کے مقابلہ میں صابرانہ روش کی اہمیت بتائی جائے۔

اسی طرح حدیث میں مثلاً حضرت عائشہ کے واقعہ کو لیجئے۔ رات کے وقت انھوں نے رسول اللہ

کو حجرہ میں نہیں پایا۔ تلاش کرنے کے لئے نکلیں۔ ان کا خیال تھا کہ آپ اپنی کسی اور بیوی کے یہاں چلے گئے۔ حالانکہ اس وقت آپ مسجد میں نماز میں مشغول تھے۔ اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے حضرت عائشہ کا ہاتھ آپ کے پاؤں پر چلا گیا۔ اب شراح ساری بحث اس پر کرتے ہیں کہ عورت کے چھونے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں۔ حالاں کہ اس روایت میں سبق کے لحاظ سے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ غلط فہمی کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ ام المومنین کو پیغمبر اعظم کے بارہ میں بھی بے بنیاد غلط فہمی ہوسکتی ہے۔ اس لئے جب غلط فہمی پیدا ہو تو ہمیشہ تحقیق کرنا چاہئے۔
(صحیح مسلم بشرح النووی ۴/۲۰۳)

۹ جون ۱۹۹۴

دہلی کے ایک اردو ماہنامہ میں باکس کے اندر یہ نوٹ تھا: بوسنیا ہرزیگووینا کی نیشنل لائبریری ایک صدی قبل سرائیفو میں قائم کی گئی تھی۔ یہ دریائے سرائیفو کے کنارے ایک وسیع قطعہ اراضی میں ہے۔ اس کے اندر ایک عمدہ گارڈن ہے اور لائبریری کی عالی شان عمارت کے ساتھ ایک جدید لائبریری کے تمام وسائل اسے حاصل تھے۔ اس میں مختلف علوم وفنون کی ۲۵ لاکھ کتابیں تھیں۔ اگست ۱۹۹۲ میں سربی وحشیوں نے اس لائبریری پر گولہ باری کی جس سے اس کی عمارت ڈھ گئی اور ۲۰ لاکھ کتابیں جل کر خاکستر ہوگئیں
(الرحیق فروری ۱۹۹۴)

مذکورہ مسلم رسالہ نے یہ تو بتایا کہ بوسنیا کی عظیم لائبریری اگست ۱۹۹۲ میں تباہ کر دی گئی۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ اس سے پہلے ایک سو سال تک وہ کیوں تباہ نہیں کی گئی تھی۔ حالاں کہ واقعہ کا دوسرا پہلو پہلے پہلو سے زیادہ اہم ہے۔

۱۰ جون ۱۹۹۴

مسٹر شکیل احمد انجینئر دوبئی میں رہتے ہیں۔ وہاں وہ ایک بڑا کاروبار کر رہے ہیں۔ اس میں اس کے پارٹنر سویڈن کے مسٹر اینڈرسن ہیں۔ مسٹر شکیل احمد نے بتایا کہ ایک روز وہ مسٹر اینڈرسن کے ساتھ گاڑی پر جارہے تھے۔ اینڈرسن گاڑی چلا رہے تھے۔ ایک جگہ انھوں نے آئس کریم خریدی اور گاڑی کے اندر چلتے ہوئے کھانے لگے۔ انھوں نے مسٹر شکیل کو بھی

آئس کریم دی۔ شکیل صاحب نے صرف ایک آئس کریم لی اور کھا کر اس کا ریپر گاڑی کے باہر پھینک دیا۔ اینڈرسن آئس کریم کھاتے ہوئے اس کا ریپر پلاسٹک بیگ میں رکھتے جا رہے تھے۔

مسٹر اینڈرسن نے جب دیکھا کہ شکیل صاحب نے آئس کریم کا کاغذ باہر سڑک پر ڈال دیا ہے تو انھوں نے فوراً گاڑی روک دی اور کہا کہ شکیل، اس کو اٹھاؤ۔ شکیل صاحب گاڑی سے اترے اور پھینکا ہوا ریپر واپس لے آئے۔ اینڈرسن نے بتایا کہ ہم لوگوں کی ٹریننگ بچپن سے اس طرح ہوتی ہے کہ ہم ایسی حرکت سوچ نہیں سکتے۔ ہم اپنے بچوں کو شروع ہی سے شہری آداب اور ڈسپلن سکھاتے ہیں۔ اگر وہ سمجھانے سے نہ مانیں تو ہم ان کو ڈانٹتے ہیں۔ اس سے بھی کام نہ چلے تو مارتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ڈسپلن ہم لوگوں کے مزاج میں اور ہماری عادت میں داخل ہو جاتا ہے۔

۱۱ جون ۱۹۹۴

جاوید مصطفیٰ رفیقی کشمیری (پیدائش ۱۹۵۴) جموں وکشمیر بنک (لاجپت نگر) میں منیجر ہو کر آئے ہیں۔ اس سے پہلے وہ سرینگر میں تھے۔ انھوں نے بتایا کہ میں اپنی چار سالہ بچی سورہ کے ساتھ گاڑی میں سرینگر کی سڑک پر چل رہا تھا۔ راستہ میں انڈین فوج کے کچھ افراد دکھائی دیے۔ اس نے پوچھا کہ ڈیڈی، ان فوجیوں کو کس نے بنایا ہے۔ رفیقی صاحب نے جواب دیا کہ اللہ پاک نے۔ بچی نے پھر پوچھا کہ ہم کو کس نے بنایا۔ رفیقی صاحب نے دوبارہ کہا کہ اللہ پاک نے۔ بچی نے کہا کہ اللہ پاک کو اگر ہمیں پیدا کرنا تھا تو اس نے ان فوجیوں کو کیوں پیدا کر دیا۔ رفیقی صاحب نے کہا کہ کیوں۔ بچی نے کہا کہ یہ فوجی ہم کو مارتے ہیں۔ پھر اللہ پاک یا تو ہم کو پیدا کرتے یا پھر انھیں لوگوں کو پیدا کرتے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کشمیر میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کتنی زیادہ نفرت پیدا ہو چکی ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے ہر جگہ ایسی سیاستیں چلائیں جس نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نفرت ہی نفرت پیدا کر دی۔ اس کشمیری بچی کی مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی جدید نسل کس طرح پرورش پا رہی ہے۔ مسلمانوں کا موجودہ ماحول اپنے بچوں کو یہ بتا رہا ہے کہ انڈین آرمی ہم کو مارتی ہے۔ مگر ماحول نے

اپنے بچوں کو یہ نہیں بتایا کہ ۱۹۸۶ سے پہلے وہ ہم کو نہیں مارتے تھے۔ جب ہم نے گن کلچر چلا کر ان سے ٹکراؤ مول لیا تو انھوں نے مارنا شروع کیا۔ اس سے پہلے کشمیر میں مکمل امن تھا۔

۱۲ جون ۱۹۹۴

زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت یہ ہے کہ آدمی حالات سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے۔ جو لوگ حالات سے اوپر نہ اٹھ سکیں وہ کبھی کوئی بڑی منصوبہ بندی نہیں کر سکتے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی بتاتی ہے کہ آپ نے ہمیشہ حالات سے اوپر اٹھ کر سوچا۔ آپ نے ہمیشہ حال کے مقابلہ میں مستقبل کو سامنے رکھ کر اپنی رائے قائم کی۔

۱۳ جون ۱۹۹۴

محمود عالم صدیقی (۴۰ سال) ادگیر (ضلع لاتور) مہاراشٹر) کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد ڈھانے کے بعد ہمارے علاقہ میں ہر جگہ فساد ہوا۔ لیکن ادگیر محفوظ رہا۔ انھوں نے بتایا کہ ہم کئی سال سے اپنے یہاں کے نوجوانوں میں الرسالہ والی سوچ پیدا کر رہے ہیں۔ ۶ دسمبر کی رات کو زی ٹی وی کے ذریعہ معلوم ہوا کہ بابری مسجد ڈھا دی گئی۔ ہم نے رات ہی کو نوجوانوں کو جمع کیا۔ کل اکیاون لڑکے جمع ہوئے۔ وہ بھی جوش میں تھے۔ مگر ہم نے الرسالہ کی پالیسی کی اہمیت بتائی۔ آخر سب راضی ہو گئے۔ اب ہم لوگ بستی میں نکلے کہ مسلمانوں کے جذبات کو ٹھنڈا کریں اور انھیں ردعمل سے بچائیں۔ کیونکہ ردعمل کی صورت میں یقینی تھا کہ اجودھیا کا نقصان یہاں تک پہنچ جائے گا۔

لیکن ادگیر میں تین لوکل لیڈر تھے جو مسلمانوں کی میٹنگ کر کے ان کو جہاد اور ایجی ٹیشن پر ابھار رہے تھے۔ ہم نے کہا کہ اجودھیا میں جو ہوا سو ہوا۔ اب کیا آپ لوگ یہاں بھی اس کو دہرانا چاہتے ہیں۔ مگر کوئی سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا۔ آخر ہم خاموشی سے مقامی ڈپٹی کلکٹر سے ملے۔ اس سے کہا کہ ہم لوگ امن بحال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر یہاں تین آدمی مسلمانوں کو بھڑکانے میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ ان تینوں کو گرفتار کر لیجئے۔ انھیں کوئی تکلیف دئے بغیر چند دن تک بند رکھئے۔ انھوں نے فوراً تینوں آدمیوں کو اٹھا لیا اور ان کو اپنے یہاں روک لیا۔ اب ہمارا مشن کامیاب ہو گیا۔ ادگیر کے مسلمان احتجاج اور تشدد سے باز رہے۔

چنانچہ ادگیر میں نہ فساد ہوا اور نہ کرفیو لگا۔

۱۴ جون ۱۹۹۴

ایک سعودی مجلہ ہے۔ اس کا نام المجلہ ہے۔ اس کا ہیڈ کوارٹر جدہ میں ہے اور وہ لندن سے شائع ہوتا ہے۔ اس کا شمارہ ۱۲ جون ۱۹۹۴ دیکھا۔ صفحہ ۹۲ پر مراسلات کے کالم میں ولید بن صالح النمی کی تحریر چھپی ہے۔ وہ ایک عرب ہیں اور جارجیا (امریکہ) میں رہتے ہیں۔ اس کا عنوان ہے ـــــ اسلام ہماری تمام مشکلوں کے حل پر قادر ہے:

الاسلام قادر علی حل جمیع مشکلاتنا

اس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے پاس ایک قانون ہے جس میں کوئی غلطی نہیں۔ اس قانون کی طرف واپس جا کر ہم اپنی تمام مشکلوں کو حل کر سکتے ہیں۔ اس کے لکھنے والے غالباً کوئی اخوانی ہیں۔

میں نے اس کو پڑھا تو میں نے کہا کہ مشکلات کے حل کو قانون سے جوڑنے کا یہی نظریہ مسلمانوں کی تمام موجودہ مشکلوں کا اصل سبب ہے۔ اس لئے کہ اس حل کو بروئے کار لانے کے لئے ارباب اقتدار کو اقتدار سے ہٹائے بغیر اسلامی قانون نافذ نہیں ہو سکتا۔ اسی نام نہاد انقلابی نظریہ کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان ساری دنیا میں اہل سیاست سے ٹکراتے ہیں اور غیر ضروری طور پر مصائب اور مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں۔

صحیح بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے مسائل کا حل دعوت ہے نہ کہ نفاذ قانون۔ دعوت سے امن کا ماحول پیدا ہوتا ہے اور نفاذ قانون کے نظریہ سے گن کلچر کا ماحول۔ دعوت سے پر امن جدوجہد ظہور میں آتی ہے اور تنفیذ قانون کے نظریہ سے متشددانہ جدوجہد۔ پر امن جدوجہد مسائل کو گھٹاتی ہے، جب کہ متشددانہ جدوجہد مسائل کو بے اندازہ حد تک بڑھا دیتی ہے۔

۱۵ جون ۱۹۹۴

آج کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا میں مسٹر جے ایس بندوق والا کا لیٹر چھپا ہے اس میں انھوں نے مسلمانوں کے جذباتی انداز فکر کا تذکرہ کرتے ہوئے میرے بارہ میں لکھا ہے کہ وہ مسلمانوں میں کافی مقبول ہو رہے تھے، مگر جب وہ ناگپور میں آر ایس ایس کے ہیڈ کوارٹر

میں گئے تو مسلمانوں میں ان کی مقبولیت کو دھکا لگا :

Maulana Wahiduddin too had to suffer a setback when he visited the RSS headquarters.

اسی لیٹر میں مکتوب نگار یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ۶ دسمبر ۹۲ کے بعد مسلمانوں کا مزاج بدلا ہے اور اجودھیا جیسے جذباتی اشو پس پشت چلے گئے ہیں :

Emotional issues such as Ayodhya have taken a back seat.

یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے مطابقت نہیں رکھتیں۔

۱۶ جون ۱۹۹۴

دہلی میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت نے عید گاہ کے سلاٹر ہاؤس میں ذبح کئے جانے والے جانوروں کی تعداد بہت گھٹا دی ہے۔ حکومت کا کہنا تھا کہ اس سے گندگی پھیلتی ہے اور دہلی کی ہوا خراب ہوتی ہے۔

دہلی میٹ مرچنٹس ایسوسی ایشن نے اس حکم کے خلاف دہلی ہائیکورٹ میں چیلنج کیا۔ اس نے فیصلہ دیا کہ روزانہ صرف ڈھائی ہزار جانور ذبح کئے جاسکتے ہیں ۔ ۵۰۰ بھینس اور دو ہزار بکرے۔ دہلی کے قصائیوں نے ۲۳ مارچ سے مکمل ہڑتال شروع کر دی۔ اور ذبح کا کام بالکل بند کر دیا۔

قصاب پورہ کا ایک وفد میرے پاس آیا۔ میں نے کہا کہ آپ لوگوں نے اسٹرائک کر کے سخت غلطی کی ہے۔ آپ کو چاہئے تھا کہ آپ اجازت کے مطابق ، موجودہ تعداد ذبح کرتے رہتے اور بقیہ کے لئے پر امن اور قانونی کوشش جاری رکھتے۔ مگر اس وقت لوگ جوش میں تھے کسی نے میری بات نہیں سنی۔ اب خود ہی انھوں نے ۱۶ جون کی صبح سے بلا شرط اپنی اسٹرائک ختم کر دی ہے۔

دہلی میٹ مرچنٹس ایسوسی ایشن کے ایک ممبر محمد یونس قریشی نے ہندستان ٹائمس (۱۶ جون) کی رپورٹ کے مطابق کہا کہ ورکر فاقہ کر رہے تھے اور اب مزید اسٹرائک جاری رکھنا ان کے لئے ممکن نہیں تھا :

Workers were starving and could not hold out any longer.

ٹائمس آف انڈیا (۱۶ جون) کی رپورٹ کے مطابق، دہلی میٹ مرچنٹس ایسوسی ایشن کے سکریٹری مسٹر معین الدین قریشی نے کہا کہ ہم مصالحت پر مجبور ہو گئے تھے۔ بہت سے غریب قصاب اور مزدور اسٹرائک سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے:

We had to compromise, many poor butchers and slaughterers had been hit hard by the strike.

میرے نزدیک یہ کمپرومائز نہیں ہے بلکہ سرینڈر ہے۔ شروع میں ہائی کورٹ کے فیصلہ کے فوراً بعد اگر وہ ایسا کرتے تو وہ کمپرومائز ہوتا۔ مگر اب انھوں نے مجبوری کے تحت کیا ہے اس لئے وہ سرینڈر ہے۔ اب انھیں اس فیصلہ پر کمپرومائز کرنے کا کریڈٹ نہیں دیا جاسکتا۔

۱۷ جون ۱۹۹۴

آج میں نظام الدین ویسٹ کے پارک میں ٹہلنے کے لئے گیا۔ وہاں ایک جگہ ہندو اور کچھ سکھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے مجھ کو بھی بلا کر بٹھالیا۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ ہندو اور سکھ تو کلچر کے اعتبار سے تقریباً ایک ہی تھے۔ پھر پنجاب میں دونوں کے درمیان جھگڑا کیوں ہوا۔ ایک سفید ریش سردار نے "ہندو حکومت" کی شکایت کی۔ اس نے کہا کہ ۱۹۴۷ میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سرداروں سے کہا تھا کہ آپ لوگ بھی (پاکستان کی طرح) اپنا ایک ہوم لینڈ بنا سکتے ہیں۔ لیکن نہرو نے ماسٹر تارا سنگھ اور سردار بلدیو سنگھ کو سمجھایا کہ آپ کو الگ خطہ لینے کی کیا ضرورت۔ سارا بھارت آپ ہی کا ہے۔ مگر بعد کو ہمیں کچھ نہیں دیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ آزادی کے بعد انڈین فوج میں سرداروں کی تعداد ۱۸ فیصد تھی، آج ملٹری میں ان کی تعداد صرف ڈیڑھ فیصد ہے۔

اس کا جواب ایک اور سردار نے دیا جو کہ فوج سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اصل وجہ یہ ہے کہ اب سرداروں کو فوج میں زیادہ فائدہ دکھائی نہیں دیتا، زرعی دور میں فوج میں جانے کا فائدہ تھا، اب صنعتی دور میں وہ فائدہ نہیں۔ انھوں نے ایک فوجی سردار کی

بات دہرائی۔ اس نے کہا کہ میں زندگی بھر فوج میں ملازمت کرنے کے بعد اب ریٹائر ہوا ہوں تو سب کچھ ملا کر مجھ کو ساڑھے سات لاکھ روپیہ ملا ہے۔ آج میں اتنی رقم سے دہلی میں ایک فلیٹ بھی نہیں خرید سکتا۔ جب کہ میری عمر کے جو لوگ بزنس میں گئے وہ آج دہلی میں کوٹھی اور موٹر کے مالک ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سردار لوگ فوج میں اس لئے کم ہیں کہ وہ پہلے کی طرح اب فوج میں جا ہی نہیں رہے ہیں۔

۱۸ جون ۱۹۹۴

دجال کے سلسلہ میں حدیثیں مختلف ہیں۔ کسی حدیث میں دجال (واحد) کا لفظ آیا ہے۔ کسی میں ثلاثون (۳۰) کا لفظ ہے اور کسی میں سبعون (۷۰) کا لفظ۔ ابن حجر العسقلانی لکھا ہے کہ اس سے مراد تحدید نہیں ہے بلکہ کثرت ہے (فتح الباری ۱۳/۹۳)

حدیثوں پر غور کرنے سے میری سمجھ میں آتا ہے کہ دجال یا دجاجلہ سے مراد دور پریس کے ائمہ ضلال (گمراہ رہنما) ہیں۔ دجال کے بارہ میں بخاری کی ایک روایت ہے کہ اس کے ساتھ پانی اور آگ ہوگی۔ اس کی آگ ٹھنڈا پانی ہے اور اس کا پانی آگ ہے (ان معہ ماءً و ناراً فنارہ ماء وماءہ نار) فتح الباری ۱۳/۹۷

اس حدیث میں آتشیں پانی سے مراد غالباً پٹرول ہے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ یہ دجال یا دجاجلہ صنعتی دور میں ظاہر ہوں گے۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جبکہ جدید پریس انسان کے قبضہ میں آچکا ہوگا۔ یہ گمراہ رہنما خود مسلمانوں میں سے نکلیں گے۔ پٹرول کی دولت انھیں صاحب وسائل بنادے گی، اور جدید میڈیا انھیں یہ موقع دے دے گا کہ وہ اعلیٰ ذرائع ابلاغ سے کام لے کر اپنی گمراہ کن باتوں کو ساری دنیا میں پھیلا دیں۔ اس جدید طاقت اور ان جدید وسائل کو استعمال کرکے وہ عالمی سطح پر ایسی گمراہی پھیلائیں گے جیسی گمراہی اس سے پہلے پوری تاریخ میں کسی نے نہ پھیلائی ہو۔

۱۹ جون ۱۹۹۴

حضرت ابو ہریرہؓ بنو مروان کی حکومت تک زندہ رہے جس کا ظلم معروف و مشہور ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ کو نام بنام وہ افراد بتادئے تھے جو بعد کے

زمانہ میں حاکم ہوں گے اور امت کے معاملات کو تباہ کر دیں گے۔ لیکن آپ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو یہ حکم نہیں دیا کہ تم ان سے لڑنا اور ان پر خروج کرنا۔ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ خروج (بغاوت) میں ہلاکت کا شدید تر اندیشہ تھا۔ اس لئے آپ نے ان کا استیصال کرنے کے بجائے ان کی اطاعت کرنے کی وصیت فرمائی۔ اس طرح آپ نے دو برائی میں سے ہلکی برائی اور دو معاملہ میں سے آسان معاملہ کا انتخاب فرمایا

فاختار اخف المفسدتین و ایسر الامرین (فتح الباری ۱۳/۱۳)

یہی سچی "حکمت عملی" ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے پاکستان میں "حکمت عملی" کا یہ مطلب بتایا کہ صدر ایوب کی غیر مطلوب حکومت کو گرانے کے لئے غیر دینی طریقے اختیار کئے جائیں۔ مثلاً ۱۹۶۵ کے الکشن میں ایک خاتون (فاطمہ جناح) کو صدارت کے لئے امیدوار بنا کر صدر ایوب کو ڈاؤن کرنے کی کوشش کرنا۔ مگر یہ ایک لغو سیاست ہے نہ کہ اسلامی حکمت عملی۔ اسلامی حکمت عملی یہ ہے کہ حکمراں سے ٹکراؤ نہ کرتے ہوئے غیر سیاسی دائرہ کے امکانات کو استعمال کرنا۔ پاکستان میں دعوت و اصلاح اور تعمیر و تعلیم کے میدان میں کام کرنے کے لئے زبردست امکانات تھے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی اگر ملکی سیاست سے دور رہ کر ان تعمیری امکانات کو استعمال کرتے تو یہ اسلامی حکمت عملی ہوتی۔ مگر انھوں نے ان امکانات سے صرف نظر کر کے حکمرانوں سے ٹکراؤ شروع کر دیا۔ یہ صرف فساد انگیزی تھی نہ کہ فی الواقع کوئی اسلامی کام۔

۳۰ جون ۱۹۹۴

جنرل اروڑا اور کرنل خان دونوں دوست ہیں۔ وہ ملاقات کے لئے ہمارے دفتر میں آئے۔ گفت گو کے دوران انھوں نے موجودہ ہندستانیوں میں سوچ کے بگاڑ اور کردار کی خرابی کی شکایت کی۔ میں نے کہا کہ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ پچھلے ۵۰ سال سے اس رخ پر کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ میں شاید اکیلا ہوں جو اس کوشش میں مصروف ہے اور خدا کے فضل سے ہزاروں لوگوں کی سوچ میں تبدیلی آئی ہے۔

میں تقریباً ۳۰ سال سے تطہیر فکر اور تعمیر کردار کی کوشش میں لگا ہوا ہوں۔ ۱۹۶۷

میں الجمعیۃ ویکلی کے ذریعہ یہ کام باقاعدہ صحافتی مہم کے طور پر شروع ہوا۔ ۱۹۷۶ سے یہی کام ماہنامہ الرسالہ کے ذریعہ کیا جا رہا ہے۔ میری مسلسل کوشش یہ ہے کہ صحت مند فکر اور انسانی کردار کی تخلیق کرنے والے مضامین چھاپے جائیں۔ اس کے لئے میں روزانہ بہت سے انگریزی اخبارات اور بہت سے انگریزی رسالے پڑھتا ہوں۔ مگر آپ تعجب کریں گے کہ ۱۹۶۷ سے لیکر آج تک ان اخباروں اور رسالوں میں مجھے کوئی تعمیری آرٹیکل ایسا نہیں ملا جس کو ویسا کا ویسا چھاپ دینا کافی ہو۔ میں ہر دن بہت سی خبریں، رپورٹیں اور مضامین پڑھتا ہوں۔ پھر ان میں سے کوئی چیز اخذ کرکے اس میں تعمیر کا پہلو نکالتا ہوں۔ اور پھر اس کو مضمون کی صورت میں تیار کرکے اس کو اپنے میگزین میں چھاپتا ہوں۔

۲۱ جون ۱۹۹۴

آج اپنے گھر کی تمام خواتین کو دفتر میں بٹھا کر سمجھایا کہ تم لوگوں کو مل جل کر رہنا چاہئے۔ کیوں کہ باہمی اختلاف سے برکت اٹھ جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے مہینہ میں اعتکاف میں تھے۔ آپ کو شب قدر کا علم دیا گیا۔ آپ مدینہ کی مسجد سے باہر نکلے کہ مسلمانوں کو اس کی متعین تاریخ بتا دیں۔ اس دوران انصار کے دو آدمی لین دین کی بات پر جھگڑنے لگے۔ اس پر شب قدر کا علم اٹھا لیا گیا۔ اسی طرح احد کی جنگ میں مسلمانوں کی فتح ہوگئی۔ اس کے بعد کچھ مسلمان آپس میں نزاع کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیتی ہوئی جنگ دوبارہ ہار میں تبدیل ہوگئی۔ اس طرح کی مختلف مثالیں دے کر میں نے کہا کہ آپ لوگ مل جل کر رہیں تو یہاں برکت اور رحمت برسے گی۔ اور اگر جھگڑا اور نزاع شروع کر دیا تو آئی ہوئی برکت ختم ہو جائے گی۔

تمام خواتین رونے لگیں۔ دل سے یہ عہد کیا کہ سب کی سب مل جل کر محبت کے ساتھ رہیں گی۔ اختلاف یا شکایت ہو تب بھی ان کے باہمی تعلق میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

میرا خیال ہے کہ ہر گھر میں ایسا ہونا چاہئے کہ گھر والوں کا ہفتہ وار یا ماہوار اجتماع گھر کے اندر ہو۔ اس میں گھر کا بڑا مرد یا بڑی عورت لوگوں کو نصیحت کرے۔ اس سے گھر کے ماحول کو درست رکھنے میں بہت مدد ملے گی۔

۲۲ جون ۱۹۹۴

اخلاص کی دو قسمیں ہیں ــــــ روایتی اخلاص، اور شعوری اخلاص۔ میرا خیال ہے کہ مسجدوں اور مدرسوں کی دنیا میں جو" مخلصین" دکھائی دیتے ہیں وہ سب روایتی اخلاص سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔ روایتی اخلاص اوپری سطح پر تقلید کے زور پر قائم ہوتا ہے۔ اس کے بعد جہاں تک شعوری اخلاص کا تعلق ہے، وہ ہمیشہ نہایت کم یاب رہا ہے۔ اور موجودہ زمانہ میں، کم از کم میرے تجربہ میں تو اب تک کوئی شخص نہیں آیا جس کو شعوری اخلاص کا حامل کہا جاسکے۔ روایتی اخلاص اگر تقلید کا نتیجہ ہوتا ہے تو شعوری اخلاص حقیقت اعلیٰ کی ذاتی دریافت کا نتیجہ۔

۲۳ جون ۱۹۹۴

ایک صاحب نے مجھ کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے اپنے مشن کے تحت کوئی ادارہ (مثلاً مدرسہ) قائم نہیں کیا۔ اس لئے آپ کی موت کے ساتھ آپ کا مشن بھی مرجائے گا۔ انھوں نے مثال دی کہ سرسید کا بھی ایک مشن تھا۔ مگر اسی کے ساتھ انھوں نے علی گڑھ میں ایک تعلیمی ادارہ بھی قائم کیا۔ سرسید آج اسی تعلیمی ادارہ کی بدولت زندہ ہیں۔ ورنہ اب تک وہ ختم ہو چکے تھے۔

میں نے کہا کہ علی گڑھ میں جو چیز زندہ ہے وہ سرسید کا مشن نہیں ہے، وہ سرسید کا قائم کیا ہوا ایک عمارتی ادارہ ہے۔ آج سرسید صرف ایک جامد ادارہ کی صورت میں زندہ ہیں۔ اگر انھوں نے ادارہ قائم نہ کیا ہوتا تو وہ ایک زندہ تحریک کی صورت میں تاریخ میں باقی رہتے۔ اور ایک زندہ تحریک بہرحال جامد ادارہ سے کہیں زیادہ اہم ہے۔

۲۴ جون ۱۹۹۴

کشمیر کے بارہ میں میرا پہلا مضمون ۱۹۶۸ میں الجمعیۃ ویکلی (دہلی) میں چھپا تھا۔ ۲۵ سال سے میں کشمیر کے بارہ میں برابر لکھتا رہا ہوں۔ میرا نقطۂ نظر یہ رہا ہے کہ ملکوں اور قوموں کے فیصلے تاریخی اسباب کے تحت ہوتے ہیں، پرجوش تحریکوں کے ذریعہ نہیں ہوتے۔ تاریخی عوامل نے کشمیریوں کو ۱۹۴۷ میں ایک موقع دیا تھا۔ مگر نادان کشمیری لیڈروں نے

اس کو کھو دیا۔ اب دوبارہ کوئی نیا موقع تاریخی عوامل کے تحت ہی آسکتا ہے۔ کشمیریوں کو چاہئے کہ وہ جذباتیت کے بجائے حقیقت پسندی سے کام لیں۔ وہ ناممکن کی چٹان سے اپنا سر نہ ٹکرائیں بلکہ ممکن کو مان کر موجودہ ملے ہوئے دائرہ میں اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ۲۰ جون ۱۹۹۴ کو اننت ناگ میں قاضی نثار احمد کا جنگجوؤں کے ہاتھوں قتل اس معاملہ میں حد فاصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب کشمیر کے حالات بدلیں گے۔ اب تک وہاں بندوق بردار نوجوانوں کا غلبہ تھا، اب وہاں کشمیری عوام کا غلبہ ہوگا۔ جو سنجیدہ افراد کی رہنمائی میں اسی راستہ کو اختیار کریں گے جس کی طرف راقم الحروف ۱۹۶۸ سے انھیں متوجہ کر رہا تھا۔

آنچہ دانا کند کند ناداں　　لیک بعد از خرابئ بسیار

۲۵ جون ۱۹۹۴

مشہور خطاط محمد خلیق ٹونکی کا آج اپنے وطن ٹونک میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ۶۲ سال تھی۔ وہ ہندستان کے نمبر ایک خطاط سمجھے جاتے تھے۔ ابتدا میں وہ جمعیۃ علما اور ندوۃ المصنفین سے وابستہ رہے۔ ان اسلامی اداروں نے خلیق ٹونکی کا صرف استحصال کیا۔ ان کو ترقی کی طرف لے جانے میں انھوں نے کوئی مدد نہیں کی۔

خلیق صاحب کی ترقی کا دور ۱۹۷۶ سے شروع ہوتا ہے جب کہ شیعہ اور کمیونسٹ وزیر تعلیم پروفیسر نور الحسن نے غالب اکیڈمی (نئی دہلی) میں خطاطی کا اسکول کھولا اور خلیق ٹونکی صاحب کو اس کا انچارج مقرر کیا۔ خطاطی کا یہ اسکول حکومت ہند کی مدد سے قائم ہوا۔ اس کے تحت خلیق ٹونکی صاحب کو معقول ماہانہ تنخواہ ملنے لگی۔ اسی کے ساتھ ان کی حیثیت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ چنانچہ مزید کام کر کے وہ کافی پیسہ کمانے لگے۔ یہاں تک کہ دہلی میں انھوں نے اپنا ذاتی گھر بنایا۔ اس کے علاوہ حکومت ہند کی جانب سے ۱۹۹۰ میں وہ حج کے لئے سعودی عرب گئے۔ ان کو بہت سا ایوارڈ دیا گیا۔

ملت میں لائق افراد آج بھی کثرت سے موجود ہیں۔ مگر ملی ادارے ان کی قدردانی نہیں کرتے۔ اس کی وجہ سے یہ افراد اوپر نہیں اٹھ پاتے۔ خلیق ٹونکی کے ساتھ جو معاملہ حکومت

ہند نے کیا۔ اگر یہی معاملہ اسلامی اداروں میں لائق افراد کے ساتھ کیا جانے لگا تو ملت کی پسماندگی بہت جلد ختم ہو جائے۔

۲۶ جون ۱۹۹۴

شری اوم پورنا سوتنترا نئی دہلی میں بیلی روڈ پر رہتے ہیں۔ کافی ذہین آدمی ہیں۔ اور ان کا بڑا حلقہ ہے۔ وہ نئی دنیا New world بنانے کی تحریک چلا رہے ہیں۔ ان کی دعوت پر ان کے یہاں ایک میٹنگ میں شریک ہوا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں ایک بات کہی جو مجھ کو بہت پسند آئی۔ انھوں نے کہا کہ کام کا پلان ایسا بناؤ کہ جہاں تم بیٹھے ہو وہیں سے تمہارا سفر شروع ہو جائے۔

مختلف لوگوں نے اظہار خیال کیا۔ میری بھی ایک مختصر تقریر ہوئی۔ آخر میں ان کے ایک ساتھی اقبال سنگھ (بڑوت) نے ایک کویتا سنائی۔ اس کا ایک مصرعہ یہ تھا۔

ظلم کو گر مٹانا ہے تو ٹکراؤ ظلم سے

یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ جو لوگ ظلم کو دیکھ کر اس سے ٹکرانے لگیں ان کا سفر کبھی شروع ہی نہیں ہوگا۔ سفر شروع کرنے کے لئے اعراض کی پالیسی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ جماعتیں جب ذہن سازی کے بغیر بنیں تو اسی طرح قسم قسم کے لوگ اس میں بھر جاتے ہیں۔ اسی لئے اس طرح کی جماعتوں کے ذریعہ کوئی حقیقی کام کبھی انجام نہیں پاتا۔

۲۷ جون ۱۹۹۴

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں بے حسی اور بے کرداری دوسری قوموں سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ بظاہر یہ مروجہ عقیدہ ہے کہ "کلمہ گو کے لئے جنت ہے"۔ یہ صحیح ہے کہ کلمۂ ایمان آدمی کو جنت میں لے جاتا ہے۔ مگر جنت عارف کلمہ کے لئے ہے، نہ کہ قائل کلمہ کے لئے۔

قول اور معرفت دونوں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ قول کا مطلب یہ ہے کہ کلمہ کے الفاظ کو بس زبان سے دہرایا جائے۔ اس کے برعکس معرفت یہ ہے کہ کلمہ کی حقیقت دل میں اتر جائے۔ آدمی دریافت کے درجہ میں اس کا ادراک کر لے۔ یہی دریافت والا ایمان وہ

چیز ہے جو کسی شخص کو جنت میں داخلہ کے قابل بنائے گا۔ "کلمہ گو کے لئے جنت ہے" جیسا عقیدہ آدمی کے اندر جسارت پیدا کرتا ہے۔ ایسا آدمی گناہوں کے لئے ڈھیٹ ہو جاتا ہے جبکہ معرفت والا ایمان آدمی کے اندر خوف کی نفسیات پیدا کرتا ہے۔

۲۸ جون ۱۹۹۴

ایک مسلمان بزرگ نے کہا کہ آپ تمام علماء اور رہنماؤں سے الگ اپنا راستہ بنائے ہوئے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ یہ سب سے بڑا بہتان ہے جو میرے اوپر باندھا گیا ہے۔ میں ایک بال کے برابر بھی علماء امت سے ہٹا نہیں ہوں۔ پھر میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ اقبال کا ایک شعر ہے:

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی شکوہ سنج گردش دوراں شدی

تقریباً ستر سال سے تمام مسلمان اس شعر کو دہرا رہے ہیں۔ کسی کو بھی اس پر اعتراض نہیں حتی کہ ہر عالم اور رہنما خود بھی اپنے لفظوں میں یہی بات کر تا رہا ہے۔ ہم نے بھی عین یہی بات کہی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ لوگ اقبال سے غصہ نہیں ہوتے اور ہم سے غصہ ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ اقبال نے اس بات کو مطلق طور پر کہا تھا، ہم نے اس کو منطبق طور پر Applied way بیان کیا۔ ہم نے مجمل کو مفصل کیا۔ ہم نے شاعرانہ اسلوب کو سائنٹفک اسلوب میں بدلا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ نا قابل فہم کو قابل فہم بنا دیا۔

ایسی حالت میں آپ لوگوں کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے الرسالہ مشن کے ذریعہ یہ انتظام کیا کہ فلاح و کامیابی کا جو نسخہ شاعرانہ اسلوب کی محدودیت کی وجہ سے آپ حضرات پر پوری طرح واضح نہیں تھا، اس کو نثر کے کامل اسلوب میں پوری طرح واضح کر دیا۔ یہ شکر خداوندی کا موقع ہے نہ کہ الزام تراشی کا۔

۲۹ جون ۱۹۹۴

سورۃ الاحزاب (آیت ۳۲) میں ہے کہ یا نساء النبی لستن کاحد من النساء (اے نبی کی بیویو، تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔) قدیم کتابوں میں اس کی تفسیر اس طرح کی جاتی ہے کہ فضل اور شرف میں تم اور دوسری عورتیں برابر نہیں ہو (یعنی فی الفضل والشرف)

القرطبی ۱۴/ ۱۷۷
قدیم ذہن نے فوراً اس تفسیر کو مان لیا۔ اب صرف یہ بحث رہ گئی کہ مختلف صاحب فضیلت خواتین میں فضیلت کی ترتیب کیا ہے۔ چنانچہ غور و بحث کے بعد یہ ترتیب قائم کی گئی ـــــ مریم فاطمہ، خدیجہ، آسیہ (القرطبی ۴/ ۸۳
مگر آج کا ذہن ان تفسیروں کو اہمیت نہیں دے گا۔ کیوں کہ آج کا انسان فضیلت کی اصطلاح میں نہیں سوچتا، آج کا انسان سائنٹفک اصطلاح میں، بالفاظ دیگر حقیقت کی اصطلاح میں سوچتا ہے۔ اب چوں کہ یہ تفسیر جدید ذہن کو غیر اہم نظر آئے گی اس لئے وہ قرآن کو بھی ایک غیر اہم کتاب سمجھ لے گا۔ اس لئے آج ضرورت ہے کہ قرآن کی تفسیر وقت کی زبان میں کی جائے۔ مثلاً مذکورہ آیت کی تفسیر آپ اس طرح کریں کہ "اے نبی کی بیویو تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو" کا مطلب یہ ہے کہ تم مشن کی عورتیں ہو۔ پیغمبر کے گھر سے ایک مشن چلایا جا رہا ہے اور تم اس مشنری خاندان کے ممبر کی حیثیت رکھتی ہو۔ تم کو عام عورتوں کے مقابلہ میں زیادہ سنجیدہ اور زیادہ باوقار انداز میں رہنا پڑے گا، ورنہ لوگوں کی نظر میں خود مشن بے وزن ہو کر رہ جائے گا۔

مذکورہ آیت کی تفسیر اگر موخر الذکر انداز میں کی جائے تو آج کا انسان فوراً اس کو قبول کر لے گا۔ اور پھر قرآن بھی اس کو ایک اہم کتاب دکھائی دینے لگے گا۔ حالاں کہ دونوں تفسیروں کا مدعا ایک ہی ہے، صرف زبان اور اسلوب بیان کا فرق ہے۔

۳۰ جون ۱۹۹۴

۱۹۴۷ سے پہلے برصغیر ہند کے مسلمان ایک عظیم ملک کے باشندے تھے۔ اس کے بعد جو انقلابات آئے اس میں ہندستانی مسلمان تین حصوں میں بٹ گئے۔ تینوں کی حیثیت الگ الگ تھی۔ بھارت میں مسلمان گویا اکثریتی فرقہ کے ماتحت کر دئے گئے۔ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں مسلمانوں کی حیثیت نیم آزاد قوم کی ہو گئی۔ کیوں کہ عملاً وہاں پنجابیوں کا غلبہ تھا۔ مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) کی حیثیت کامل آزاد قوم کی تھی۔ اس طرح برصغیر ہند کے مسلمانوں کو تین مختلف حیثیت میں رکھ کر آزمایا گیا۔ مگر تینوں کے تینوں اپنی آزمائش میں ناکام ہو گئے۔

بھارت کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے مقابلہ میں داعی بننا تھا۔ بنگلہ دیش کے مسلمانوں کو انصار مدینہ کی طرح اسلام کے عظیم تر مفاد کے لئے سیاسی ماتحتی کو قبول کرنا تھا۔ پاکستان کو حکومتی اختیار کو استعمال کرتے ہوئے ایک حقیقی مسلم معاشرہ بنانا تھا۔ مگر تینوں میں سے کوئی بھی اپنے ذمہ کا فرض ادا نہ کرسکا۔ تینوں کا کیس خدائی آزمائش میں ناکام ہو جانے کا کیس ہے نہ کہ خدائی آزمائش میں کامیاب ہونے کا کیس۔

یکم جولائی ۱۹۹۴

جس طرح حاکم ایک انتظامی لفظ ہے، اسی طرح خلیفہ بھی ایک انتظامی لفظ ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی اسلامی اصطلاح نہیں۔ لسان العرب میں خلافت کا مطلب امارت بتایا گیا ہے۔ اور خلیفہ کے معنی السلطان الاعظم بتائے گئے ہیں۔ (۸۴-۹/۸۳)

امتحان کی مصلحت کے تحت ہر آدمی کے لئے کچھ سامان حیات مقدر کیا گیا ہے۔ اسی طرح بعض وہ لوگ ہیں جن کا امتحان سیاسی اقتدار دے کر لیا جاتا ہے۔ ایسے افراد کو خلیفہ کہا گیا ہے۔ قرآن کے بیان کے مطابق، ایک کے بعد ایک مختلف قوموں کو صاحب اقتدار (خلیفہ) بنایا جاتا ہے۔ تاکہ اللہ دیکھے کہ اقتدار پاکر وہ کیسا عمل کرتے ہیں (یونس ۱۴)

مسلمانوں سے پہلے خلافت ارضی کا یہ مقام رومیوں اور ایرانیوں کو ملا ہوا تھا۔ اس کے بعد خلافت میں تبدیلی ہوئی اور مسلمانوں کو یہ مقام عطا کیا گیا۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد برطانیہ اور فرانس کو یہ حیثیت دے دی گئی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد دوبارہ اس میں تبدیلی ہوئی اور اب امریکہ کو خلافت ارضی کا درجہ حاصل ہے۔ یہ فطرت کا انتظام ہے یہ اسی طرح ہوتا رہے گا یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

کچھ مسلمانوں نے غلط تعبیر کرکے خلافت کو عقیدہ کا مسئلہ بنا دیا۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ خلافت ارضی مسلمانوں کا دائمی حق ہے۔ ان کی دینی ذمہ داری ہے کہ وہ سارے عالم کے خلیفہ بن کر خدا کے قانون کو خدا کی زمین پر نافذ کریں۔ یہ بلاشبہ ایک خود ساختہ نظریہ ہے۔ اس کا قرآن یا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ امام ابن تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے کہ یہ کہنا ناجائز ہے کہ انسان خدا کا خلیفہ ہے۔

۲ جولائی ۱۹۹۴

اس سال دہلی اور اس کے اطراف میں سخت ترین گرمی پڑی۔ درجۂ حرارت ۵۰ ڈگری تک پہنچ گیا۔ بہت سے لوگ گرمی کی شدت سے مرگئے۔ ہر طرف پریشانی کا عالم تھا۔ آج پہلی بار مانسونی بارش ہوئی۔ اور سارا ماحول اچانک بدل گیا۔ گرم لو کی جگہ ہوا کے ٹھنڈے جھونکے آنے لگے۔ دھوپ کی شدت کی جگہ خوشگوار موسم پیدا ہوگیا۔ پریشانی کے بجائے سکون کی کیفیت محسوس ہونے لگی۔

میں نے سوچا کہ ایسا ہی قیامت کے بعد ہوگا۔ موجودہ دنیا میں ہر طرف برائیوں کا طوفان جاری ہے۔ حساس اور بااصول انسان کے لئے اس دنیا میں ایک لمحہ کا سکون بھی حاصل نہیں۔ مگر جب اس دنیا کی عمر پوری ہوگی اور اللہ اور اس کے فرشتے براہ راست ظاہر ہوں گے ، اس وقت سارا ماحول اچانک تبدیل ہو جائے گا۔ زحمتوں کی دنیا ابدی طور پر رحمتوں کی دنیا بن جائے گی۔

۳ جولائی ۱۹۹۴

مولانا امیر اللہ خاں اور مولانا اکبر الدین قاسمی سے ملاقات ہوئی۔ آج وہ دونوں اور مولانا مصلح الدین صاحب دیوبند سے دہلی آنے کے لئے شالیمار ایکسپریس میں سوار ہوئے۔ یہ سکنڈ کلاس تھری ٹائر کی بوگی تھی۔ پوری بھری ہوئی تھی۔ دروازہ کے پاس کی سیٹ پر ایک بوڑھی ہندو خاتون پاؤں پھیلائے ہوئے بیٹھی تھی۔ اس نے تلخی کے انداز میں کہا کہ آگے جاؤ، آگے جاؤ۔ مولانا امیر اللہ قاسمی نے کہا : ماتا جی آگے بھی سب بھرا ہوا ہے۔

"ماتا جی" کا لفظ اس بوڑھی خاتون کے لئے جادو ثابت ہوا۔ اس کا موڈ بالکل بدل گیا۔ اس نے اپنے پاؤں سمیٹ لیے اور مولانا امیر اللہ خاں صاحب کو اپنے پاس جگہ بنا کر بٹھا لیا۔ اس کے بعد لوگوں سے کہہ کر ان کے بقیہ دو ساتھیوں کے لئے بھی جگہ نکالی اور اس طرح تینوں کو سیٹ پر بٹھا دیا۔ ان لوگوں کے ساتھ سامان بھی تھا۔ ان کے ایک ایک سامان کو بتا بتا کر صحیح طریقہ سے رکھوا دیا۔ دہلی تک وہ ان لوگوں کے ساتھ "مادر مہربان" بنی رہی۔ حالاں کہ یہ ہندو خاتون جموں سے آرہی تھی اور وہاں اس نے مسلمانوں کے مظالم ہندوؤں پر سن رکھے تھے۔

خود ٹرین میں بھی وہ سی آر پی کے ایک جوان سے کشمیر ہی کے بارہ میں گفت گو کر رہی تھی۔ ہندو خاتون کے اس مہربان رویہ سے پورے کیبن کی فضا بدل گئی۔ لوگ ان تینوں مسلمانوں کو وحشت کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ اب وہ ان کو ہمدردی کی نظر سے دیکھنے لگے۔

۴ جولائی ۱۹۹۴

ابن خلدون (۱۴۰۶ - ۱۳۳۲) نے لکھا ہے کہ بدوی اور وحشی قوموں میں شجاعت زیادہ ہوتی ہے، اس لئے وہ ان قوموں پر غالب آجاتی ہیں جو شہری زندگی گزارتی ہوں۔ کیوں کہ شہری نعمتوں میں ایک عرصہ تک رہنے سے ان میں کمزوری اور سستی آجاتی ہے۔ اس کو انھوں نے اپنی مخلوقات میں خدا کی سنت قرار دیا ہے۔ (مقدمہ ابن خلدون، صفحہ ۱۳۸ - ۳۹)

ابن خلدون کا زمانہ اب سے چھ سو سال پہلے کا زمانہ ہے۔ اس وقت عضویاتی طاقت ہی اصل طاقت تھی۔ مگر موجودہ زمانہ میں ابن خلدون کا یہ کلیہ رد ہو چکا ہے۔ اب دنیا جسمانی طاقت کے دور سے نکل کر ذہنی طاقت کے دور میں داخل ہو گئی ہے۔ اب مشین نے دستکاری کی جگہ لے لی ہے۔ اب دستی ہتھیاروں کے بجائے دور مار ہتھیاروں کا زمانہ آگیا ہے۔ ابن خلدون نے یہ بات مستقبل سے عدم واقفیت کی بنا پر کہی۔

قرآن جو خدا کا کلام ہے اس میں وحشت کے بجائے قوت کو اہمیت دی گئی ہے۔ جو چیز کسی دور میں قوت کی حامل ہو، وہ فیصلہ کن ہوگی۔

۵ جولائی ۱۹۹۴

ڈاکٹر عبدالحلیم عویس (قاہرہ) دہلی آئے۔ یہاں سے وہ لکھنؤ اور بنارس گئے۔ واپسی میں ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ کشمیر کے مسئلہ کے بارہ میں آپ مسلمانوں کے ساتھ نہیں ہیں بلکہ ہندو حکومت کے ساتھ ہیں۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ میں میں نہ ہندو کے ساتھ ہوں اور نہ مسلمان کے ساتھ۔ میں حقیقت پسندی کے ساتھ ہوں۔ اس وقت کشمیر کے مسلمان انڈیا کے خلاف جو لڑائی چھیڑے ہوئے ہیں، وہ حقیقت پسندی کے سراسر خلاف ہے۔ ہر حال میں اس کا انجام مسلمانوں کی یک طرفہ تباہی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس لئے میں اس کا ناقد ہوں میں

نہ کسی کا حامی ہوں اور نہ کسی کا مخالف ہوں۔ مگر یہ لڑائی چوں کہ سراسر بے دانشی کی لڑائی ہے اس لئے میں اس کی تائید نہیں کرتا۔

ہندستان کے مسلم دانشوروں نے ۱۹۴۷ سے پہلے پاکستان کے قیام کی تائید کی ، حالاں کہ پاکستان کے قیام کا سب سے بڑا نقصان انھیں ہندستانی مسلمانوں کو ملنے والا تھا۔ اب کشمیر کے معاملہ میں وہ دوبارہ یہی غلطی کر رہے ہیں۔ ہندستانی مسلمان عام طور پر کشمیر کی تحریک آزادی کے حامی ہیں۔ حالاں کہ کشمیر اگر انڈین یونین سے الگ ہو جائے تو اس کی نہایت بھاری قیمت ہندستانی مسلمانوں کو ادا کرنی پڑے گی۔ پاکستان کے قیام سے ہندستانی مسلمان اگر ۵۰ فیصد بے وزن ہو گئے تھے ، تو کشمیر کی علٰحدگی کے بعد وہ اس ملک میں سو فیصد بے وزن ہو جائیں گے۔

۶ جولائی ۱۹۹۴

۵ - ۶ جولائی کو میں شملہ میں تھا۔ وہاں مولانا ممتاز احمد قاسمی وغیرہ کو میرے بارہ میں سخت غلط فہمیاں تھیں۔ ۶ جولائی کی شام کو مسز سونیا گاندھی کی طرف سے وائسریگل لاج میں شاندار ڈنر تھا۔ میں اس کو چھوڑ کر شام کو مولانا ممتاز احمد صاحب کے یہاں چلا گیا۔ وہ ایک مسجد کے امام ہیں۔ ہماچل پردیش میں دینی سرگرمیوں کے لئے یہ مسجد مرکز کی حیثیت رکھتی ہے۔ مسجد سے متصل ایک مکان میں وہ اپنے بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔

مولانا قاسمی نے خواہش ظاہر کی کہ شام کا کھانا میں ان کے ساتھ کھاؤں۔ میں نے کہا کہ میں اس شرط پر کھاؤں گا کہ آج جو کچھ آپ کے یہاں پکا ہے ، بس وہی آپ مجھ کو کھلائیں۔ اس میں کسی بھی چیز کا اضافہ نہ کریں۔ اصرار کے بعد وہ راضی ہو گئے۔ مغرب کی نماز کے بعد بہت سے لوگ یہاں جمع ہو گئے۔ عشاء کی نماز کے بعد تک ان لوگوں سے باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے اپنی گاڑی واپس کر دی اور رات کو مسجد کے ایک کمرہ میں سو گیا۔

اگلے دن فجر کی نماز کے بعد مولانا قاسمی کے گھر سے صبح کی چائے آئی۔ میں نے کہا کہ آپ ناشتہ کے لئے کوئی اہتمام نہ کریں۔ شام کی پکی ہوئی روٹی لے آئیں۔ چائے کے ساتھ اس کو کھا لیا جائیگا اور بس یہی آج کا ناشتہ ہوگا۔ تعجب انگیز خوشی کے ساتھ انھوں نے اس کو قبول کر لیا۔ اس کے بعد ان کی غلط فہمیاں اپنے آپ دور ہو گئیں۔ میرے بارہ میں غائبانہ طور پر لوگ عجیب عجیب

غلط فہمیوں میں پڑ جاتے ہیں۔ مگر جب ساتھ ہوتا ہے تو محض ملاقات تمام غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے کافی ہو جاتی ہے۔

۷ جولائی ۱۹۹۴

دہلی کے ایک مسلمان اس سال حج کر کے آئے۔ انھوں نے زمزم اور کھجور کا تحفہ بھیجا۔ اس کے بعد ان سے ٹیلیفون پر بات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ جب سے واپس آیا ہوں، یہاں جی نہیں لگ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ دوبارہ وہیں مکہ مدینہ چلے جائیں۔ میں نے کہا کہ یہ کوئی صحت مند جذبہ نہیں ہے۔ ہمارے لئے نمونہ اصحاب رسول ہیں۔ انھوں نے ایسا نہیں کیا کہ مکہ اور مدینہ میں قیام کر کے بیٹھ جائیں۔ اس کے بجائے وہ لوگ عرب سے نکل کر دور دور کے ملکوں میں پھیل گئے۔ انھوں نے اسلام کی اشاعت کو اپنا مقصد بنایا نہ کہ مقامات مقدسہ میں قیام کو۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اسلام ساری دنیا میں دکھائی دیتا ہے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو اسلام آج صرف مکہ اور مدینہ میں سمٹا ہوا ہوتا۔

۸ جولائی ۱۹۹۴

الترمذی کی ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ سے اس کا فضل مانگو۔ کیوں کہ اللہ کو یہ پسند ہے کہ اس سے مانگا جائے۔ اور کشادگی کا انتظار کرنا افضل عبادت ہے۔ (وافضل العبادۃ انتظار الفرج) مشکاۃ المصابیح ۲/۶۹۴

ترمذی نے اس روایت کو 'غریب' لکھا ہے۔ مگر معنی کے اعتبار سے وہ مجھے بہت اہم معلوم ہوتی ہے۔ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ جو کچھ چاہتا ہے اس کو وہ فوراً حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور اگر اس کی مطلوب چیز فوراً اس کو نہ ملے تو وہ مایوس ہو جاتا ہے۔ یہ بہت بڑی بھول ہے۔ موجودہ دنیا میں واقعات معجزاتی طور پر ظاہر نہیں ہوتے بلکہ اسباب کے تحت ظہور میں آتے ہیں۔ اس لئے انتظار خود ایک مثبت پالیسی ہے۔ اگر آپ کے اوپر شام آگئی ہے تو آپ کے لئے صرف انتظار کافی ہے۔ اگر آپ پریشان ہوئے بغیر صرف انتظار کی پالیسی اختیار کر لیں تو مقرر وقت پورا ہونے کے بعد صبح کی روشنی اپنے آپ ظاہر ہو جائے گی یہی معاملہ تمام انفرادی اور اجتماعی مسائل کے لئے ہے۔

۹ جولائی ۱۹۹۴

انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا کو میں تقریباً تیس سال سے پڑھ رہا ہوں۔ مگر عجیب بات ہے کہ وہ خبر جو اس میں روز چھپتی ہے اور وہ صفحہ اول کی سب سے پہلی خبر ہوتی ہے، اسی سے میں بے خبر تھا۔ یہ اخبار ۱۸۳۸ میں جاری ہوا۔ اسی وقت سے اس کے پہلے صفحہ کی پیشانی پر ایک مونوگرام چھپتا ہے۔ اس مونوگرام میں آرٹ کے انداز میں باریک خط میں یہ لکھا ہوا ہے کہ سچائی باقی رہتی ہے:

Let truth prevail.

مولانا انیس لقمان ندوی نے بتایا تو میں نے اس کو دیکھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کا مشاہدہ کتنا زیادہ ناقص ہے۔ انسان دیکھتا ہے مگر وہ نہیں دیکھتا، وہ سنتا ہے مگر نہیں سنتا۔

۱۰ جولائی ۱۹۹۴

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۱۴ محرم ۱۴۱۵ھ، ۲۳ جون ۱۹۹۴) میں ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے: ھٰکذا اسلمنا (اس طرح ہم نے اسلام قبول کیا)۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ سعودی عرب میں اس وقت ۲۶ ایسے ادارے ہیں جن کا یہ کام ہے کہ سعودیہ میں روزگار کے لئے آنے والے غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہنچائیں۔ اس کوشش کے نتیجہ میں کثرت سے لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ مذکورہ رپورٹ میں اسی قسم کے کچھ نو مسلموں کا انٹرویو شائع کیا گیا ہے۔ یہ سب فلپائن کے لوگ ہیں۔

عرب ملکوں میں فلپائن کے لوگ کثرت سے ہیں۔ یہ لوگ تلاش معاش کے سلسلہ میں یہاں آئے ہیں۔ فلپینی بہت سادہ مزاج ہوتے ہیں۔ چنانچہ عرب اخباروں میں اکثر ان کے اسلام کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ اسی فلپائن میں پچھلے ۳۰ سال سے پاکستان کے انداز کی تقسیمی تحریک چل رہی ہے۔ فلپائن کے ایک حصہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ چنانچہ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ مسلم اکثریت کے اس حصہ کو کاٹ کر الگ ملک بنائیں۔ دعوت کے راستہ سے وہ پورے ملک کو اسلامی ملک بنا سکتے ہیں۔ مگر اس طرف انھیں کوئی توجہ نہیں۔ وہ صرف جغرافی

تقسیم کو جانتے ہیں چنانچہ ۳۰ سال سے وہ سیاست کی چٹان پر سر پٹک رہے ہیں۔ اور اب تک تباہی کے سوا کوئی اور تحفہ وہ ملک کو نہ دے سکے۔

۱۱ جولائی ۱۹۹۴

ہمارے ایک رشتہ دار مع اہلیہ اسی سال حج کر کے آئے ہیں۔ واپسی میں وہ ایک دن ہمارے یہاں ٹھہرے۔ ان کے ساتھ پلاسٹک کے دو خوبصورت ڈرم میں زمزم بھی تھا۔ یہ ایک نئی چیز تھی۔ چنانچہ میری لڑکی نے ان کی اہلیہ سے پوچھا کہ یہ آپ کو کہاں سے ملا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ یہیں دہلی ایرپورٹ پر۔ لڑکی نے دوبارہ پوچھا کہ کس نے یہاں دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کتے نے دیا ہے۔ لڑکی نے پوچھا کہ کون۔ خاتون نے کہا کہ ہم اس کا نام نہیں لیں گے۔ وہی جس نے مسجد تڑوائی ہے۔ میری لڑکی نے پوچھا، کیا نرسمہاراؤ (وزیر اعظم ہندستان) خاتون نے کہا کہ ہاں۔

زمزم کے یہ دونوں ڈبے انھیں مکہ یا جدہ میں نہیں ملے تھے۔ وہ جب دہلی ایرپورٹ پر اترے تو یہاں ایرپورٹ پر انھیں یہ ڈبے دئے گئے۔ دونوں پر بڑا بڑا اسٹیکر لگا ہوا تھا جس پر لکھا ہوا تھا:

ZAM ZAM
with compliments from
European Airlines

مذکورہ خاتون نے اس اسٹکر کو نہیں پڑھا۔ چوں کہ یہ دونوں ڈرم انھیں دہلی ایرپورٹ پر ملے تھے اس لئے انھوں نے فرض کر لیا کہ یہ وزیر اعظم نرسمہاراؤ کی طرف سے دئے گئے ہیں۔ میں نے اس قصہ کو سنا تو میں نے کہا کہ جو لوگ اپنے ہاتھ کی چیز کے بارہ میں صحیح رائے قائم نہ کر سکیں ان سے کیوں کر یہ امید کی جا سکتی ہے کہ "دور" اجودھیا" کی چیز کے بارہ میں صحیح رائے قائم کر سکیں گے۔

۱۲ جولائی ۱۹۹۴

مکّہ سے نکلنے والے ہفت روزہ عربی اخبار العالم الاسلامی کا شمارہ ۲ مئی ۱۹۹۴ میرے سامنے ہے۔ اس کے صفحہ اول کی پہلی آٹھ کالمی سرخی یہ ہے: حظر الاسلحة على البوسنة ليس عادلا و يتعارض مع ميثاق الامم المتحدة۔ یعنی اقوام متحدہ کی طرف

سے بوسنیا میں ہتھیار لانے پر پابندی غیر منصفانہ ہے اور وہ اقوام متحدہ کے چارٹر کے خلاف ہے۔

تمام دنیا کے مسلم اخباروں میں اس طرح کے بیانات کو نمایاں کرکے چھاپا جاتا ہے۔ اس کے برعکس تعمیری اور اصلاحی باتوں کو اگر جگہ ملتی ہے تو صرف اندر کے غیر اہم کالموں میں۔ مثلاً اگر میں ایک مضمون لکھوں جس میں بتایا گیا ہو کہ اغیار کے ہتھیاروں پر جنگ نہیں لڑی جاتی۔ اگر آپ کو لڑنا ہے تو جنگ روک کر پہلے ہتھیار تیار کیجئے اور جب آپ ہتھیار میں خود کفیل ہو جائیں اس کے بعد جنگ چھیڑیئے۔ اگر میں اس قسم کا مضمون اخبار میں بھیجوں تو یا تو وہ چھپے گا نہیں، اور اگر چھپے گا تو کسی غیر نمایاں کالم میں۔ جس کا کوئی فائدہ نہیں۔

یہ میرے نزدیک سطحی صحافت ہے۔ اس قسم کی صحافت صرف کچھ احتجاجی اوراق وجود میں لاسکتی ہے اور حقائق کی اس دنیا میں احتجاجی کاغذات کی کوئی قیمت نہیں۔

۱۲ جولائی ۱۹۹۴

بنارس کی جامعہ سلفیہ کی طرف سے ایک عربی ماہنامہ شائع ہوتا ہے۔ اس کا نام صوت الامۃ ہے۔ اس کے ٹائٹل پر یہ الفاظ لکھے رہتے ہیں ـــــ دعوتنا عودۃ الی الکتاب والسنۃ۔ اس ماہنامہ کا شمارہ جون ۱۹۹۴ میرے سامنے ہے۔ اس کے آخری صفحہ پر جامعہ سلفیہ کی ایک تازہ عربی کتاب کا اشتہار ہے۔ اس کے مصنف ایک سلفی عالم دکتور محمد تقی الدین الھلالی الحسینی ہیں۔ اس کتاب کا نام یہ ہے:

الحسام الماحق لکل مشرك ومنافق

یعنی ہر مشرک اور منافق کو مٹانے والی تلوار۔ مجھے یہ نام نہایت مکروہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ انداز نہ کلام رسول کا تھا اور نہ صحابہ کرام کا اور تابعین اور تبع تابعین کا۔ سلفی حضرات کتاب وسنت کی طرف واپسی کی بات کرتے ہیں مگر اس واپسی سے ان کی مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ بعض جزئی اور خارجی امور میں غیر تقلیدی مسلک اختیار کیا جائے۔ حالاں کہ کتاب وسنت کی طرف واپسی کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ تقویٰ اور تواضع کا مسلک اختیار کیا جائے جو دور اول کے اہل ایمان کا شیوہ تھا۔ کسی بھی معاملہ میں صحیح اور غلط کو جاننے کا اصل معیار رسول اللہ اور اصحاب رسول ہیں نہ کہ کوئی اور معیار۔

۱۴ جولائی ۱۹۹۴

مسلمان وہ ہے جو آخرت کے اندیشہ میں جیتا ہو۔ میرا اندازہ ہے کہ موجودہ مسلمانوں میں عوام کا جو طبقہ ہے ان کے یہاں تو شاید کچھ آخرت کا اندیشہ پایا جاتا ہو۔ مگر وہ مسلمان جو کسی اسلامی جماعت یا کسی اسلامی ادارہ سے وابستہ ہیں، وہ اندیشۂ آخرت سے بالکل خالی ہے۔ یہ لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی آخرت کی کامیابی بالکل یقینی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان میں سے ہر شخص کی جیب میں جنت کا ریزرویشن کارڈ موجود ہے۔ موت کے بعد اس کارڈ کو دکھاتے ہی اس کے لئے جنت کے تمام دروازے کھول دئے جائیں گے تاکہ وہ جس دروازہ سے چاہے جنت میں داخل ہو جائے۔

اس قسم کا یقین بلاشبہ منافقت کی پہچان ہے نہ کہ اخلاص کی پہچان۔

۱۵ جولائی ۱۹۹۴

نئی دہلی میں لالہ لاجپت بھون کے صدر مسٹر ستیہ پال (Tel. 6434595) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ اس سے پہلے وہ فیروز پور (پنجاب) میں رہتے تھے۔ وہاں وہ لالہ لاجپت رائے کالج کے سکریٹری تھے۔ جون ۱۹۶۸ میں انھوں نے کالج کے پرنسپل کو ڈسمس کر دیا۔ کیوں کہ اس پر کرپشن کا الزام تھا۔ اس کے بعد اس نے ایک سو سے اوپر طالب علموں کو ورغلا کر ایک ہجوم اکٹھا کیا۔ وہ اشتعال کی حالت میں کالج کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ اس طرح نعرہ لگا رہے تھے: دھکا شاہی نہیں چلے گی، نہیں چلے گی نہیں چلے گی۔

ڈی آئی جی (پولیس) مسٹر ستیہ پال کے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ پولیس فورس کو استعمال کر کے اس مشتعل مجمع کو راستہ میں روک دیں۔ مسٹر ستیہ پال نے پولیس کو سختی سے منع کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ میرے بچے ہیں، ان کو آنے دیجئے۔ ان کے راستہ میں سڑک پر کہیں پولیس دکھائی نہ دے، ورنہ وہ اور زیادہ مشتعل ہو جائیں گے۔

مسٹر ستیہ پال نے کالج میں ٹھنڈے پانی کا انتظام کیا اور طلبہ کے مجمع کا انتظار کرنے لگے۔ جب وہ مجمع کالج کے پاس آ گیا تو کالج والوں نے چاہا کہ اس کا گیٹ نہ کھولا جائے۔ مگر مسٹر ستیہ پال نے ان کے آتے ہی کالج کا گیٹ کھول دیا۔ انھوں نے لڑکوں سے کہا کہ ہم آپ کا

سواگت کرتے ہیں۔ یہ جون کا مہینہ تھا۔ لڑکوں کا پیاس سے برا حال ہو رہا تھا۔ انھوں نے فوراً ان کو ٹھنڈا پانی پلانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد لڑکوں کا اشتعال ختم ہو گیا۔ جو لوگ توڑ پھوڑ کے ارادہ سے آئے تھے، وہ صرف اس پر راضی ہو کر چلے گئے کہ ایک کمیٹی بنائی جائے جو پرنسپل کے معاملہ کی جانچ کر کے اپنی رپورٹ پیش کرے۔

۱۶ جولائی ۱۹۹۴

ڈاکٹر عبد الحلیم عویس جولائی کے پہلے ہفتہ میں دہلی آئے۔ ایک ملاقات میں افغانی مجاہدین پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا: اتحدوا وقت المغرم وتفرقوا وقت المغنم۔ وہ بار اٹھانے کے وقت متحد ہوئے اور غنیمت لینے کے وقت متفرق ہو گئے۔ اسی بات کو دہلی کے ایک اردو ہفت روزہ ملی اتحاد (۱۶ - ۳۱ جولائی ۱۹۹۴) نے ان لفظوں میں لکھا ہے کہ ـــــ افغانستان میں کل کے مجاہدین آج اقتدار کے بھوکے جنگ باز۔

یہ ایک بے معنی تبصرہ ہے۔ کسی بھی تحریک کی پہلی نسل میں کبھی اس قسم کی تبدیلی نہیں آتی۔ اگر بظاہر تبدیلی دکھائی دے تو سمجھنا چاہئے کہ پہلے بھی وہ ویسے ہی تھے جیسا کہ آج وہ نظر آ رہے ہیں۔ ۱۹۸۹ سے ۱۹۹۲ تک افغانی جنگجوؤں نے امریکہ کی مدد سے سوویت یونین کے خلاف جو لڑائی لڑی وہ محض ایک قومی جنگ تھی نہ کہ اسلامی جہاد۔ قومی جنگ کا نتیجہ ہمیشہ وہی ہوتا ہے جو افغانستان میں نظر آ رہا ہے۔ اگر وہ اسلامی جہاد ہوتا تو تمام لیڈر سیاسی عہدوں سے بھاگتے۔ پھر لڑائی کس بات پر ہوتی۔

۱۹۹۲ میں جب کمیونسٹوں کا زوال ہوا اس وقت تیرہ سالہ جنگ کے باوجود کابل محفوظ تھا۔ یہ میں نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ مگر آج جب افغانستان افغانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ کابل کی بیشتر عمارتیں جزئی یا کلی طور پر تباہ ہو چکی ہیں۔ بے شمار لوگ شہر چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔

۱۷ جولائی ۱۹۹۴

مسٹر سید علی احمد انگریزی ہفت روزہ ریڈئنس میں اسٹاف رپورٹر ہیں۔ وہ

انٹرویو کے لئے آئے۔ ان کا ایک سوال یہ تھا کہ آپ سید احمد شہید بریلوی پر تنقید کرتے ہیں۔ حالانکہ پوری ملت ان کو قابل احترام سمجھتی ہے۔ میں نے کہا کہ میں تنقید نہیں کرتا۔ بلکہ ان کے درجہ اور احترام میں اضافہ کر رہا ہوں۔

سید احمد شہید بریلوی کے ساتھ ہزاروں مسلمان تھے۔ یہ سب نہایت صالح اور باکردار لوگ تھے۔ ان کی تحریک سے بے شمار مسلمانوں کی اصلاح ہوئی اور بہت سے ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔ میرا کہنا ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ سے بے فائدہ طور پر لڑ کر انھوں نے اپنا خاتمہ کر لیا۔ حالانکہ ان کے لئے زیادہ بہتر یہ تھا کہ وہ اپنے اصلاحی اور دعوتی کام کو جاری رکھتے۔ عین ممکن تھا کہ ان کی کوشش سے مزید لاکھوں مسلمانوں کی اصلاح ہوتی۔ اور مزید لاکھوں غیر مسلم اسلام میں داخل ہو جاتے۔ یہ عمل اگر جاری رہتا تو عین ممکن تھا کہ ہندستان کا نقشہ ہی بالکل بدل جائے۔ مگر ان کے جنگی اقدام کی بنا پر یہ تمام امکانات غیر استعمال شدہ حالت میں رہ گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں ہر قسم کے شدید حالات پیش آئے۔ مگر آپ نے ٹکراؤ سے اعراض کیا۔ اور اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ کو چھوڑ کر مدینہ چلے گئے۔ اگر آپ اپنے اصحاب کو جنگ پر اکساتے تو عین ممکن تھا کہ مکہ شہادت گاہ بن جاتا اور اسلام کی وہ تاریخ بننے سے رہ جاتی جو ہجرت کے بعد بنی۔

۱۸ جولائی ۱۹۹۴

شفیع الدین صاحب ایک گزیٹڈ افسر ہیں اور نئی دہلی میں رہتے ہیں۔ ان کا ٹیلیفون آیا کہ وہ اپنے ایک مسلمان ساتھی کے ہمراہ اتوار (۱۷ جولائی) کو ملاقات کے لئے آئیں گے۔ دونوں کو کچھ اسلامی موضوعات پر گفت گو کرنا ہے۔ حسب وعدہ جناب شفیع الدین صاحب شام کو ۴ بجے آئے۔ مگر وہ اکیلے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے ساتھی صاحب کے ٹی وی سیٹ میں ریپیئر کی ضرورت تھی۔ مکینک نے کہا کہ آج ۴ بجے وہ ان کے گھر پر آئے گا۔ اس لئے وہ اس کے انتظار میں رک گئے اور یہاں نہ آسکے۔

یہ مسلمان صاحب خود میرے بھی ملاقاتی ہیں۔ اس سال ہائی اسکول کے امتحان

میں ان کے لڑکے کا میتھمیٹکس کا پیپر خراب ہوگیا۔ وہ اپنے لڑکے کو میرے پاس لے آئے اور کہا کہ یہ لڑکا ٹی وی بہت دیکھتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کا پیپر خراب ہو گیا۔ اس کو سمجھائیے اور اس کے لئے دعا کیجئے۔ چنانچہ میں نے سمجھایا اور دعا بھی کی۔ مگر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے بچے جو عام طور پر بگڑ رہے ہیں اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ گھروں میں تربیت کے لئے موافق فضا نہیں۔ گھروں میں جب یہ حالت ہو کہ والدین ٹی وی کی خاطر ایک دینی پروگرام چھوڑ دیں تو گھر کے اندر جو ماحول بنے گا وہ یہی ہوگا کہ سب سے اہم چیز ٹی وی ہے۔ جب والدین ٹی وی کی خاطر دینی پروگرام چھوڑ دیں تو بچے سوچیں گے کہ ہم بھی ٹی وی کی خاطر تعلیمی پروگرام کو چھوڑ سکتے ہیں۔ اس صورت حال میں سمجھانے یا دعا کرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

بچوں کی تربیت کے لئے سب سے زیادہ اہمیت گھر کی فضا کی ہے۔ گھر کی فضا اگر موافق نہ ہو تو کوئی اور چیز بچوں کی تربیت کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

۱۹ جولائی ۱۹۹۴

ابن قیم الجوزیہ (۶۹۱-۷۵۱ ھ) کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے: طریق الہجرتین وباب السعادتین۔ شام کے ایک صاحب نے مجھے اس کا ۱۹۹۳ء کا چھپا ہوا نسخہ دیا۔ ۴۴۴ صفحہ پر مشتمل یہ نسخہ نہایت عمدہ چھپا ہوا ہے۔

اس میں صبر پر لمبی بحث ہے جو اس کے صفحہ ۲۷۰ سے شروع ہو کر کئی صفحات تک چلی گئی ہے۔ اس کو پورا میں نے پڑھا، اس میں معصیت پر صبر، طاعت پر صبر، بلاء پر صبر پر تفصیلی کلام ہے۔ مگر اہم ترین صبر کا اس میں کوئی ذکر نہیں۔ اور وہ داعیانہ صبر ہے۔

کسی قوم کے درمیان دعوت کا عمل جاری کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ زیادتیوں پر یک طرفہ صبر کیا جائے۔ مدعو کی زیادتیوں پر صبر کے بغیر اس کے داعی اور مدعو والا تعلق قائم نہیں ہوتا۔ اور نہ دعوت کے حق میں موافق فضا بنتی۔ اس لئے داعی کے لئے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ مدعو کی تمام قولی یا عملی زیادتیوں کو یک طرفہ طور پر ختم کر دے تاکہ دونوں کے درمیان وہ معتدل فضا قائم ہو سکے جو دعوتی عمل کی انجام دہی کے لئے ضروری ہے۔ طریق الہجرتین میں صبر کی

اس اہم ترین قسم کا کوئی ذکر نہیں۔

۲۰ جولائی ۱۹۹۴

آج میری لڑکی ڈاکٹر فریدہ خانم کا جامعہ ملیہ (اسلامک اسٹڈیز) میں انٹرویو تھا۔ لکچرر شپ کی ایک پوسٹ تھی اور بہت سے امیدوار۔ پورا ڈپارٹمنٹ اس حد تک مخالفت پر تلا ہوا تھا کہ بظاہر حالات ایک فیصد امکان نہیں تھا کہ فریدہ کا انتخاب ہو سکے۔ مگر فریدہ نے بہت زیادہ دعا کی اور حیرت انگیز طور پر اس کا سلکشن ہو گیا۔ موجودہ حالات میں یہ معجزہ سے کم نہیں۔ اور یہ معجزہ تمام تر دعا کے ذریعہ پیش آیا۔

جناب رحمان نیر صاحب اس سلسلہ میں پروفیسر اختر الواسع صاحب سے ملے تھے۔ رحمٰن نیر صاحب کی روایت کے مطابق انھوں نے جو جواب دیا وہ یہ تھا: فریدہ صاحبہ سے کہہ دیجئے کہ ان کو انٹرویو میں آنے کی ضرورت نہیں۔ بلاوجہ embarassment ہوگا۔ جس کو لینا ہوتا ہے وہ پہلے ہی سے طے ہو جاتا ہے۔

۲۱ جولائی ۱۹۹۴

صدر بازار کے ایک مسلمان ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے کہا کہ مدرسہ سبحانیہ کے مولانا عبدالغفار صاحب نے مجھ کو آپ کے پاس بھیجا ہے۔ میرے کچھ سوالات ہیں۔ انھوں نے مجھ کو بتایا کہ آپ ہی میرے سوالات کا تشفی بخش جواب دے سکتے ہیں۔ انھوں نے کچھ سوالات بتائے ان میں سے ایک سوال یہ تھا کہ مسلمان ساری دنیا میں ذلیل کئے جا رہے ہیں۔ تمام قومیں مسلمانوں پر ظلم کر رہی ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے۔

میں نے کہا کہ پہلے یہ طے کر لیجئے کہ آپ اپنے سوالات کا جواب قرآن سے چاہتے ہیں یا اپنی عقل سے۔ انھوں نے فوراً کہا کہ قرآن سے، قرآن کے لئے تو ہم اپنی جان بھی قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔ میں نے کہا کہ جان قربان کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ ضرورت ہے کہ قرآن کے آگے آپ اپنی عقل کو جھکانے کے لئے تیار ہوں۔ انھوں نے کہا کہ اس سے کس مسلمان کو انکار ہو سکتا ہے۔

میں نے کہا کہ پھر آپ اپنے سوال کا جواب اس آیت کی روشنی میں معلوم کیجئے:

وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم - اس آیت کے مطابق ، ہر مصیبت خود اپنے کئے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں آپ کو ماننا چاہئے کہ مسلمانوں کا کیس ظلم کا کیس نہیں ہے بلکہ خود اپنی کوتاہی کا کیس ہے۔ وہ فوراً بولے تو کیا مسلمان یہ سمجھ کر مار کھاتے رہیں کہ یہ ہماری بداعمالی کا نتیجہ ہے۔

میں نے کہا کہ آپ قرآن کی خاطر جان دینے کے لئے تیار تھے، مگر اپنی عقل کو آپ نے قرآن کے تابع نہیں کیا۔ اور جب آپ اپنی عقل کو قرآن کے تابع نہ کریں تو قرآن کا بتایا ہوا حل بھی آپ کی سمجھ میں نہیں آسکے گا۔

۲۲ جولائی ۱۹۹۴

موجودہ زمانہ برائی اور ظلم اتنا زیادہ بڑھ چکا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دنیا آخر کیوں قائم ہے۔ بظاہر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسانوں نے اپنی بڑھی ہوئی سرکشی کے ذریعہ زمین پر اپنے وجود کا استحقاق کھو دیا ہے۔ ایک صاحب سے اس موضوع پر بات کرتے ہوئے میں نے کہا: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت کا کوٹہ ابھی پورا نہیں ہوا۔ جنت میں بسانے کے لئے اللہ تعالی کو جتنے آدمی درکار ہیں ان کی تعداد شاید ابھی پوری نہیں ہوئی اس لئے دنیا چلی جارہی ہے۔ کیوں کہ ظاہر حالات کو دیکھ کر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید صدیاں گزر جاتی ہوں گی تب خدا کو چند آدمی ایسے حاصل ہوتے ہوں گے جو جنت کی نفیس ولطیف دنیا میں بسائے جانے کے قابل ہوں۔

۲۳ جولائی ۱۹۹۴

مشکاۃ المصابیح جزء ثالث میں ایک مفصل ضمیمہ ہے جس کا عنوان ہے : اجوبۃ الحافظ ابن حجر العسقلانی عن احادیث المصابیح۔ اس میں صفحہ ۱۷۷۵ سے ۱۷۸۲ تک صلاۃ التسبیح کی روایت پر بحث ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ بہت سے محدث مثلاً ابن الجوزی نے صلاۃ التسبیح کی حدیث کو موضوع بتایا ہے۔ اور کچھ محدثین مثلاً الحاکم نے اس کی تصحیح کی ہے۔

یہ اختلاف اس لئے پیش آیا کہ اکثر محدثین نے فضائل کی روایات میں تساہل کا طریقہ

اختیار کیا۔ اور معاملات والی حدیثوں میں تشدد کا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تفریق، ایک بدعت تھی۔ جب رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے کسی تخصیص اور استثناء کے بغیر یہ حکم دیا کہ آپ سے روایت کرنے میں انتہائی احتیاط برتی جائے تو محدثین پر لازم تھا کہ دونوں قسم کی روایتوں میں وہ یکساں طور پر تشدد کا طریقہ اختیار کریں۔

۲۴ جولائی ۱۹۹۴

جنوبی دہلی میں ایک مقام چاندنی ہول ہے۔ یہاں لوگوں کے بڑے بڑے فارم ہاؤس ہیں۔ اسی کے درمیان ایک ٹوٹی پھوٹی مسجد تھی۔ مولوی طلحہ صاحب یہاں آکر بیٹھ گئے۔ طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے وہ یہاں مسجد اور مدرسہ کی تعمیر میں لگے ہوئے ہیں۔ اسی طرح دہلی میں درجنوں کی تعداد میں مسجد اور مدرسے قائم ہوئے ہیں۔ کوئی مولوی صاحب آکر کھنڈروں میں بیٹھ گئے۔ پولیس والوں اور مختلف عناصر کا مقابلہ کرتے ہوئے جمے رہے۔ یہاں تک کہ اب وہاں شاندار مسجد اور مدرسہ کی صورت میں ایک مرکز قائم ہوگیا۔ اسی طرح انشاء اللہ چند برسوں کے بعد چاندنی ہول کا یہ مقام بھی ترقی کر جائے گا۔

اس مدرسہ کا نام مدرسہ فیض القرآن ہے۔ آج اس کا پہلا سالانہ جلسہ تھا۔ میں نے اس میں شرکت کی۔ وہاں کچھ لوگوں سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ۱۹۴۷ کے بعد دہلی اور اس کے اطراف میں دینی و ملی کام کرنے کے لئے یہی مقام آغاز تھا۔ ہر چیز ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ اغیار اس پر قابض ہو چکے تھے۔ اسی ٹوٹے ہوئے کھنڈر سے نیا اسٹارٹ لینا تھا۔ یہ کام ہمارے "اکابر" نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ اکابر تقریروں میں مشغول رہے۔ اور اصاغر نے ان مقامات پر بیٹھ کر نئے دور کا آغاز کیا۔ ۱۹۴۷ کے بعد تعمیر نو کا کام سب سے زیادہ انھیں اصاغر نے انجام دیا ہے۔

۲۵ جولائی ۱۹۹۴

ہمارے یہاں بہار کا ایک لڑکا کام کرتا ہے۔ اس کا نام محفوظ ہے۔ پڑوس میں ایک اور بہاری لڑکا دوسرے گھر میں ملازم ہے، اس کا نام خورشید ہے۔ خورشید اپنے گھر جانے کے لیے ۲۲ جولائی کی رات کو ریلوے اسٹیشن گیا۔ اس کے ساتھ محفوظ بھی تھا۔ وہاں پلیٹ فارم پر دو آدمی

آئے۔ انھوں نے کہاکہ بھائی صاحب، آپ کہاں جارہے ہیں۔ خورشید نے کہاکہ کیٹھار۔ انھوں نے کہاکہ ہم بھی کیٹھار چل رہے ہیں۔ اس کے بعد دوستی کی باتیں کرتے رہے۔ آخر میں اس نے اپنے ساتھی سے چائے لانے کے لئے کہا۔ وہ چائے لایا اور خورشید اور محفوظ کو پلایا۔ چائے پینے کے بعد دونوں بے ہوش ہوگئے۔ اس کے بعد دونوں کو لوٹ لیا۔ خورشید دوسال کی کمائی کے بعد گھر جارہا تھا۔ اس کے پاس پانچ ہزار روپیہ اور تقریباً اتنے ہی کا سامان تھا۔ نئی گھڑی تھی۔ ایک ایک چیز لے کر دونوں بھاگ گئے۔

خورشید اور محفوظ گھنٹوں بے ہوش پڑے رہے۔ اٹھے تب بھی نیم بے ہوش تھے۔ ان کے پاس نہ کھانے کے لئے پیسہ تھا اور نہ واپسی کے لئے بس کا کرایہ۔ نیم بے ہوشی کی حالت میں دونوں اِدھر اُدھر سڑکوں پر گھومتے رہے۔ یہاں تک ۲۴ گھنٹہ کے بعد دوبارہ ہمارے یہاں واپس آئے۔

میں نے اس قصہ کو سنا تو میں نے کہاکہ ہمارے اخبارات اور ہمارے لیڈر یہی کام زیادہ بڑے پیمانے پر کررہے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو جذباتیت کی شراب پلاتے ہیں، اور جب وہ مدہوش ہوجاتے ہیں تو ان کو آخری حد تک لوٹ لیتے ہیں۔

۲۶ جولائی ۱۹۹۴

لاہور کے اخبار نوائے وقت کا ہفتہ وار اڈیشن (فرائڈے میگزین) میرے سامنے ہے۔ اس پر تاریخ ۲۲ جولائی ۱۹۹۴ چھپی ہوئی ہے۔ اس میں "وزیر اعظم آزاد کشمیر" سردار عبدالقیوم خاں کا خصوصی انٹرویو چھپا ہے۔ انٹرویو کا ایک سوال یہ تھاکہ تحریک آزادی کشمیر پر افغانی جہاد کے اثرات کیا پڑے۔ سردار عبدالقیوم خاں نے جواب دیا: "میرے خیال میں جہاد افغانستان کے اثرات تحریک کشمیر پر منفی مترتب ہوئے۔ منفی اس لئے کہ اس کا کوئی مثبت نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ کیوں کہ افغانستان کے اندرونی حالات ٹھیک نہیں۔

سردار عبدالقیوم خاں کا یہ جواب ادھورا ہے۔ انھیں کہنا چاہئے تھاکہ افغانستانی جہاد کا جو انجام سامنے آیا ہے اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہم سب لوگ اندھیرے میں تیر چلارہے ہیں۔ یہ نہ جہاد ہے اور نہ اسلامی تحریک۔ یہ تو صرف ایک احمقانہ اقدام ہے جس کا نتیجہ

تباہی کے سوا اور کچھ نہیں۔

۲۷ جولائی ۱۹۹۴

پاکستانی اخبار نوائے وقت (۲۲ جولائی ۱۹۹۴) میں ہے کہ جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ (JKLF) کے رہنما مسٹر یاسین ملک نے رہائی کے بعد کہا کہ "ہم نے ہتھیار دنیا کو متوجہ کرنے کے لئے اٹھائے تھے۔ اب مذاکرات کی ضرورت ہے"۔ (فرائڈے میگزین، صفحہ ۴)

یہ سراسر ایک طفلانہ بات ہے۔ کیوں کہ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ مسلح ٹکراؤ کی تحریک پہلے چلا دو، اور اس کے بعد ہتھیار الگ رکھ کر بات چیت کی میز پر بیٹھ جاؤ۔ مگر عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ کے تمام مسلم مصلحین اسی قسم کی طفلانہ سوچ میں مبتلا رہے ہیں۔ پہلے انگریزوں کو نکال لو، اس کے بعد مقامی اکثریت سے نمٹ لینا (ہندستان) پہلے بادشاہ کا خاتمہ کردو اس کے بعد داخلی فوج سے معاملہ طے کرلینا۔ (مصر) پہلے ملک بانٹ کر ایک علیحدہ خطہ حاصل کرلو، اس کے بعد بقیہ حالات درست کرلینا (پاکستان) وغیرہ۔

اس قسم کی تقدیم وتاخیر صرف الفاظ کی دنیا میں پائی جاتی ہے۔ وہ حقیقت کی دنیا میں اپنا کوئی وجود نہیں رکھتی۔ حقیقت کی دنیا میں صرف ایک ترتیب ہے۔ وہ یہ کہ پہلے انسان حاصل کرو، اس کے بعد بقیہ مسائل کے حل کے راستے اپنے آپ کھل جائیں گے۔

۲۸ جولائی ۱۹۹۴

خلیفہ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس حضرت ابوعبیدہ کا خط آیا۔ اس میں درج تھا کہ رومی ہمارے مقابلہ میں بہت بڑی طاقت جمع کررہے ہیں۔ حضرت عمر نے انھیں لکھا کہ جب بھی بندۂ مومن پر کوئی سختی کی کیفیت گزرتی ہے تو اللہ اس کے بعد کشادگی پیدا کرتا ہے۔ اور یہ کہ ایک مشکل کبھی دو آسانی پر غالب نہیں آسکتی (فانه مهما نزل بعبد مؤمن منزلة شدة يجعل الله بعدها فرجا وانه لن يغلب عسر يسرين)

تفسیر طبری ۴/۲۲۱

۲۹ جولائی ۱۹۹۴

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صبر کے ساتھ کشادگی کا

انتظار کرنا بھی عبادت ہے (انتظار الفرج بالصبر عبادۃ (تفسیر قرطبی ۴/۳۲۲

۳۰ جولائی ۱۹۹۴

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کا حال یہ ہے کہ غریب ملکوں میں سیاسی نظام کے خلاف پرشور تقریریں کرکے لیڈری حاصل کرتے ہیں، اور دولت مند ملکوں میں وہاں کے سیاسی نظام سے موافقت کرکے پٹرو ڈالر حاصل کر رہے ہیں ــــ نام نہاد مسلم رہنماؤں کے بعض واقعات سننے کے بعد میں نے ایک صاحب سے یہ بات کہی۔

۳۱ جولائی ۱۹۹۴

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا کہ ہندستان کی تقسیم در اصل جواہر لال نہرو نے کروائی۔ نہرو کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر ملک کی تقسیم نہ ہوئی تو وہ وزیر اعظم کا عہدہ حاصل نہ کر سکیں گے۔ غیر منقسم ہندستان کے وزیر اعظم یا تو مسٹر محمد علی جناح ہوں گے یا مولانا ابوالکلام آزاد۔

یہ بات ناقابل فہم حد تک سادہ لوحی کی بات ہے۔ غیر منقسم ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ ۲۵ فیصد ہوتی۔ مسٹر جناح یقینی طور پر صرف اقلیت کے لیڈر تھے۔ پارلی منٹ میں ان کے حامی اگر اپنی ساری ممکن سیٹ حاصل کر لیتے تب بھی وہ صرف چوتھائی سیٹوں کے مالک ہوتے۔ ظاہر ہے کہ چوتھائی سیٹوں کی بنا پر کوئی شخص ملک کا وزیر اعظم نہیں بن سکتا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے لئے بھی وزیر اعظم بننے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اقلیتی فرقہ سے تعلق رکھنے کے علاوہ وہ انگریزی میں بولنے پر قادر نہ تھے اور موجودہ حالات میں ناممکن تھا کہ کوئی غیر انگریزی داں آدمی ملک کا وزیر اعظم بن جائے۔ یہی خاص وجہ تھی جس کی بنا پر بعد کو ساؤتھ انڈیا کے لیڈر مسٹر کامراج وزیر اعظم نہ بن سکے۔

یکم اگست ۱۹۹۴

تاریخ کی ایک کتاب میں پڑھا کہ سلطان ٹیپو کی ناکامی کے ذمہ دار اس کے غدار امراء تھے۔ میر صادق جو ٹیپو کا وزیر تھا، میسور کی چوتھی لڑائی کے دوران تمام فوجی راز انگریزوں کو بھجواتا رہا۔ اور انگریزوں نے اپنا فوجی منصوبہ اس کے مشوروں کی روشنی میں تیار کیا۔ میر غلام علی جس کو ترکی میں سفیر مقرر کرکے بھیجا گیا تھا، غدار ثابت ہوا۔ سلطان کی شہادت کے

بعد ان کے غیر وفادار افسروں ہی نے انگریزوں کو مشورہ دیا تھا کہ سلطان کی اولاد کو میسور کے تخت سے محروم کر دیا جائے۔

مگر یہ آدھی بات ہے۔ بقیہ آدھی بات یہ ہے کہ سلطان ٹیپو میں وہ کمزوری تھی جس کو کان کا کچا کہا جاتا ہے۔ دربار کے لوگ جو محض حسد کی بنا پر اعلیٰ حکام کی شکایت کرتے تھے، وہ ان شکایتوں کو مان لیتے تھے۔ مثلاً میر صادق کے خلاف مالگزاری کی رقم میں خیانت کی بے بنیاد شکایت کی گئی۔ سلطان نے بلا تحقیق اس کو مان لیا اور میر صادق کی جاگیر کی ضبطی کا حکم جاری کر دیا۔ اسی طرح میر غلام علی کی بابت شکایت کی گئی کہ فرانس کے بادشاہ نے سلطان کے لئے سونے کی کرسی دی تھی جس کو اس نے خود اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اس الزام کی تحقیق کے بغیر سلطان نے میر غلام علی کے خلاف سخت احکام جاری کر دئے۔ اس طرح کی غیر مدبرانہ حرکات سے سلطان ٹیپو کے امرا اس سے بغض رکھنے لگے اور پہلا موقع آتے ہی سلطان سے اس کا انتقام لیا۔

۲ اگست ۱۹۹۴

ڈاکٹر مہیش شرما کا تعلق آر ایس ایس سے ہے۔ وہ نہایت سمجھ دار آدمی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد توڑنے کے بعد انھوں نے آر ایس ایس کے لوگوں سے کہا تھا کہ "آدمی طاقت دکھاتا ہے اپنی بارگیننگ کیپسیٹی بڑھانے کے لئے، آپ لوگوں نے بابری مسجد کو توڑ کر اپنی طاقت دکھا دی۔ اب مسلمانوں سے کہو کہ آؤ، ڈائیلاگ کریں۔ مولانا وحید الدین نے اپنا فارمولا پیش کر کے مسلمانوں کی طرف سے پہل کر دی۔ اب تم لوگ آگے آؤ اور بات کر کے مندر مسجد جھگڑے کو آخری طور پر اس دیش سے ختم کر دو" مگر آر ایس ایس والوں نے اس پر دھیان نہیں دیا اس لئے بات آگے نہیں بڑھی۔

۳ اگست ۱۹۹۴

ابن ماجہ (کتاب الفتن) میں ایک روایت کے تحت آیا ہے کہ فاذا رأیتم اختلافاً فعلیکم بالسواد الاعظم (پھر جب تم اختلاف دیکھو تو تم سواد اعظم کے ساتھ رہو) اس حدیث کا مفہوم عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اختلاف کے وقت سواد اعظم کا جو مسلک

ہو وہی مسلک حق ہوگا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں اس کی غلطی اس سے واضح ہے کہ آج برصغیر ہند میں ۷۵ فیصد سے زیادہ لوگ اہل بدعت ہیں۔ پھر کیا اہل بدعت کا مسلک درست قرار دیا جائے گا۔ اس حدیث کا تعلق فتنہ کے مسئلہ سے ہے نہ کہ حق کے مسئلہ سے۔ فتنہ کے وقت سواد اعظم کے ساتھ رہنا اسی طرح وقتی مصلحت کے معنی میں ہے جس طرح وقتی مصلحت کے تحت حضرت ہارون علیہ السلام نے بنی اسرائیل میں شرک کرنے والوں سے تعلق کو برداشت کیا تھا۔ ایسے موقع پر اصل سوال چھوٹے شر اور بڑے شر کے درمیان انتخاب کا ہوتا ہے اور فتنہ کے وقت سواد اعظم کے ساتھ رہنا اسی لئے ہے کہ اس سے ٹکراؤ زیادہ بڑے شر کا باعث ہوگا۔

سواد اعظم اگر اس وقت حق پر ہو تو معاشرہ میں فساد کی نوبت ہی نہ آئے۔ کیوں کہ اقلیت ہمیشہ اکثریت کے تابع ہوتی ہے نہ کہ جو اکثریت ہے وہ اقلیت کے تابع ہو جائے۔

۴ اگست ۱۹۹۴

شیخ محمد اکرام آئی سی ایس سرسید کے تذکرہ کے تحت لکھتے ہیں: سرسید کی تصانیف میں کئی ایسی باتیں ہوتی تھیں جن سے نہ صرف مخالف بلکہ ان کے موافق بھی بدظن ہو جاتے تھے۔ سرسید نے جب بائبل کی نامکمل تفسیر لکھی تو نواب محسن الملک کو اس کی عبارت اتنی شاق گزری کہ اس وقت سرسید سے تعارف نہ ہونے کے باوجود انھوں نے اس کے خلاف سرسید کو ایک طویل خط لکھا اور جب تک ان سے نہ ملے انھیں یقین نہ آتا تھا کہ سرسید قبلہ رو ہو کر نماز پڑھتے ہیں۔" (موج کوثر، صفحہ ۹۱)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختلاف اور غلط فہمی میں کتنا قریبی تعلق ہے۔ نواب محسن الملک کو سرسید کی تفسیر بائبل سے اختلاف ہوا۔ مگر یہ اختلاف یہاں تک پہنچ گیا کہ انھوں نے سمجھ لیا کہ سرسید نماز بھی اگر پڑھتے ہیں تو اسلامی قبلہ کی طرف رخ کر کے نہیں پڑھتے ہیں۔ حالاں کہ یہی نواب محسن الملک ملاقات کے بعد سرسید کے اتنے گرویدہ ہو گئے کہ ان کے قریبی رفیق بن گئے۔ کسی شخص کے بارہ میں کوئی غلط رائے قائم کرنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک اس کی پوری تحقیق نہ کر لی گئی ہو۔

۵ اگست ۱۹۹۴

الفنسٹن (Mountstuart Elphinstone) ایک انگریز تھا۔ وہ ۱۸۵۹ میں پیدا ہوا۔ اور ۱۹۷۹ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ برٹش افسر کی حیثیت سے انڈیا میں آیا۔ آخر عمر میں وہ تصنیف کے کام میں مشغول ہو گیا۔ اس کی ایک مشہور کتاب تاریخ ہند (History of India) ہے جو پہلی بار ۱۸۴۱ میں دو جلدوں میں شائع ہوئی۔

سرسید نے اس کا ترجمہ اردو میں کرایا اور اس کو تاریخ ہند کے نام سے شائع کیا۔ اس کتاب میں مصنف نے جہاں کہیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا تھا، وہاں اس نے نعوذ باللہ آپ کے لئے پیغمبر باطل (False prophet) کا لفظ لکھا تھا، سرسید نے کسی تبدیلی یا کسی نوٹ کے بغیر عین یہی لفظ اردو ترجمہ میں بھی باقی رکھا۔ اس پر سرسید کے خلاف بہت ہنگامہ ہوا۔ حتی کہ خود الطاف حسین حالی نے حیات جاوید میں لکھا کہ "ممکن تھا کہ ترجمہ میں باطل کا لفظ نہ لکھا جاتا۔

آج برصغیر ہند کے بے شمار مسلمان جو سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین کے خلاف پرشور بیانات دے رہے ہیں وہ عین اسی وقت سرسید کے زبردست مداح اور پرستار ہیں۔ کتنا فرق ہے ماضی اور حال میں۔

۶ اگست ۱۹۹۴

۶ اگست کو میں مانچسٹر (انگلینڈ) میں تھا۔ وہاں دو عرب نوجوان (العارف، طارق الکردی) سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ تین چیزیں بچپن سے ہی میں اپنے اندر پا رہا ہوں۔ ایک یہ کہ میں پیدائشی ویجیٹیرین ہوں۔ دوسرے یہ کہ پیدائشی طور پر میرا جھکاؤ غیر متشددانہ طریقہ کی طرف ہے۔ تیسرے یہ کہ ہندو قوم کی محبت میرے اندر بچپن سے موجود ہے۔ یہ صفتیں میرے اندر شاید اس لئے رکھ دی گئی تھیں کہ ہندو قوم میں اسلام کی دعوت پہنچا سکوں۔ جو لوگ ہندو قوم کی نفسیات اور اس کی قومی روایات کو جانتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں ہندو قوم میں کام کرنے کے لئے یہ صفتیں انتہائی طور پر ضروری ہیں۔ موجودہ مسلمانوں کے درمیان جو ماحول قائم ہو گیا ہے، اس کے اثر سے شاید میں بھی ہندو بیزار

ہو جاتا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے پیدائشی طور پر میرے اندر وہ صفتیں رکھ دیں جو ہندوؤں کے اوپر داعی بننے کے لئے ضروری تھیں۔

۷ اگست ۱۹۹۴

سرسید نے ۲۸ دسمبر ۱۹۸۷ میں ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے سالانہ اجلاس میں ایک لکچر دیا۔ اس میں انھوں نے انڈین نیشنل کانگرس کی کھلی مخالفت کی۔ اس پر مولانا شبلی نعمانی نے یہ قطعہ لکھا:

کوئی پوچھے گا تو کہہ دوں گا ہزاروں میں یہ بات — روش سید مرحوم خوشامد تو نہ تھی
ہاں مگر یہ ہے کہ تحریک سیاسی کے خلاف — ان کی جو بات تھی آورد تھی آمد تو نہ تھی

مولانا سید سلیمان ندوی نے ان اشعار کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: "سید مرحوم کے یہ خیالات ذاتی نہ تھے۔ بلکہ انگریز ان کے منہ سے زبردستی کہلواتے تھے اور سرسید کالج کی محبت میں یہ سب کچھ گوارا کر لیتے تھے"۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ سرسید کی کانگرس کی مخالفت کا کوئی بھی تعلق انگریزوں کی خوشامد سے نہ تھا۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ سرسید کے زمانہ کی کانگرس وہ نہ تھی جو بعد کو بنی۔ اس زمانہ کی کانگرس تو خود انگریزوں ہی کی ایک سیاسی جماعت تھی۔ وہ وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن کی تجویز پر شروع ہوئی۔ اس کے قیام میں مسٹر ایلن ہیوم نے خصوصی حصہ لیا۔ اس وقت کانگرس کے جلسوں میں کثرت سے انگریزی حکومت کے افسران شریک ہوا کرتے تھے۔

سیاسی آزادی کی تحریک کے خلاف سرسید کی رائے اسی خیال کی بنا پر تھی جس بنا پر بہت سے ہندو لیڈر (مثلاً مدن موہن مالویہ، سرتیج بہادر سپرو) بھی اس کے مخالف تھے اور وہ خیال یہ تھا کہ ہندستانیوں کو پہلے تعلیم حاصل کرنا چاہئے۔ سیاسی آزادی کا سوال اس کے بعد اٹھانا چاہئے۔

۸ اگست ۱۹۹۴

الجمعیۃ ویکلی (۱۲-۱۸ اگست ۱۹۹۴) کے صفحہ اول پر ایک شعر جلی قلم کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ یہ وہ شعر ہے جس کو ۱۹۴۷ سے پہلے الجمعیۃ اور دوسرے اخبار نمایاں طور پر

چاہتے تھے۔ وہ شعر یہ ہے:

آزاد کا ہر لمحہ پیام ابدیت ‌ ‌ ‌ ‌ محکوم کا ہر لمحہ نئی مرگ مفاجات

پچھلے ۵۰ سال کے واقعات ثابت کر رہے ہیں کہ یہ شعر صرف ایک مضمون بندی تھا۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اگر یہ شعر حقیقت کی ترجمانی ہوتا تو ۱۹۴۷ میں آزادی ملنے کے بعد ہمارے اخبارات ابدیت کے پیغام سے بھرے رہتے۔ مگر حال یہ ہے کہ تمام مسلم اخبارات، جرائد آج بھی موت و ہلاکت کی خبروں سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ بدقسمتی سے مضمون بندی کی یہ قسم اردو زبان میں اتنی عام ہے کہ غالباً کوئی بھی نظم یا نثر اس سے خالی نہیں۔

۹ اگست ۱۹۹۴

ریاض سے ایک ماہنامہ المستقبل کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے ایک طرف عربی مضامین ہوتے ہیں اور دوسری طرف انگریزی مضامین۔ اس کے عربی حصہ کے افتتاحیہ کا عنوان ہے — جراح المسلمین ما تزال تنزف والمؤامرات على الاسلام مستمرة۔ یعنی مسلمانوں کے زخم سے خون ابھی تک رس رہا ہے اور اسلام کے خلاف سازشیں جاری ہیں (صفحہ ۲) دوسری طرف انگریزی حصہ میں افریقہ کے بارہ میں محمد علی نانوتوی کے قلم سے ایک رپورٹ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ مشرقی افریقہ میں ۳۰ ہزار لوگوں نے اسلام قبول کر لیا ہے:

30,000 embrace Islam in east Africa.

آج بھی ساری دنیا میں اسلام کا دعوتی ایڈوانسٹمنٹ جاری ہے۔ ایسی حالت میں اسلام کی مظلومی بیان کرنا لغویت کی حد تک غلط ہے۔ دعوت و اشاعت کے میدان میں اسلام کی ترقی کو بتا کر مسلمانوں کے اندر امید اور حوصلہ پیدا کرنا چاہئے۔ نہ کہ سیاسی ظلم کی خبریں سنا کر انھیں مایوس کر دیا جائے۔

۱۰ اگست ۱۹۹۴

شاہ ولی اللہ دہلوی لکھتے ہیں کہ میرے والد صاحب مجھے حکمت عملی، آداب مجلس اور تہذیب و دانشمندی کی باتیں بہت سکھاتے تھے۔ اور اکثر یہ شعر پڑھتے تھے:

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است ‌ ‌ ‌ ‌ با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

یہی صوفیاء کرام کا مسلک ہے۔ اسی مسلک کی وجہ سے صوفیاء کے زمانہ میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ صوفیاء نے عملاً صرف اصلاح وارشاد کا کام کیا۔ انھوں نے کبھی براہ راست طور پر دعوت وتبلیغ کا کام نہیں کیا۔ مگر ان کی مذکورہ پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ داعی اور مدعو کے درمیان نفرت ختم ہوگئی۔ اور جب داعی اور مدعو کے درمیان نفرت کا خاتمہ ہوجائے اور نارمل فضا میں اختلاط ہونے لگے تو اس کے بعد اسلام اپنے آپ پھیلنے لگتا ہے۔

۱۱ اگست ۱۹۹۴

سورۃ الاعراف میں ہے کہ مصر میں جب حضرت موسیٰ کا مقابلہ جادوگروں سے پیش آیا تو جادوگروں نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ پہلے تم اپنا عصا ڈالوگے یا ہم۔ حضرت موسیٰ نے جواب دیا کہ تم ہی پہلے ڈالو (الاعراف ۱۱۵-۱۱۶) چنانچہ یہی ہوا۔ جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لکڑیاں ڈالیں اور بعد کو حضرت موسیٰ نے اپنا عصا زمین پر ڈالا۔

حضرت موسیٰ خدا کے پیغمبر تھے۔ ان کو خدا کی طرف سے بتایا جا چکا تھا کہ تمہارا عصا جادوگروں کی تمام رسیوں اور لکڑیوں سے زیادہ طاقت ور ہے اور یقینی طور پر تم ہی اس مقابلہ میں کامیاب ہوگے۔ اس کے باوجود حضرت موسیٰ نے خود پہل نہیں کی۔ بلکہ جادوگروں کو موقع دیا کہ وہ پہل کریں۔ اس سے یہ شرعی اصول اخذ ہوتا ہے کہ مقابلہ کے مواقع پر مسلمان کو اپنی طرف سے ٹکراؤ کا آغاز نہیں کرنا چاہئے۔ اس کو ہمیشہ انتظار کرنا چاہئے کہ فریق ثانی ٹکراؤ کا آغاز کرے۔ جب دوسرا فریق آغاز کردے اس کے بعد اللہ کے بھروسہ پر اس کا بھرپور جواب دینا چاہئے۔

۱۲ اگست ۱۹۹۴

فقہ حنفی میں بہت سے قواعد واضح طور پر حدیث کے خلاف ہیں۔ مثلاً حنفی فقہاء کے یہاں حج کے بارہ میں ایک قاعدہ یہ ہے کہ احرام باندھنے والا شخص اگر حج کے افعال میں سے کسی فعل کو اس کے معین وقت سے مؤخر یا مقدم کر دے تو اس پر دم واجب ہوجاتا ہے۔

ان المحرم اذا اخر النسك عن الوقت الموقت له او قدمه لزمه دم (تاسیس النظر للدبوسی، صفحہ ۸)

اس سلسلہ میں واضح روایات موجود ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ حج کے مراسم میں اگر سہواً تقدیم وتاخیر ہوجائے تو اس سے فریضۂ حج میں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا اور اس پر دم کی ضرورت نہیں۔ مگر حنفی فقہاء اپنے قیاس کی بنیاد پر دم کو ضروری قرار دیتے ہیں (مشکاۃ المصابیح ۸۱۴/۲)

۱۳ اگست ۱۹۹۴

فقہ میں کچھ متفق علیہ قاعدے ہیں۔ تمام فقہاء نے ان کو معتبر اور لائق اعتماد تسلیم کیا ہے۔ کسی بھی قابل ذکر عالم کا ان پر اختلاف نہیں۔ ان میں سے ایک قاعدہ یہ ہے کہ تمام امور میں فیصلہ ان کے مقاصد کے اعتبار سے کیا جائے گا (الامور بمقاصدھا)

یہ اصول ثابت کرتا ہے کہ شریعت صرف اس اقدام کی اجازت دیتی ہے جو مثبت غرض کے لئے ہو۔ بے مقصد عمل کی شریعت میں اجازت نہیں۔

۱۴ اگست ۱۹۹۴

قرآن میں صحابہ کے بارہ میں ہے کہ سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود (الفتح ۲۹) بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد پیشانی کا گٹا ہے۔ حالاں کہ اس سے اس آیت کا کوئی تعلق نہیں۔ اس میں اس نشانی کا ذکر ہے جو پورے وجہ (چہرہ) پر ہوتا ہے نہ کہ محض پیشانی کے ایک حصہ پر۔

اگر آدمی نماز کا خصوصی اہتمام کرے۔ نیز وہ رات کے وقتوں میں دیر تک اللہ کے سامنے حالت نماز میں گزارے تو اس سے اس کی روح میں ایک خاص سنجیدگی اور ربانیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ روحانی کیفیت جتنی زیادہ شدید ہو گی اتنا ہی زیادہ وہ آدمی کے چہرے پر جھلکے گی۔ آدمی کی چال ڈھال، اس کا بولنا، غرض اس کی ہر ادا میں ایک متقیانہ شان پیدا ہو جائے گی۔ یہاں اسی کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۵ اگست ۱۹۹۴

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جب بابری مسجد ڈھا دی گئی اور وہاں عارضی مندر تعمیر کر کے اس کی پوجا شروع کر دی گئی۔ اس کے بعد حالات دیکھتے ہوئے میں نے یہ فارمولا پیش کیا تھا کہ مسلمان ایک مسجد پر چپ ہو جائیں، اور ہندو ایک کے بعد تمام مسجدوں پر چپ ہو جائیں۔ اس پر کچھ مسلم دانشوروں نے میرا مذاق اڑایا۔ ان کے نزدیک سید شہاب الدین کا موقف جرأتمندانہ تھا جو یہ کہتے تھے کہ مسجد دوبارہ وہیں بناؤ۔ مگر حالات نے آخر کار تمام لوگوں کو وہیں پہنچا دیا جو میں نے پیشگی طور پر تجویز کیا تھا۔ چنانچہ اب مسٹر شہاب الدین

مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں کہ " بابری مسجد کو بھول جائیے میاں، اور جاکر اپنے محلوں کی حفاظت کیجئے"۔ ماہنامہ افکار ملی، دہلی، اگست ۱۹۹۴، صفحہ ۴۵

۱۶ اگست ۱۹۹۴

اگست کے دوسرے ہفتہ میں میں برمنگھم (انگلینڈ) میں تھا۔ آج واپس آیا۔ وہاں جناب شمشاد محمد خاں صاحب نے بتایا کہ خلیجی جنگ (1991) کے شروع ہونے سے کچھ پہلے وامی (WAMI) کے کچھ ذمہ دار حضرات ریاض سے برطانیہ آئے۔ برمنگھم میں انھوں نے الہجرہ اسکول کے ہال میں ایک میٹنگ کی۔ اس میں شہر کے خاص خاص مسلمانوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ میں بھی اس میں موجود تھا۔

یہ آنے والے لوگ سعودی عرب کے کنگ فہد اور امیر کویت کے اس فیصلہ کے خلاف تھے کہ صدام حسین کی جارحیت کا مقابلہ امریکی کی فوجی مدد کے ذریعہ کیا جائے۔ مگر وہ اپنی اس رائے کا اظہار براہ راست خود اپنی طرف سے نہیں کرسکتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس رائے کو وہ برطانیہ کے مسلمانوں کی طرف سے سعودی حکومت کے سامنے پیش کریں۔ چنانچہ یہاں سے وہ اس قسم کی ایک تجویز لے کر گئے۔ مگر وہ سعودی حکومت کے لئے قابل قبول نہ ہو سکی۔

عرب ملکوں میں وہاں کے شیوخ اور دانشوروں کی احتیاط کا عالم یہ ہے کہ وہ اپنی حکومت سے لفظی اختلاف کی جرأت بھی نہیں کرسکتے۔ مگر یہی لوگ دوسرے ملکوں (مثلاً کشمیر، فلپائن، بوسنیا، وغیرہ) میں مسلح ٹکراؤ کی حمایت کرتے ہیں۔ اور ان کے لئے بڑی بڑی رقمیں بطور امداد فراہم کرتے ہیں۔ کیسا عجیب ہے یہ تضاد اور کیسا عجیب ہے یہ اسلام۔

۱۷ اگست ۱۹۹۴

ڈاکٹر احمد سلطان صاحب (بنگلور) ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ دو مہینہ پہلے بنگلور کی ایک مسجد میں انھوں نے جمعہ کی نماز پڑھی۔ وہاں تقریباً ۲۲ سال کی عمر کا ایک نوجوان عالم امام تھا۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں ٹیوشن پڑھا کر

رات کو دس بجے مسجد کی طرف آرہا تھا۔ میں ایک اسکوٹر (تھری وہیلر) پر سوار تھا۔ راستہ میں دو ہندو زبردستی اسکوٹر کو روک کر اس پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے میری گھڑی اور نقدی چھین لی اور اس کے بعد ایک مندر میں لے جاکر مجھ سے وہاں بتوں کی پوجا کرائی۔

ڈاکٹر احمد سلطان صاحب نے کھڑے ہوکر اس کو ڈانٹا اور کہا کہ چپ رہو، تم جھوٹ بول رہے ہو۔ اس کے بعد انھوں نے تحقیق کرنا شروع کیا۔ معلوم ہوا کہ مذکورہ امام صاحب ایک مسلمان تاجر کے یہاں رات کے وقت، بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کے لئے جاتے ہیں۔ تاجر نے کسی موقع پر کہا کہ آپ کو مسجد سے یہاں آنے میں زحمت ہوتی ہے۔ میں کوشش کرونگا آپ کے لئے ایک اسکوٹر (ٹو وہیلر) کا انتظام ہو جائے۔ اس کے بعد تاجر غالباً بھول گیا۔ امام صاحب نے تاجر کو متاثر کرنے کے لئے مذکورہ کہانی بنائی اور اس کو تاجر سے بیان کیا۔ تاجر زیادہ ہوشیار نہ تھا۔ اس نے امام صاحب سے کہا کہ آپ اس قصہ کو مسجد میں بیان کریں تاکہ مسلمان رات کو باہر نکلیں تو ہتھیار لے کر نکلیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ آخر میں نے اس امام کو اپنے گھر بلایا اور کوڑا دکھا کر کہا کہ صحیح صحیح بتاؤ، ورنہ ابھی اس کوڑے سے تمہاری کھال ادھیڑ دوں گا۔ امام نے اعتراف کیا کہ مذکورہ قصہ بالکل فرضی تھا۔ اس نے یہ قصہ صرف اس لئے گھڑا تھا کہ تاجر کو متاثر کرکے اسکوٹر دینے کے لئے آمادہ کر سکے —— اسی طرح کے احمق لوگ ہیں جو سارے فسادات برپا کرتے ہیں۔

۱۸ اگست ۱۹۹۴

غزوۂ حنین کے بعد ایک انصاری مسلمان کو شکایت ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غنیمت کی تقسیم میں ان کو حصہ نہیں دیا۔ اس کا نام عباس بن مرداس تھا۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق، وہ ناراض ہوگئے اور رسول اللہ کے خلاف اشعار کہے۔ رسول اللہ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا: اذھبوا بہ فاقطعوا عنی لسانہ (سیرۃ ابن ہشام ۴/۱۴۱)

اصحاب رسول اگر قطع لسان کو لفظی معنی میں لیتے تو وہ چھری لے کر اس کی زبان کاٹنے کے لئے دوڑتے۔ مگر اس کو انھوں نے تمثیل کے معنی میں لیا اور اس کو کچھ مال دے دیا۔

یہاں تک کہ وہ راضی ہو کر چپ ہو گیا (فاعطوہ حتی رضی۔ فکان ذالك قطع لسانه الذی امر به رسول الله صلی الله علیه وسلم) ۴/ ۱۴۱

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کتنے زیادہ باشعور لوگ تھے۔ انھوں نے کسی مدرسہ یا کسی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ مگر ان کے اندر اللہ کا خوف تھا۔ اللہ کا خوف آدمی کو سنجیدہ بناتا ہے، اور سنجیدگی بلاشبہ علم کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے (اتقوا الله ویعلمکم الله)

۱۹ اگست ۱۹۹۴

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان سے بات ہو رہی تھی۔ انھوں نے "ممکن سے آغاز" کے نقطۂ نظر کی تائید کی۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم کو ابھی تک نقطۂ آغاز نہیں ملا۔ آپ کے سامنے ایک بڑی بلڈنگ ہے۔ آپ کو اس کے اندر پہنچ کر اس میں اپنی جگہ بنانا ہے تو سب سے پہلے آپ کو انٹری پوائنٹ Entry point تلاش کرنا ہوگا۔ اگر آپ کو انٹری پوائنٹ ہی نہ ملے تو آپ کو بلڈنگ میں داخلہ کیسے مل سکتا ہے۔

۲۰ اگست ۱۹۹۴

فتح مکہ کے فوراً بعد وہ غزوہ پیش آیا جس کو غزوۂ حنین کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر کچھ انصار کو یہ شکایت تھی کہ خالد بن ولید ابھی ابھی مکہ سے آکر مسلمان ہوئے ہیں اور ان کو آپ نے لشکر کا سردار بنا دیا۔ اس سلسلہ میں ایک انصاری عباس بن مرداس نے بہت سے اشعار کہے۔ اس میں اس نے رسول اللہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ آپ نے قوم میں خالد کو امیر بنا دیا (فان تك قد امرت فی القوم خالداً) اس شکایت کے باوجود وہ لوگ پوری جاں نثاری کے ساتھ مہم میں شریک رہے۔ عباس نے کہا:

وقال نبیّ المؤمنین تقدّموا   وحُبَّ الینا ان نکون المقدّما

اور مسلمانوں کے پیغمبر نے کہا کہ آگے بڑھو تو ہم کو یہ بات محبوب ہو گئی کہ ہم سب سے آگے بڑھ کر مقابلہ کریں۔

۲۱ اگست ۱۹۹۴

ایک صاحب نے قومی آواز (۲۱ اگست) کے حوالے سے کہا کہ کل راجیو گاندھی کی یاد میں نئی دہلی کے تالکٹورہ اسٹیڈیم میں ایک تقریب ہوئی۔ اس کا اہتمام آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے کیا تھا۔ وزیراعظم نرسمہا راؤ منچ پر بولنے کے لئے کھڑے ہوئے تو اس وقت سونیا گاندھی منچ کے نیچے اگلی صف میں ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ جیسے ہی وزیراعظم اٹھے اسٹیڈیم کے ہر کونے سے کانگرس کے کارکنوں کی آوازیں آنے لگیں۔ یہاں تک کہ وزیراعظم کئی منٹ تک چپ چاپ کھڑے رہے۔ وہ کچھ بول نہ سکے۔ مذکورہ صاحب نے بتایا کہ اس وقت کانگرسی کارکن یہ نعرہ لگا رہے تھے: "سونیا جی لیڈر شپ سنبھالو"

مجھے یہ بات عجیب سی لگی۔ میں نے تحقیق کے لئے مذکورہ اخبار کو دیکھا۔ معلوم ہوا کہ کانگرسیوں کا یہ نعرہ تھا: سونیا جی اسٹیج پر آؤ۔ یہ ایک سادہ سی بات تھی۔ کیوں کہ سونیا راجیو گاندھی کی بیوہ ہیں اور ان کو اس تقریب میں اسٹیج پر ہونا چاہئے۔ مگر چند الفاظ کی تبدیلی سے بات کچھ سے کچھ ہو گئی۔ اسی لئے شریعت میں حکم ہے کہ کوئی بات سنو تو اس کو ماننے سے پہلے اس کی تصدیق کر لو۔

۲۲ اگست ۱۹۹۴

انڈیا کے موجودہ پریسیڈنٹ ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے ایک ہندی اخبار دینک ہندستان کو ایک انٹرویو دیا۔ انٹرویو کے دوران ان کی زیر تالیف آپ بیتی کا ذکر ہوا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کہا کہ میرا مزاج تنقیدی نہیں ہے۔ میرا قلم کسی کو دکھ نہیں دے گا۔ اس کا ترجمہ انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (۲۲ اگست) میں چھپا ہے۔ اس میں مذکورہ جملہ کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے:

(My pen will pain nobody)

انگریزی ترجمہ میں ان کے جملہ میں ایک ادبی لطف پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن یہ کسی ایک زبان کی خصوصیت نہیں۔ اس قسم کی مثالیں ہر زبان میں پائی جاتی ہیں۔ حتی کہ ان دیہاتی بولیوں میں بھی جو محدود پیمانہ پر صرف بول چال میں استعمال ہوتی ہیں، جو ابھی تک لٹریری زبان

کا درجہ حاصل نہیں کر سکیں۔

۲۳ اگست ۱۹۹۴

آج کے ہندستان ٹائمس میں صفحہ ۱۵ پر پورے صفحہ کا ایک اشتہار نظر سے گزرا۔ یہ ماروتی کار بنانے والی کمپنی کی طرف سے ہے۔ اس میں ماروتی کے نئے ماڈل اسٹیم (Esteem) کی خوبصورت تصویر ہے اور اس کے نیچے لکھا ہوا ہے ـــــ ماضی میں جینا چھوڑ دیجیے:

(Stop living in the past)

یہ گویا دور جدید کا کلمہ ہے۔ آج کے انسان کی عمومی فکر یہ ہے کہ پہلے کے فرسودہ طریقے چھوڑو، نئے بہتر طریقے اختیار کرو۔ یہ مزاج اصلاً اور ابتداءً مادی ساز و سامان کے بارہ میں پیدا ہوا۔ اس حد تک وہ درست تھا۔ مگر پھر بڑھتے بڑھتے وہ مذہب و اخلاق تک پہنچ گیا۔ یہ اس کے لئے حد سے تجاوز کے ہم معنی تھا۔ زندگی کے اسباب میں بلاشبہ تبدیلیاں ہوتی ہیں اور وہ مطلوب ہیں۔ مگر زندگی کی قدریں ناقابل تغیر ہیں اور مذہب اسی نوعیت کی دوسری چیز ہے۔

۲۴ اگست ۱۹۹۴

محمد حسین کی کتاب چھپی ہے۔ اس کا نام ہے: حصوننا مهددة من داخلها۔ یعنی ہمارے قلعے اندرون سے خطرے میں ہیں۔

اس عربی کتاب کا خلاصہ یہ ہے کہ امت مسلمہ لمبی مدت سے مختلف قسم کے خطرات سے دوچار ہے۔ اب تک ہمارے لکھنے اور بولنے والے لوگ ان کا سرچشمہ خارج کو قرار دیتے رہے ہیں۔ جب کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ہم کو جو خطرہ لاحق ہے وہ اندر سے ہے نہ کہ باہر سے۔ ہمارے اندر اسلامی نام رکھنے والے اور بظاہر اسلامی لباس پہننے والے ایسے کثیر افراد موجود ہیں جو تخریبی عزائم رکھنے والے خارجی عناصر کے لئے معاون اور آلۂ کار کا کام کر رہے ہیں۔ یہ افراد جب تک امت کے مراکز نفوذ اور پالیسی سازی کے مقامات پر موجود رہیں گے۔ خارجی دشمن ان کے ذریعہ مسلم دنیا کو اپنی سازش

کا شکار بنا تا رہے گا۔

بہت سے مسلم دانشور اور علما اسی انداز میں سوچتے ہیں۔ مگر یہ نہایت سطحی سوچ ہے۔ بالفرض اگر اس کو حقیقت مان لیا جائے تب بھی میں کہوں گا کہ ایسے افراد ہر قوم میں اور ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ وہی قوم اس دنیا میں ترقی کرتی ہے جو اس قسم کے موانع کے باوجود آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اس قسم کے موانع کبھی کسی کے لئے ختم نہیں ہوتے پھر وہ ہمارے لئے کیوں کر ختم کر دئے جائیں گے۔ پاکستان، ایران اور دوسرے ملکوں میں دشمن عناصر کی صفائی کے نام پر ہزاروں مسلمان مار ڈالے گئے۔ پھر کیا ان ملکوں میں صالح معاشرہ اور صالح حکومت قائم ہو گئی۔

۲۵ اگست ۱۹۹۴

ساؤتھ افریقہ کے مشہور مناظر جناب احمد دیدات صاحب امریکہ گئے۔ وہاں کسی پادری سے ان کا مناظرہ ہوا۔ پادری نے کہا کہ آپ باہر سے امریکہ میں آئے ہیں۔ یہاں آپ ہر شہر میں جاسکتے ہیں۔ اسی طرح ہم مکہ اور مدینہ میں کیوں نہیں جاسکتے۔ احمد دیدات صاحب نے کہا کہ بہت آسان بات ہے۔ میں امریکہ میں ایک فارم کو بھرنے کے بعد داخل ہوا ہوں اسی طرح ہر ملک میں داخلہ کا مقرر قاعدہ ہے۔ مکہ اور مدینہ میں داخل ہونے کا بھی ایک سادہ سا قاعدہ ہے۔ آپ کہئے: لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ، اور آپ کو مکہ اور مدینہ میں داخلہ مل جائے گا۔

اس مناظرانہ گفتگو کا ویڈیو ریاض کے ایک سعودی شیخ نے دیکھا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے احمد دیدات کو اپنے خرچ پر ریاض بلایا۔ ان سے گفتگو کی۔ اور ان کو دو ملین ڈالر کا چیک دے دیا۔ حالاں کہ احمد دیدات صاحب کا جواب محض ایک لطیفہ تھا نہ کہ جواب۔ کیوں کہ پادری دوبارہ کہہ سکتا تھا کہ آپ امریکہ میں اس طرح داخل ہوئے ہیں کہ آپ نے صرف اپنی موجودہ آئیڈنٹٹی کو ڈکلیر کیا ہے۔ جب کہ آپ مکہ مدینہ میں داخلہ کی یہ شرط لگا رہے ہیں کہ تم اپنی موجود آئیڈنٹٹی کو چینج کرو ـــــ شاعروں اور لطیفہ گویوں کو بڑی بڑی رقمیں دینا پہلے بھی تھا اور اب بھی مزید اضافہ کے ساتھ جاری ہے۔

۲۶ اگست ۱۹۹۴

مسلم دانشوروں کی عام شکایت ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد ۱۵ فیصد ہے پھر سرکاری سروسوں میں ان کی تعداد صرف ایک فیصد کیوں۔ کیا یہ ظلم اور تعصب نہیں۔ مزید یہ کہ یہ بات وہ لوگ کرتے ہیں جو خود بر سر روزگار ہیں۔

یہ شکایت سراسر بھول ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے مسلمان سرکاری ملازمتوں میں بھرے ہوئے تھے۔ اس کے بعد مسلمانوں کا خروج exodus شروع ہوا۔ ۱۹۴۷ میں ہزاروں کی تعداد میں برسر ملازمت نیز اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد ہندستان چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔ اس طرح اچانک خلا پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد صنعتی انقلاب اور پٹرول کے ظہور کے نتیجہ میں باہر کے شاندار مواقع کھلے۔ مسلمان مسلسل ایک طرف عرب ملکوں میں اچھی تنخواہوں کے لئے جانے لگے۔ دوسری طرف اس محرک کے تحت بہت بڑی تعداد میں یورپ اور امریکہ چلے گئے۔ آج تک یہ صورت حال ہے کہ جس پڑھے لکھے آدمی کو موقع ملتا ہے وہ فوراً باہر چلا جاتا ہے۔ کیوں کہ وہاں انڈیا سے زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔

یہی تعلیم یافتہ لوگ ہی تو سروسوں میں لئے جاتے ہیں۔ جب سروس کے قابل افراد باہر چلے جائیں تو آخر کن لوگوں کو سروس دی جائے گی ــــ ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے یہ بات کہی۔

۲۷ اگست ۱۹۹۴

دوسو سال پہلے مالتھس نے حساب لگا کر بتایا تھا کہ انسان کی پاپولیشن میں اضافہ Geometrical rate سے ہو رہا ہے۔ جبکہ خوراک میں اضافہ اس کے برعکس صرف arithmatical rate سے ہوتا ہے۔ اس نے دعویٰ کیا کہ زمین پر صرف تین بلین انسانوں کے بسنے کی گنجائش ہے۔ اس لئے موجودہ رفتار آبادی کو روکنا ضروری ہے۔ ورنہ بہت جلد بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے دنیا کے وسائل ناکافی ہو جائیں گے۔ اور لوگ بھوکوں مرنے لگیں گے۔

رابرٹ مالتھس کی مذکورہ کتاب ۱۷۹۸ میں چھپی تھی۔ اب اس پر دوسو سال پورے

ہورہے ہیں۔ اس دوران انسانی آبادی ۱۰ گنا سے زیادہ ہوچکی ہے۔ یعنی اس سے بہت زیادہ جتنا مالتھس کے اندازہ کے مطابق زمین پر گنجائش تھی ـــــ اس تجربہ نے قرآن کے الفاظ نحن نرزقہم و ایاکم (الاسراء ۳۱) کی صداقت کو از سر نو ثابت شدہ بنا دیا ہے۔

یہ بات میں نے بی بی سی کے نمائندہ کو ایک انٹرویو میں بتائی۔ وہ ستمبر ۱۹۹۴ میں ہونے والی قاہرہ کانفرنس کے لئے انٹرویو لینے آئے تھے۔ یہ انٹرنیشنل کانفرنس اقوام متحدہ کے تعاون سے پاپولیشن اینڈ ڈیولپمنٹ کے موضوع پر ہو رہی ہے۔

۲۸ اگست ۱۹۹۴

نوائے وقت (۱۸ اگست ۱۹۹۴) کے صفحہ اول پر نواز شریف کی ایک تقریر اس سرخی کے ساتھ چھپی ہوئی ہے: عوام نے مجھے حکومت کے خلاف جہاد کا حکم دیا ہے۔

یہی مزاج پاکستان کی سب سے بڑی کمزوری ہے جس کی وجہ سے پاکستان نصف صدی بعد بھی ترقی نہ کرسکا۔ وہاں کا حال یہ ہے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی سے لے کر نواز شریف تک ہر ایک کے نزدیک سیاست یہ ہے کہ الکشن میں جب ہار جاؤ تو جیتنے ہوئے کو ڈاؤن کرنے کا ہنگامہ شروع کردو۔ کسی قوم یا ملک کی ترقی کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہاں مستحکم حکومت (stable government) قائم ہو۔ اسی لئے اسلام میں قائم شدہ حکومت کے خلاف خروج کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ مگر پاکستان کے سطحی سیاست دانوں کو اس کے سوا کوئی اور سیاست معلوم ہی نہیں۔

۲۹ اگست ۱۹۹۴

اعظم گڑھ میں مشاعرہ تھا۔ جگر مرادآبادی (۱۹۶۰ - ۱۸۹۸) اور اقبال احمد سہیل (۱۹۵۰ - ۱۸۸۷) دونوں اس میں موجود تھے۔ جگر مرادآبادی نے اپنی ایک غزل سنائی۔ اس میں یہ شعر تھا:

اندازۂ ساقی تھا کس درجہ حکیمانہ ساغر سے اٹھیں موجیں بن کر خطِ پیمانہ

اقبال احمد سہیل نے اس شعر کی بہت داد دی۔ جگر مرادآبادی نے پوچھا کہ آپ نے اس شعر کی اتنی زیادہ داد دی۔ اس میں کیا بات آپ کو پسند آئی۔ سہیل صاحب نے کہا کہ

اس میں تمثیل کی زبان میں فیض بقدر استعداد کا اصول بتایا گیا ہے۔ مولانا ابو الجلال ندوی (۱۹۸۴ - ۱۸۹۱) بھی اس موقع پر موجود تھے۔ انھوں نے جگر سے پوچھا کہ کیا آپ کے شعر کا یہی مطلب ہے۔ جگر نے جواب دیا: ابھی تک تو نہیں تھا، مگر اب یہی ہے۔ (معارف اگست ۱۹۹۴)

۳۰ اگست ۱۹۹۴

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۱۱ اگست ۱۹۹۴) میں ایک عرب خاتون کا مختصر مضمون چھپا ہے۔ خاتون نے اپنا نام نہیں بتایا ہے، صرف "مسلمة" لکھا ہے۔ اس میں وہ حجاب کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتی ہیں: یا اعداء الاسلام، نحن نفخر بالحجاب ونعتز به ولن نسمع نعيقكم ابداً (اے اسلام کے دشمنو، ہم کو اپنے حجاب پر فخر و ناز ہے اور اس معاملہ میں ہم تمہاری چیخ پکار کبھی نہیں سنیں گے۔) موجودہ زمانہ میں اکثر مسلمان اسی طرح کی بولی بولتے ہیں۔ حالاں کہ حجاب یا اسلام کی تعلیمات اطاعت کے لئے ہیں نہ کہ فخر و ناز کے لئے۔ موجودہ زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ بظاہر تو اسلام کی زبردست دھوم ہے مگر اسلام کی حقیقی اسپرٹ کہیں موجود نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کو لوگوں نے قومی جذبہ کے تحت اختیار کیا ہے نہ کہ اسلامی جذبہ کے تحت۔ قومی دین فخر پیدا کرتا ہے اور خدائی دین تقویٰ۔

۳۱ اگست ۱۹۹۴

پاکستان کی چھپی ہوئی ایک کتاب دیکھی اس کا نام تھا: عددی اعجاز القرآن۔ اس کے آخر میں پر فخر طور پر ظفر علی خاں کا یہ شعر نقل کیا گیا تھا:

اونٹوں کے چرانے والوں نے اس شخص کی صحبت میں رہ کر
قیصر کے تخت کو روندا کسریٰ کا گریباں چاک کیا

رسول اللہ کی صحبت نے صحابہ کو اللہ سے ڈرنے والا اور انسانوں پر شفقت کرنے والا بنایا تھا۔ مگر مذکورہ شعر پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی صحبت لوگوں کو جنگجو بناتی تھی۔ کس قدر فرق ہے مسلمانوں کے اسلام میں اور خدا اور رسول والے اسلام میں۔

یکم ستمبر ۱۹۹۴

حدیث کی کتابوں میں متعین الفاظ میں یہ روایت موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح عائشہ رضی اللہ عنہا سے ۶ سال کی عمر میں ہوا، اور ۹ سال کی عمر میں رخصتی ہوئی۔ مگر بعض قرائن اس کی تائید نہیں کرتے۔

انھیں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد خولہ بنت حکیم آپ کے پاس آئیں اور آپ کی اجازت سے عائشہ کے لئے نکاح کا پیغام لے کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئیں۔ اس کو سن کر حضرت ابوبکرؓ نے کہا: وهل تصلح له. انما هي ابنة اخيه. کیا عائشہ کا رشتہ آپ کے ساتھ درست ہوگا۔ وہ تو ان کے بھائی کی لڑکی ہے۔ خولہ نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچائی تو آپ نے فرمایا کہ رشتہ درست ہے کیوں کہ ابوبکر میرے دینی بھائی ہیں نہ کہ خونی بھائی۔

یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے جس طرح مذکورہ شبہ ظاہر کیا، اسی طرح وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ وہ تو چھ سال کی بچی ہے۔ ابھی اس کی عمر نکاح کی نہیں ہوئی۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کہا۔

دوسرا قرینہ یہ ہے کہ مذکورہ شبہ رفع ہونے کے بعد حضرت ابوبکر نے دوسری بات یہ کہی کہ عائشہ کے رشتہ کے لئے میری بات مطعم بن عدی سے اس کے بیٹے کے لئے ہو چکی ہے، اور ابوبکر نے کبھی آج تک وعدہ خلافی نہیں کی۔ چنانچہ اس کے بعد وہ مطعم بن عدی کے پاس گئے اور اس سے اس کے پیغام کی بابت پوچھا۔ مطعم اور اس کی بیوی دونوں نے کہا کہ ہم کو شبہ ہے کہ تم کہیں میرے بیٹے کو صابی (مسلمان) نہ بنا دو۔ اس کے بعد مطعم سے وعدہ کا معاملہ ختم ہو گیا اور حضرت ابوبکر نے رسول اللہ سے عائشہؓ کا نکاح کر دیا۔ (سیرۃ ابن کثیر ۲/۴۳-۱۴۲)

یہاں بھی یہ سوچنے کی بات ہے کہ مطعم نے جب اپنے لڑکے کے نکاح کا پیغام عائشہؓ کے لئے دیا تو اس وقت وہ قابل نکاح عمر کے قریب پہنچ چکی ہوں گی۔ اگر ایسا نہ ہو تو نہ مطعم نکاح کا پیغام دیں گے اور نہ ابوبکر اس کو قبول کریں گے۔ خولہ اور رسول اللہ اور ابوبکر اور

مطعم اور دوسرے متعلق اشخاص دوسری باتیں تو کہتے ہیں مگر ان میں سے کوئی یہ نہیں کہتا کہ اتنی کم عمر لڑکی سے نکاح کا کیا سوال۔

۲ ستمبر ۱۹۹۴

کچھ مسلمانوں کے بارہ میں ایک المناک تجربہ گزرا۔ اس کے بعد میری زبان پر یہ الفاظ آگئے: موجودہ زمانہ میں لوگوں کو اپنے جھوٹ پر جتنا یقین ہے، اصحاب رسول کو اپنے سچ پر بھی اتنا یقین نہیں ہوتا تھا۔

۳ ستمبر ۱۹۹۴

نوائے وقت (۲۴ اگست ۱۹۹۴) میں چھپے ہوئے مضمون میں یہ جملہ تھا کہ "پاکستان نتیجہ تھا مسلمانان ہند کی مشترکہ جدوجہد کا" اس کے برعکس کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ پاکستان نتیجہ تھا انگریز کی تفریقی سیاست کا۔ کچھ اور لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان نتیجہ تھا ہندو قوم کی اسلام دشمن سازش کا۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب (لاہور) اس سے بھی آگے جا کر کہتے ہیں کہ پاکستان کا قیام خالص خدائی تدبیر تھی۔ (یثاق، جولائی ۱۹۹۴، صفحہ ۱۸)

پاکستان ۱۹۴۷ میں سخت ہنگامہ خیز سیاست کے درمیان بنا۔ اتنے جدید اور اتنے نمایاں واقعہ کے بارہ میں اتنی زیادہ مختلف رائیں ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخ کی تعبیر کا کام کتنا زیادہ مشکل کام ہے۔

۴ ستمبر ۱۹۹۴

ایک ہندو جرنلسٹ جو بہت زیادہ سیکولر ہیں اور بہت زیادہ تنقیدی مضامین لکھا کرتے ہیں۔ ان سے میں نے کہا کہ سیکولر بنئے، مگر آئیڈیلسٹ نہ بنئے۔ کیوں کہ آئیڈیلزم کبھی دنیا میں نہیں چلتا۔ آپ خود اپنی ذاتی زندگی میں بھی آئیڈیلزم پر نہیں چل سکتے پھر دوسروں کو آپ کیوں ہمیشہ آئیڈیل سے ناپتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اس اعتبار سے میں دیکھتا ہوں تو تمام دانشور مجھ کو ڈبل اسٹینڈرڈ دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے ذاتی معاملات میں ہمیشہ عملی پہلوؤں (practical reasons) کا لحاظ کرتے ہیں۔ مگر جب دوسروں کے بارہ میں لکھتے یا بولتے ہیں تو فوراً وہ آئیڈیلسٹ بن جاتے ہیں۔ اسی کے بارہ میں شیخ سعدی

نے کہا ہے کہ: ہرچہ برخود پسندی بر دیگراں پسند۔

۵ ستمبر ۱۹۹۴

ٹائمس آف انڈیا (۵ ستمبر) میں ایک اجتماع کی رپوٹنگ ہے۔ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں کارڈیالوجی کے ہیڈ ڈاکٹر ایچ ایس واسر (H.S. Wasir) نے ایک لکچر میں بتایا کہ صعوبت کی ایک مناسب مقدار زندگی کے لئے ضروری ہے۔ زندگی کا عمل دراصل صعوبت پر ردعمل کا نام ہے:

The optimum amount of stress was necessary for life. The process of living is a process of reacting to stress.

علم النفس اور میڈیکل سائنس کی یہ جدید دریافت قرآن کے عین مطابق ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو ہم نے مشقت میں پیدا کیا (لقد خلقنا الانسان فی کبد)۔ یعنی انسان کو ایسے حالات میں رکھا گیا ہے اور اس کی تشکیل اس ڈھنگ پر ہوئی ہے کہ اس کو لازماً صعوبتوں اور مشقتوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ یہ انسان کے اوپر ظلم نہیں ہے، بلکہ اس کی ترقی اور کامیابی کا زینہ فراہم کرنا ہے۔ کیوں کہ اس سے آدمی کے اندر سہارنے کی طاقت پیدا ہوتی ہے۔ اس کی خفتہ صلاحیتیں جاگتی ہیں۔ پیٹ سے وہ انسان پیدا ہوتا ہے مگر جب وہ زندگی کی مشکلوں کا مقابلہ کرتا ہے تو وہ سپر انسان بن جاتا ہے۔

۶ ستمبر ۱۹۹۴

سب سے بڑی عقل کی بات کیا ہے جو آدمی کی پوری زندگی کی اصلاح کا ذریعہ بن جائے۔ سب سے بڑی عقل کی بات صرف ایک ہے، اور وہ موت ہے۔ آدمی اگر اپنی موت کو یاد کرے تو وہ کبھی حد سے باہر نہ جائے، وہ کبھی سرکشی اور ظلم کا طریقہ اختیار نہ کرے۔ تمام برائیوں کی جڑ حد سے تجاوز ہے، اور موت کا ڈر اسی تجاوز کے خلاف سب سے بڑا روک۔ موت سے مراد سادہ طور پر انتہاءِ حیات نہیں ہے۔ بلکہ زندگی کا وہ اگلا مرحلہ ہے جہاں آدمی اپنے عمل کا حساب دینے کے لئے پہنچا دیا جاتا ہے۔

۷ ستمبر ۱۹۹۴

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما میرے نزدیک نہایت برے رہنما ثابت ہوئے ہیں۔ اصل رہنمائی یہ تھی کہ وہ جدید امکانات کو دریافت کرتے اور پھر مسلمانوں سے کہتے کہ تم مسائل کو نظر انداز کرو اور مواقع کو استعمال کرو۔ مگر ان رہنماؤں نے نہایت غیر دانشمندانہ طور پر مسلمانوں کو جنگ اور ٹکراؤ کے راستہ پر ڈال دیا، کسی نے براہ راست طور پر ٹکراؤ کی تعلیم دی اور کسی نے بالواسطہ طور پر۔ اس کے سوا ان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمان پچھلے تقریباً دوسو سال سے لڑنے بھڑنے میں یا لڑائی کی بات کرنے میں مشغول ہیں۔ ابتداءً یہ جنگ غلامی اور آزادی کے نام پر لڑی گئی۔ اس کی ایک مثال ہندستان ہے۔ اس کے بعد یہ جنگ نظامِ باطل کی جگہ نظامِ اسلام قائم کرنے کے نام پر ہونے لگی۔ اس کی ایک مثال مصر ہے۔ اب یہ جنگ تقسیم اقتدار کے لئے شروع ہو گئی ہے۔ جس کو افغانستان کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اس احمقانہ جنگ وجدال کا خاتمہ صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے ذہن کو دعوت کی طرف موڑ دیا جائے۔ دعوت کا عمل ہی ہر اعتبار سے مسلمانوں کے لئے صحیح ترین عمل ہے۔ میں اسی کے لئے ۲۵ سال سے کوشش کر رہا ہوں۔ مگر یہاں یہ شدید رکاوٹ حائل ہے کہ موجودہ زمانہ کے نا اہل مسلم مفکرین اور مسلم رہنماؤں نے جس انداز میں مسلمانوں کو حالات کا مطالعہ کرایا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب تمام قومیں مسلمانوں کو دشمن کے روپ میں دکھائی دینے لگی ہیں۔ وہ اپنی مدعو قوموں سے متنفر ہو گئے ہیں۔ اور داعی اگر اپنے مدعو سے متنفر ہو جائے تو اس کے اندر دعوت کا جذبہ ہی صحیح طور پر پیدا نہیں ہوگا۔

۸ ستمبر ۱۹۹۴

ابو جُرَیّ جابر بن سُلیم ایک صحابی ہیں۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔ آپ نے فرمایا: لَا تَسُبَّنَّ أَحَداً (ابوداؤد، ترمذی) یعنی تم کسی کو بھی ہرگز گالی نہ دو۔ صحابی کہتے ہیں کہ اس نصیحت کو میں نے اس طرح پکڑ لیا کہ

اس کے بعد میں نے کبھی کسی کو گالی نہیں دی، نہ کسی آزاد کو اور نہ کسی غلام کو اور نہ کسی اونٹ کو اور نہ کسی بکری کو۔

گالی کا ایک مطلب وہ ہے جس کے لئے یہ لفظ معروف ہے۔ مگر ایسے فحش کلمات صرف جاہل لوگ اپنی زبان سے نکالتے ہیں۔ زیادہ عام "گالی" وہ ہے جس کو الزام اور تنقیص کہا جاسکتا ہے۔ یعنی کسی کو برا بتانا بغیر اس کے کہ اس کی دلیل دی گئی ہو۔ کسی کے اوپر علمی تنقید کی جائے تو یہ جائز اور مفید ہے۔ لیکن اگر کسی کے خلاف محض الزامی ریمارک دیا جائے۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ وہ اسلام دشمن طاقتوں کا آلۂ کار ہے، تو یہ گالی ہے، بلکہ گالی سے بھی زیادہ برا۔

۹ ستمبر ۱۹۹۴

ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) کے پروفیسر سموئل ہنٹنگٹن (Samuel Huntington) کا ایک آرٹیکل فارین افیرس کے شمارہ ستمبر ۱۹۹۳ میں چھپا تھا۔ اس کا عنوان تھا تہذیبوں کا تصادم (clash of civilisations) اس آرٹیکل کا ایک جزو لندن کے ہفت روزہ دی اکونومسٹ (۶ اگست ۱۹۹۴) نے نقل کیا ہے۔ اس میں انھوں نے کہا کہ اسلام خونیں سرحدیں رکھتا ہے :

Islam has bloody borders.

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کے پڑوس میں ہوں ان کے لئے امن کی زندگی ممکن نہیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ جس اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ واللہ لا یؤمن واللہ لا یؤمن واللہ لا یؤمن الذی لا یأمن جارہ بوائقہ۔ اس اسلام کے بارہ میں کہنے والے ایسی بات کہہ رہے ہیں۔ مگر اس کا حل یہ نہیں ہے کہ اس کو ہم دشمن کا مخالفانہ پروپگنڈا کہہ کر اس کے خلاف شور وغل کریں۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ اسلام کو اور مسلمان کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے۔ یہ اقرار کیا جائے کہ اسلام پرامن ہمسائگی کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر کسی مقام پر مسلمانوں کے پڑوسیوں کو مسلمانوں سے تشدد کا تجربہ ہو تو اس کی ذمہ داری مسلمانوں پر ہے نہ کہ اسلام پر۔

۱۰ ستمبر ۱۹۹۴

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اسلامی احکام کی جو ترتیب نزول ہے، وہی ان احکام کی ترتیب تکلیف بھی ہے۔ یعنی دور اول میں جن حالات میں جو احکام اترے وہ حالات جن مسلمانوں کے ہوں، وہ ان احکام کے مکلف ہوں گے۔ بقیہ احکام ان کے لئے عملی طور پر اسی طرح منسوخ رہیں گے جس طرح وہ دور اول کے مسلمانوں کے لئے منسوخ یا غیر مطلوب رہے۔ کوئی حکم نہ ابدی طور پر منسوخ ہے اور نہ کوئی حکم غیر منسوخ۔ یہ سارا معاملہ (applicability) کے اوپر منحصر ہے۔ جو حکم حالات کے اعتبار سے قابل عمل ہے وہ غیر منسوخ ہے اور جو حالات کے اعتبار سے ناقابل عمل ہے وہ منسوخ۔ گویا نسخ کا سارا معاملہ مکلف کے اعتبار سے ہے نہ کہ عمومی طور پر شریعت کے اعتبار سے۔

۱۱ ستمبر ۱۹۹۴

۱۴ھ (۶۳۶ء) میں مسلمان ایرانی علاقہ میں داخل ہو رہے تھے۔ ایران کے فوجی سربراہ رستم نے مسلمانوں کو گفت وشنید کی دعوت دی۔ مسلم فوج کے سربراہ سعد بن ابی وقاص نے اس سلسلہ میں کئی وفود رستم کے پاس بھیجے۔ اس میں سے ایک ربعی بن عامر الطائی تھے۔ ربعی بن عامر رستم کے دربار میں بے خوف داخل ہوئے۔ رستم کے سوال پر انھوں نے جو تقریر کی، اس کا ایک حصہ یہ تھا کہ اللہ ہم کو یہاں لایا ہے، اور وہ اس لئے لایا ہے تاکہ ہم لوگوں کو دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا کی وسعت میں لے آئیں (ان اللہ جاء بنا لنخرج الناس من ضیق الدنیا الی سعتھا، البدایہ والنہایہ ۳۹/۷) یہ گفتگو القادسیہ میں ہوئی جو اب عراق میں شامل ہے (۱/۲۷۳)

دنیا تمام وسعتوں کے باوجود کیوں تنگ ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ لوگ پہاڑ کو بڑا سمجھ لیں تو سمندر کو بڑا سمجھنے والے انھیں اپنے سے الگ دکھائی دیں گے۔ کچھ لوگ سفید فام نسل کو اونچا فرض کر لیں تو وہ سیاہ فام نسل سے جدا ہو جائیں گے۔ اس طرح انسانیت بے شمار ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہے۔ جاہلیت کی حالت میں لوگ غیر مشترک بڑائیوں

میں بٹے ہوئے ہیں۔ مگر جب وہ توحید کو پاتے ہیں تو سب کے سب ایک ہی مشترک بڑائی کے سایہ میں آجاتے ہیں۔ سب ایک ہی عظیم تر حقیقت میں یکساں طور پر جینے لگتے ہیں۔

۱۲ ستمبر ۱۹۹۴

لاہور کے روزنامہ نوائے وقت کا شمارہ ۲۷ جولائی ۱۹۹۴ میرے سامنے ہے۔ اس کے صفحہ اول کی پہلی خبر کی جلی سرخی یہ ہے: فرقہ وارانہ کشیدگی میں غیر ملکی ہاتھ ہے، صدر فاروق احمد لغاری۔ اس کے نیچے دوسری سرخی ہے: برانڈرتھ روڈ (لاہور) پر بنک میں ڈاکہ، ۴۳ افراد کو یرغمال بنا کر ۶۰ لاکھ روپے لوٹ لئے۔

پاکستانی اخباروں میں ہر روز اس قسم کی خبریں چھپتی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں فرقہ وارانہ ٹکراؤ زوروں پر ہے۔ اسی کے ساتھ لوٹ مار بھی انتہائی حد تک بڑھی ہوئی ہے۔ یہ فرقہ وارانہ ٹکراؤ کن لوگوں کے درمیان ہے۔ وہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نہیں ہے بلکہ مسلمانوں اور مسلمانوں کے درمیان ہے۔ اسی طرح لوٹنے والے کس کا مال لوٹ رہے ہیں۔ وہ غیر مذہب والوں کا مال نہیں لوٹ رہے ہیں بلکہ مسلمان خود مسلمانوں کا مال لوٹنے میں مصروف ہیں۔

علامہ اقبال اور مسٹر جناح جیسے لوگوں نے یہ سمجھا تھا کہ سارے مسائل کی جڑ مسلمانوں اور ہندوؤں کا مشترک ملک ہے۔ اگر دونوں کے ملک الگ الگ بنا دئے جائیں تو اس قسم کے تمام مسائل اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔ اس نظریہ کے تحت غیر معمولی قربانی کے ذریعہ پاکستان بنایا گیا۔ مگر جب پاکستان بن گیا تو وہی تمام جھگڑے شدید تر انداز میں خود مسلمانوں اور مسلمانوں کے درمیان جاری ہو گئے جو پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نسبتاً کمی کے ساتھ ہو رہے تھے۔

۱۳ ستمبر ۱۹۹۴

۱۲ ستمبر کو میں اٹلی میں تھا۔ وہاں نصرت کے عجیب و غریب تجربات ہوئے۔ مثلاً میں اس اندیشہ میں تھا کہ شاید ایرپورٹ پر کوئی میری مدد کے لئے موجود نہ ہوگا۔ اور میں

سخت مصیبت میں پڑ جاؤں گا۔ مگر روم کے ایرپورٹ پر جب میں جہاز سے باہر نکلا تو عین دروازہ پر ایرپورٹ کی ایک خاتون کارکن میری مدد کے لئے موجود تھی۔ کچھ دور آگے لے جا کر اس نے مجھے ایک اور خاتون کے حوالے کیا۔ پھر اس نے مجھے وی آئی پی لاؤنج میں پہنچایا۔ جہاں میرے مساعد ڈاکٹر اندریہ دلو کا میرے منتظر تھے۔ اور وہاں ہر طرح کا سامان موجود تھا۔ پھر وہاں سے نکلے تو کئی بند دروازے سے گزرنا تھا۔ مجھے کچھ کہنا نہیں پڑا۔ ایک آدمی کنجی لئے ہوئے اپنے آپ ہر دروازہ کھولتا چلا گیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر دلو کا نے مجھے ایک جرمن کار پر بٹھایا۔ اس کار پر مجھے ڈھائی گھنٹہ کا سفر طے کرکے اسپین پہنچنا تھا۔ کار اتنی تیزی سے چلی کہ وہ راستہ کی تمام کاروں کو پیچھے چھوڑتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ سب سے آگے نکل کر مجھ کو منزل پر پہنچایا۔

اس تجربہ کے بعد میں بے اختیار رو پڑا۔ میری زبان سے نکلا کہ خدایا، روم کے اس واقعہ کو میرے لئے اس بات کی علامت بنا دیجئے کہ اسی طرح آپ میرے ساتھ ہر جگہ معاملہ فرمائیں گے۔ دنیا سے لے کر آخرت تک کے تمام مراحل آپ کی مہربانی سے شاندار طور پر میرے لئے طے ہوتے چلے جائیں گے۔

۱۴ ستمبر ۱۹۹۴

بمبئی میں کچھ مسلمانوں نے بام بلاسٹ پر خوشی کا اظہار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح انھوں نے ہندوؤں کو خوب سبق سکھایا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ سوچ صحیح نہیں۔ اسلام کا یہ طریقہ نہیں کہ تخریب کے ذریعہ کسی کو سبق سکھایا جائے۔ چنانچہ اس کا الٹا نقصان خود مسلمانوں کو پہنچا ہے۔

پولیس کو اس سے موقع ملا کہ وہ ٹاڈا (TADA) کے بے رحمانہ قانون میں مسلمانوں کو پیسے۔ جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ پولیس نے مسلمانوں کو خوف زدہ کرکے ان سے تقریباً ۲۵ کروڑ روپے وصول کئے ہیں۔ اس کے بعد ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کے خلاف جو انتقامی جذبہ پیدا ہوا، اس کا نقصان خاموش انداز میں جگہ جگہ مسلمانوں کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اور سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس کے نتیجہ میں داعی اور

مدعو کے درمیان جو نفرت پیدا ہوئی اس نے مدت دراز کے لئے دعوت کے مواقع ختم کردئے۔

۱۵ستمبر ۱۹۹۴

کچھ مسلمانوں کے سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دور پریس سے پہلے پیدا ہوئے۔ آپ کی باتوں کا ریکارڈ کرلے کے لئے اللہ تعالی نے دو کم عمر افراد منتخب کئے تاکہ وہ آپ کی زندگی میں آپ کی باتوں کو اخذ کریں اور آپ کی وفات کے بعد دیر تک اس کو انسانوں تک پہنچاتے رہیں۔ چنانچہ یہ لوگ آپ کی وفات کے بعد پچاس سال تک آپ کے لئے زندہ ٹیپ ریکارڈ بنے رہے۔

ان دو صاحبان میں ایک ابو ہریرہؓ تھے اور ایک عائشہؓ۔ ابو ہریرہؓ کی عمر اس وقت ۲۵ سال تھی جب کہ وہ آپ کے ساتھی بنے۔ عائشہ کی عمر تقریباً ۱۰ سال تھی جب کہ وہ آپ کی زوجہ کی حیثیت سے آپ کے ساتھ رہنے لگیں۔ ابو ہریرہ کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ چنانچہ انھوں نے کثرت سے حدیثیں یاد کرلیں۔ ان کی روایات کی تعداد ۵۳۷۴ بتائی گئی ہے۔ عائشہ غیر معمولی ذہین تھیں۔ چنانچہ انھوں نے حکمت نبوت کو اخذ کیا۔ ان کے استنباطات یا فتاوی فہم دین کے سلسلہ میں انتہائی اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۶ستمبر ۱۹۹۴

۱۶ ستمبر کو میں بمبئی میں تھا۔ بمبئی میں الرسالہ تیزی سے پھیلا تھا۔ مگر جب میں آر ایس ایس اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے اجتماع میں گیا تو مخالفین نے اس کو خوب استعمال کیا۔ میرے خلاف پروپگنڈا کیا گیا کہ وہ تو آر ایس ایس کے ایجنٹ بن گئے۔ اس طرح مسلمانوں کو بھڑکا دیا گیا۔ اس جھوٹے پروپگنڈے میں اردو اخباروں نے نمایاں رول ادا کیا۔

کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمان فخر کے ساتھ لکھتے اور بولتے ہیں کہ ہمارے رسول مشرکوں اور کافروں کے اجتماع میں گئے تاکہ ان کو حق کی بات پہنچائیں۔ لیکن موجودہ زمانہ میں ایک مسلمان اگر اس سنت رسول پر عمل کرے تو تمام مسلمان بھڑک اٹھتے ہیں۔ اسلام موجودہ مسلمانوں کے درمیان کتنا زیادہ اجنبی ہوگیا ہے۔ اسلام کو جاننے والے بھی اسلام کو نہیں پہچانتے۔

۱۷ستمبر ۱۹۹۴

ٹکراؤ کی سیاست سراسر غیر اسلامی ہے۔ ملکۂ سبا کے قصہ کے مطابق، پہلی عقلمندی یہ ہے کہ آدمی اطاعت کی روش اختیار کرکے ٹکراؤ سے بچے۔ اس طرح وہ فساد اور خوں ریزی اور ذلت کے انجام سے محفوظ رہے گا۔ (النمل ۳۴)

آدمی اگر یہ عقلمندی نہ کر سکے تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ ٹکراؤ کے نتیجے میں جب نقصان کی نوبت آئے تو وہ اس کو فریق ثانی کا ظلم قرار دے کر اس کے خلاف چیخ پکار نہ کرے۔ بلکہ لازم ہے کہ اس کے اندر تضرع کی کیفیت پیدا ہو۔ وہ خود احتسابی کے ذریعہ اپنی غلطیوں کو معلوم کرے۔ وہ اپنی کوتاہی کا اعتراف کرکے اپنی اصلاح میں لگ جائے۔ (الانعام ۴۳)

۱۸ستمبر ۱۹۹۴

ایک کشمیری نے کہا کہ ہم لوگ ذہنی طور پر اس کے لئے تیار ہو چکے تھے کہ انڈین یونین کا حصہ بن کر رہیں۔ مگر ۱۹۸۷ کے الکشن میں جب کہ دہلی میں راجیو گاندھی کی حکومت تھی، زبردست دھاندلی کرائی گئی۔ ہمارے مسلم یونائیٹڈ فرنٹ کے نمائندوں کو زبردستی ہرا کر ڈاکٹر فاروق عبد اللہ کو جتایا گیا۔ یہ کشمیری نوجوان جن کے ساتھ الکشن میں دھاندلی ہوئی تھی وہی سب سے پہلے پاکستان گئے اور وہاں سے فوجی ٹریننگ لیکر آئے۔ انھیں لوگوں نے اولاً ۱۹۸۹ میں سرینگر میں بم مار کر بھارت کے خلاف جنگ کا آغاز کیا۔

میں نے کہا کہ آپ کی سیاسی اور فوجی بغاوت کے لئے یہ عذر بالکل ناکافی ہے۔ اسلام میں اس کی گنجائش نہیں۔ اگر دیکھئے تو حضرت معاویہ نے بھی آپ کی زبان میں اسی قسم کی زیادہ بڑی دھاندلی کی تھی۔ انھوں نے خود اپنی زندگی میں طاقت کے زور پر اپنے بیٹے یزید کی خلافت کے لئے بیعت لی۔ اسی بیعت کے مطابق حضرت معاویہ کی وفات کے بعد یزید کو خلیفہ بنایا گیا۔ اس وقت بہت بڑی تعداد میں صحابہ اور تابعین موجود تھے۔ مگر تمام لوگوں نے اس "سیاسی دھاندلی" کو قبول کر لیا۔ اسی طرح آپ لوگوں کو بھی مذکورہ انتخابی دھاندلی کے باوجود گن کلچر نہیں چلانا تھا، بلکہ سیاسی اقتدار کے باہر جو مواقع کار

کھلے ہوئے تھے ان میں کام کرنا تھا۔ مثلاً ایجوکیشن اور تعمیر و ترقی کے دوسرے کام۔ آپ کے لئے جائز اور معقول طریقہ صرف ترقی کلچر ہے نہ کہ گن کلچر۔

۱۹ ستمبر ۱۹۹۴

سرینگر (کشمیر) کے مولانا محمد ابین سلفی ندوی سے میں نے کہا کہ قرآن کے مطابق، مسلمانوں پر ہونے والے مظالم خود ان کی اپنی کوتاہیوں کا نتیجہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ مسلمان اغیار کی سازشوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ قرآن میں ہے کہ اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو تو لوگوں کی سازشیں تم کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچائے گی (آل عمران ۱۲۰) اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دوسروں کی سازشیں کا نقصان مسلمانوں کو صرف اس وقت پہنچتا ہے جب کہ مسلمانوں میں صبر و تقویٰ کی صفت نہ رہے۔ ایسی حالت میں آپ لوگوں کو چاہئے کہ مسلمانوں میں صبر و تقویٰ کی صفت پیدا کریں نہ کہ دوسروں کی مفروضہ سازش کے خلاف شور مچائیں۔

۲۰ ستمبر ۱۹۹۴

محمد معراج الدین وانی (بارہ مولہ، کشمیر) سے کشمیر پر بات ہوئی۔ انھوں نے پوچھا کہ کشمیریوں کے لئے آپ کا پیغام کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میرا پیغام دو لفظوں میں یہ ہے کہ گن کلچر چھوڑو، دعوۃ کلچر اختیار کرو۔ میں نے کہا کہ دعوہ کلچر کا لفظ میں کسی محدود معنی میں نہیں بولتا۔ اس سے مراد تمام پرامن سرگرمیاں ہیں۔ مثلاً دعوت، تعلیم، کیرکٹر بلڈنگ، اسلامی تربیت، اقتصادی ترقی، معاشرتی اصلاح وغیرہ۔

۲۱ ستمبر ۱۹۹۴

مسٹر دلیپ چوبے اور مسٹر ارن پانڈے ہندی کے جرنلسٹ ہیں۔ دونوں ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے کہا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی دوبارہ "مسجد توڑو، مندر بناؤ" کی تحریک اٹھانے والی ہے۔ میں نے کہا کہ اب ایسا ممکن نہیں۔ اس لئے بھارتیہ جنتا پارٹی ہندوؤں کے سپورٹ کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اور اس اشو پر اب بھارتیہ جنتا پارٹی کو ہندوؤں کی سپورٹ نہیں مل سکتی۔ پھر آخر وہ کامیاب کس طرح ہوگی۔

میں نے کہا کہ ہندو اپنے "سرو دھرم سمبھاوا" کے نظریہ پر فخر کرتا تھا۔ یہ اس کا پرائڈ تھا۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بھارتیہ جنتا پارٹی والوں نے جب اجودھیا کی مسجد کو توڑا۔ تو انھوں نے سادہ طور پر صرف ایک عمارت کو نہیں توڑا، بلکہ انھوں نے ہندو کے پرائڈ کو توڑ دیا۔ اور کوئی بھی گروہ ایسے لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکتا جو اس کے پرائڈ کو توڑ ڈالے۔

۲۲ ستمبر ۱۹۹۴

محمد امین سلفی ندوی کشمیری ہیں اور سرینگر میں رہتے ہیں۔ انھوں نے کشمیری مسلمانوں پر بھارتی فوج کے مظالم کا ذکر کیا۔ میں نے پوچھا کہ کبھی آپ کو خود کریک ڈاؤن کا تجربہ ہوا۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیوں۔ کہنے والے تو کہتے ہیں کہ سارے کشمیری ہمیشہ کریک ڈاؤن کی زد میں رہتے ہیں، پھر آپ کیسے بچے ہوئے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ سرینگر میں کریک ڈاؤن کے جو واقعات ہوتے ہیں وہ ہمیشہ ڈاؤن ٹاؤن میں ہوتے ہیں جو کہ گھنی آبادی کی وجہ سے جنگجوؤں کے لئے ہائڈ آؤٹ کا کام کرتے ہیں۔ اور میں سرینگر کی ایک کالونی (اقبال آباد) میں رہتا ہوں۔ کالونیوں میں چونکہ کھلے مکانات اور کھلی سڑکیں ہوتی ہیں، اس لئے وہاں کریک ڈاؤن نہیں ہوتا۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندستانی فوجیوں کا "ظلم" مشتبہ کشمیریوں کے خلاف ہوتا ہے نہ کہ ہر کشمیری کے خلاف۔ ان کی دشمنی جنگجو کشمیریوں سے ہے نہ کہ ہر اس شخص سے جو کشمیری ہو۔

۲۳ ستمبر ۱۹۹۴

مسلمانوں کی حکومت ہندستان میں ۱۲۰۶ء میں قائم ہوئی۔ مگر مسلم حکمرانوں کو کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ قرآن کا ترجمہ ملکی زبان میں کرائیں۔ پہلا ترجمہ قرآن فارسی زبان میں شاہ ولی اللہ دہلوی نے ۱۷۴۰ء میں کیا۔ مگر اس وقت کے مسلمانوں کے لئے وہ اتنا اجنبی تھا کہ وہ شاہ صاحب کے قتل کے درپے ہوگئے۔ اس کے بعد ۱۸۰۵ء میں قرآن کا پہلا اردو ترجمہ شاہ عبد القادر صاحب نے کیا۔ ہندی زبان میں قرآن کا پہلا ترجمہ ۱۹۲۶ء میں خواجہ حسن نظامی نے کیا۔

دوسری طرف انگریزوں نے ۱۷۷۲ء میں ہندستان میں اپنا اقتدار قائم کیا۔ اس کے بعد انگریزی حکومت نے خود اپنی نگرانی میں ۱۷۹۲ میں پوری بائبل کا ترجمہ بنگلہ زبان میں شائع کردیا۔ ۱۸۰۶ء میں حکومت کی سرپرستی میں بائبل کا ترجمہ فارسی زبان میں کرایا گیا۔ ۱۸۴۰ء میں مرزاپور سے بائبل کا اردو ترجمہ شائع ہوا۔ اور اس کے جلد ہی بعد انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ شائع ہوگیا۔ آج بائبل کا ترجمہ ہندستان کی تمام قابل ذکر زبانوں میں موجود ہے۔ مسیحی دنیا کی ۷۶۵ زبانوں میں بائبل کے ترجمے شائع کرچکے ہیں۔

۲۴ ستمبر ۱۹۹۴

آج جامعہ ملیہ اسلامیہ میں سیرت النبی کا جلسہ تھا۔ موضوع تھا: آفاقی قدریں سیرت کی روشنی میں۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمۃ للعالمین ہونے کا ایک پہلو یہ ہے کہ آپ نے تقسیمی طرز فکر سے انسان کو نجات دی۔ لوگ ہمیشہ انسانوں کو کالے اور گورے، دوست اور دشمن، موافق اور مخالف، اپنے اور غیر کے خانوں میں بانٹتے رہے ہیں۔ آپ نے اپنے قول اور عمل سے دکھایا کہ یہ تقسیم درست نہیں۔

ایک دشمن بھی اچھے سلوک کے بعد دوست بن جاتا ہے۔ حسن تدبیر کے ذریعہ آپ بظاہر مخالف آدمی کو بھی موافق آدمی میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ ہر آدمی کے اندر ایک ہی فطرت ہے۔ فرق ہمیشہ ظاہری سطح پر ہوتا ہے۔ ظاہری فرق کو ہٹانے کے بعد وہ اسی طرح ایک انسان ہے جس طرح آپ خود ایک انسان ہیں۔

۲۵ ستمبر ۱۹۹۴

زبیر ملک فلاحی صاحب ملاقات کے لئے آئے۔ وہ لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ انھوں نے دسمبر ۱۹۹۳ء کا ایک واقعہ بتایا جو ان کے اور طارق فلاحی صاحب کے ساتھ پیش آیا تھا (واضح ہو کہ دونوں نوجوان ہیں)۔ دونوں اپنے اسکوٹر پر بیٹھ کر ہندی اخبار "آج" کے دفتر میں گئے۔ وہاں ان کو ایک پریس نوٹ دینا تھا۔ آج کا دفتر اوپر کی منزل پر ہے۔ جب وہ پریس نوٹ دے کر نیچے اترے تو اسی وقت دو اور ہندو نوجوان

سیڑھی سے اترے۔ سڑک پر پہنچ کر زبیر صاحب اور طارق صاحب اپنے اسکوٹر پر بیٹھ کر اس کو اسٹارٹ کرنے لگے۔

ان کے اسکوٹر پر اس کا نمبر (۱۳۳۵) اردو میں لکھا ہوا تھا۔ اس نمبر پلیٹ کو دیکھ کر ایک ہندو نوجوان نے دوسرے ہندو سے کہا کہ جانتے ہو یہ کس بھاشا میں لکھا ہوا ہے۔ دوسرے ہندو نوجوان نے جواب دیا کہ مجھ کو نہیں معلوم۔ مذکورہ ہندو نے دوبارہ کہا کہ یہ نمبر پلیٹ پاکستانی بھاشا میں ہے۔ مذکورہ ہندو نے دوبارہ اپنے ساتھی سے کہا، کیا تم اس کا ارتھ جانتے ہو۔ اس نے پھر کہا کہ نہیں۔ ہندو نوجوان نے کہا: اس کا ارتھ ہے "میرا پاکستان مہان"۔

ایک مسلمان اس واقعہ کو سن کر غصہ ہوگا۔ مگر مجھے غصہ نہیں آیا۔ میں نے سوچا کہ یہ مزاج دراصل تقسیم اور دو قومی سیاست کا نتیجہ ہے۔ پاکستان کا ہندو اگر اپنے اسکوٹر پر ہندی میں نمبر پلیٹ لگائے تو وہاں اس کو بھی برعکس صورت میں یہی سننا پڑے گا۔ اس کا حل کیا ہے۔ اس کا حل غصہ ہونا یا لڑنا ہے۔ اس کا حل سادہ صرف یہ ہے کہ پاکستان کے ہندو جس طرح اپنی گاڑی پر ہندی میں اس کا نمبر نہیں لکھتے۔ اسی طرح انڈیا کے مسلمان اپنی گاڑی پر اردو میں نمبر نہ لکھیں۔ موجودہ حالات میں اس مسئلہ کا دوسرا کوئی بھی حل ممکن نہیں۔

۲۶ ستمبر ۱۹۹۴

ایک تعلیم یافتہ ہندو نے ہندستان کے کچھ مسلم بادشاہوں کے ظلم کا ذکر کیا۔ اور اس کی بنیاد پر کہا کہ اسلام ایک تشدد پسند مذہب ہے۔ میں نے کہا کہ اسلام الگ ہے اور مسلمان الگ۔ کچھ مسلمانوں کے فعل کی بنا پر آپ اسلام کو برا نہیں کہہ سکتے۔ انھوں نے کہا کہ عام آدمی اس فرق کو کیا جانے۔ وہ تو مسلمانوں کو دیکھ کر اسلام کے بارہ میں رائے قائم کرے گا۔ میں نے کہا کہ آپ کو آزادی ہے کہ آپ مسلمانوں کے عمل کی بنیاد پر اسلام کی بابت رائے قائم کریں۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر آپ اس کے لئے بھی آزاد ہیں کہ اسلام کی بنیاد پر خود مذہب کے بارہ میں رائے قائم کریں اور کسی چیز کو اسلام میں بتا کر یہ کہیں کہ دنیا کا ہر مذہب ایسا ہی ہے۔ مگر یہ سائنٹفک طریق فکر نہیں۔

۲۷ ستمبر ۱۹۹۴

ڈاکٹر مہیش شرما کا تعلق آر ایس ایس سے ہے۔ وہ اس کے قائل ہیں کہ ہندستان اور پاکستان کا بٹوارہ غلط تھا۔ پورے برصغیر کو دوبارہ ایک مملکت بننا چاہئے۔ انھوں نے ایک ملاقات میں کہا: اگر وبھاجن ختم نہ ہو تو ہندو اور مسلمان کو کوئی جوڑ نہیں سکتا۔ اور اگر وبھاجن ختم ہو جائے تو کوئی ہندو اور مسلمان کو توڑ نہیں سکتا۔

۲۸ ستمبر ۱۹۹۴

۸ھ میں وہ واقعہ پیش آیا جس کو اسلام کی تاریخ میں غزوۂ موتہ کہا جاتا ہے۔ صحابہ کی یہ جماعت جب منزل پر پہنچی تو معلوم ہوا کہ دشمن کی تعداد غیر معمولی طور پر زیادہ ہے۔ چنانچہ صحابہ کو جنگ کرنے میں تامل ہوا۔ اس وقت حضرت عبد اللہ بن رواحہ نے پر جوش تقریر کی، اور کہا کہ ہمارا مقصد تو شہادت ہے نہ کہ فتح۔ اس کے بعد صحابہ نے جنگ کی طرف اقدام کیا۔ لیکن جنگ میں ایک کے بعد ایک تین مسلم سردار شہید ہو گئے —— جعفر ابن ابی طالب، زید بن حارثہ، عبد اللہ بن رواحہ۔ اس کے بعد حضرت خالد کو سردار بنایا گیا۔ انھوں نے حالات کا از سر نو جائزہ لینے کے بعد واپسی کا فیصلہ کیا۔

حضرت عبد اللہ بن رواحہ کے قول کے مطابق، اگر شہادت مطلق طور پر مطلوب ہو تو حضرت خالد کی یہ واپسی سراسر غلط اور فرار کے ہم معنی تھی۔ مگر جب یہ لوگ مدینہ پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد کے فعل کی تصویب فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عبد اللہ بن رواحہ کی بات مطلق معنوں میں درست نہ تھی۔ وہ صرف ایک وقتی جذبہ کا اظہار تھا نہ کہ مطلق حکم کا بیان۔

۲۹ ستمبر ۱۹۹۴

جناب شفیع الدین صاحب ایم اے کا ٹیلیفون آیا۔ انھوں نے کہا کہ اکتوبر کا الرسالہ پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ آپ کا پرچہ یک سُری (monotonous) ہو گیا ہے۔ ہر پرچہ میں بس صبر و اعراض کی بات رہتی ہے۔ گویا کہ اسلام میں اور کوئی تعلیم نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ متعین طور پر بتائیں کہ اسلام کی کون سی بات الرسالہ میں نہیں ہوتی۔ انھوں نے کہا کہ مثال کے

طور پر جسٹس (عدل)

ٹیلی فونی گفت گو ختم ہوئی تو میں نے ۱۹۹۴ کے شمارے دیکھنا شروع کیا۔ معلوم ہوا کہ جزئی طور پر یا بالواسطہ انداز میں تو عدل وانصاف کی بات ہر پرچہ میں ہوتی ہے۔ اور جنوری ۱۹۹۴ کے شمارہ میں "اسلام میں عدل" کے عنوان سے ۲۲ صفحہ کا ایک مفصل مقالہ چھپ چکا ہے۔ نیز یہ مضمون انگریزی الرسالہ میں بھی مکمل طور پر چھپا ہے۔

آدھ گھنٹہ کے بعد میں نے دوبارہ انھیں ٹیلیفون کرکے بتایا۔ ان کو چاہئے تھا کہ وہ فوراً اپنا اعتراض واپس لے لیں۔ مگر انھوں نے ایک اور بات کہہ دی۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے نظام الدین میں درگاہ ہے۔ وہاں قبر پرستی جیسی برائی موجود ہے۔ اس پر آپ نے الرسالہ میں کیا لکھا۔ جو لوگ اس طرح عدم اعترافی کا مزاج رکھتے ہوں ان کو کسی بھی دلیل سے مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔

۳۰ ستمبر ۱۹۹۴

ایک سواری پر بیٹھتے ہوئے خیال آیا کہ بڑھاپا بھی ایک سواری ہے جو آدمی کو آگے لے جانے کے لئے آتی ہے۔ بڑھاپے کا آنا گویا موت کی سواری میں داخل ہونا ہے۔ ۷۱ سال کا ہو کر اب میں موت کی طرف جانے والی سواری میں داخل ہو چکا ہوں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ سواری مجھ کو کس صحرا یا بیابان میں لے جا کر اتارے گی۔

یکم اکتوبر ۱۹۹۴

قرآن میں ہے کہ کچھ لوگوں کو آخرت میں عذاب اکبر (الغاشیہ ۲۴) دیا جائے گا۔ اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ کچھ اور لوگ ہوں گے جن کے لئے عذاب اصغر کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اسی طرح قرآن میں اور بھی آیتیں ہیں جس میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ قابل گرفت لوگوں کے عذاب میں فرق ہوگا۔ میرا احساس یہ ہے کہ جو لوگ زیادہ بڑے مجرم ہوں گے وہ تو جہنم کے گڑھے میں ڈال دئے جائیں گے۔ مگر چھوٹے جرموں کی سزا بھی چھوٹی ہوگی۔ میرا قیاس یہ ہے کہ آخرت میں تین گروہ ہوں گے ـــــ جہنمی، جنتی اور غیر جنتی۔ یہ تیسرا گروہ وہ ہے جس کو نہ جنت میں داخل کیا جائے گا اور نہ جہنم میں۔ اس کو حسرت کی زندگی گزارنے کے لئے یونہی

چھوڑ دیا جائے گا۔

۲ اکتوبر ۱۹۹۴

۲ اکتوبر کو میں بمبئی میں تھا۔ آج شام کو الرسالہ کے ایک ہمدرد نے ایک ہوٹل میں ایک میٹنگ رکھی۔ اس میں سب تعلیم یافتہ حضرات شریک تھے۔ اجتماع میں دو عالم بھی موجود تھے۔ میں از راہ اخلاق دونوں کو اسٹیج پر بٹھایا۔ میری تقریر کے بعد ایک عالم تو خاموش رہے۔ دوسرے عالم نے کھڑے ہو کر میرے خلاف تقریر شروع کر دی۔

یہ ایک بے ربط تقریر تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کو خود بھی نہیں معلوم کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ تاہم مجھے ان کی تنقید پر کوئی احساس نہیں ہوا۔ البتہ یہ بات میرے لئے بہت زیادہ تعجب کی تھی کہ یہ لوگ آداب مجلس سے بھی واقف نہیں۔ یہ آداب مجلس میں سے ہے کہ آدمی اگر اسٹیج پر بیٹھے تو وہ اسٹیج کے خلاف نہ بولے۔ اور اگر اس کو اسٹیج کے خلاف بولنا ہے تو اس کو چاہئے کہ وہ سامعین کے درمیان آکر بیٹھے۔

۳ اکتوبر ۱۹۹۴

۲۹ ستمبر کے تحت جناب شفیع الدین ایم اے کی ایک گفتگو نقل کی گئی ہے۔ اب انھوں نے دوبارہ ٹیلیفون کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے الرسالہ کا مذکورہ شمارہ پڑھا۔ مگر وہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کس طرح عدل قائم کرتا ہے۔ جبکہ میرا مدعا یہ ہے کہ عدل حاصل کرنے کے لئے اسلام میں کیا طریقہ بتایا گیا ہے۔ ہندستان میں ہم receiving end پر ہیں۔ پھر یہاں ہم کس طرح عدل وانصاف حاصل کریں۔

میں نے کہا کہ اس موضوع پر تو اور بھی مضامین الرسالہ میں ہوتے ہیں۔ بلکہ الرسالہ کا خاص مقصد ہی مسلمانوں کو یہ بتانا ہے کہ وہ اس دنیا میں کس طرح اپنا جائز حق حاصل کر سکتے ہیں۔ الرسالہ میں اس کا راز حکمت و تدبیر بتایا جا رہا ہے۔ آپ جیسے لوگوں کے ذہن پر دھینگا مشتی والا طریقہ چھایا ہوا ہے، اس لئے الرسالہ میں یہ بات آپ کو دکھائی نہیں دیتی۔

۴ اکتوبر ۱۹۹۴

قومی آواز (۸ استمبر ۱۹۹۴) کے ہفتہ وار ضمیمہ میں سینئر پاکستانی جرنلسٹ الطاف گوہر کا تجزیہ چھپا ہے۔ یہ پاکستانی اخبار سے نقل کیا گیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ میاں نواز شریف کی مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری سے میں نے پوچھا کہ برادرم سرتاج عزیز صاحب، آپ کا سیاسی پروگرام کیا ہے۔ انھوں نے بے تکلف جواب دیا: اس (بے نظیر) حکومت کو گرانا (صفحہ ۳)

مسلمان اسی تخریبی سیاست میں پچھلے تین سو سال سے مشغول ہیں۔ ان لیڈروں کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ موجودہ حکومت کو اگر وہ ختم کر دیں تو اس کی جگہ ان کی اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی۔ اورنگ زیب ۲۵ سال تک دکن کے شیعہ حکمرانوں سے اسی وہم کے تحت لڑتا رہا۔ ۱۸۵۷ میں علماء ہند نے اسی مفروضہ کے تحت خونیں جنگ شروع کی۔ الاخوان المسلمون نے اسی خیال کے تحت اولاً شاہ فاروق کی حکومت کو اور اس کے بعد جمال عبدالناصر کی حکومت کو اپنا نشانہ بنایا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اسی تصور کے تحت پاکستان میں ایوب خاں اور ذوالفقار علی بھٹو کو ڈاؤن کرنے میں اپنی ساری طاقت لگادی۔ مگر کسی بھی لیڈر کی کوششوں کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کے سب نادانی کی چھلانگ تھی نہ کہ حقیقتہً کوئی اسلامی اقدام۔

۵ اکتوبر ۱۹۹۴

محمد سراج ساحل ایک ہندی جرنلسٹ ہیں۔ وہ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ آجکل دہلی میں روزنامہ راشٹریہ سہارا سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے ایک ملاقات میں بتایا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد لکھنؤ کے مسلمان غصہ میں تھے۔ اسی زمانہ میں ہندوؤں کا ایک جلوس مولوی گنج کے علاقہ میں نکلا۔ وہ سڑک سے گزرتا ہوا ہنومان مندر جا رہا تھا۔ جب وہ مسلم علاقہ میں پہنچا تو کچھ مسلم نوجوان نے اس پر پتھراؤ کر دیا۔ اس کے بعد فساد شروع ہو گیا۔

اس قسم کا پتھراؤ اتنا زیادہ لغو کام ہے کہ اس کی کوئی توجیہہ اس کے سوا سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ کہا جائے کہ یہ لوگ اولٰئک کالانعام بل ھم اضل کے درجہ میں

پہنچ چکے ہیں۔

۶ اکتوبر ۱۹۹۴

ستمبر میں سورت (گجرات) میں پلیگ پھوٹ پڑا۔ آس پاس کے مقامات پر بھی اس کے اثرات پڑے۔ اتفاق سے انھیں دنوں مجھے سفر کرنے کا موقع ملا۔ میں نے دیکھا کہ دہلی، بمبئی اور پونہ ہر جگہ مسلمان خوش ہو رہے ہیں۔ وہ اس کو ہندوؤں کے اوپر عذاب سمجھ رہے ہیں۔ انگریزی ہفت روزہ ریڈیئنس (۲ اکتوبر ۱۹۹۴) نے اس کو لعنت (curse) بتایا ہے اور اس کو دسمبر ۱۹۹۲ میں ہونے والے سورت کے فساد سے جوڑا ہے۔

سورت میں ہندو اور مسلمان دونوں آباد ہیں۔ وہاں جو پلیگ آیا اس میں دونوں فرقے کے لوگ یکساں طور پر زد میں آئے۔ ایسی حالت میں اس کو لعنت یا عذاب کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے اوپر تھا۔ پھر اس میں خوشی کی بات کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وبا پر مسلمانوں کے اندر تضرع پیدا ہونا چاہئے تھا، مگر سطحیت نے ان کے اندر سرکشی پیدا کر دی۔

۷ اکتوبر ۱۹۹۴

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوہ کا ایک قدیم شمارہ (۲۹ جولائی ۱۹۸۵) نظر سے گزرا۔ اس میں مسلمانوں کی حالت زار کو بتاتے ہوئے کہا گیا تھا کہ اے لوگو، اللہ کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔ کیا اس دین کا رب نہیں جو اس کی مدد کرے (ایھا الناس، ان الیأس من روح اللّٰہ کفر۔ أليس لهذا الدين رب يحميه)

میں سمجھتا ہوں کہ یہ جملہ کہنے کا حق عبد المطلب کو تھا، جنھوں نے معاملہ کو اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ہر ناخوشگوار بات پر مشتعل ہو کر لڑنے لگتے ہیں۔ گویا کہ وہ اپنا معاملہ خود اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو ایسا کہنے کا حق بھی نہیں۔ اور نہ اس قسم کے لوگوں کے ایسے الفاظ کی کوئی قیمت ہے۔

۸ اکتوبر ۱۹۹۴

کچھ مسلمانوں سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ کے دو بیٹے ہیں۔ ایک بیٹا

دس ہزار روپیہ مہینہ کماتا ہے اور دوسرا بیٹا کاہل ہے، وہ کچھ نہیں کرتا تو گھر کے اندر دونوں کا درجہ ایک نہیں ہوگا۔ آپ جذبۂ پدری کے تحت نہ کمانے والے کا نام عزت حسین اور کمانے والے کا نام فقیر حسین رکھ دیں تب بھی اصل صورت حال میں کوئی فرق پڑنے والا نہیں۔ یہی معاملہ سماج کا ہے۔ سماج میں بھی وہ شخص یا گروہ عزت پائے گا جو دوسروں کو دے۔ نہ دینے والا کبھی عزت کا مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

۹ اکتوبر ۱۹۹۴

آج دہلی میں ریزرویشن کے سوال پر مسلمانوں کا ایک سیمینار تھا۔ اس میں آنے والے کئی لوگ ملاقات کے لئے آئے۔ ناگپور کے جناب جلیل ساز سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہندستانی مسلمانوں کے مسئلہ کا حل دو چیز میں ہے۔ اور دونوں کا تعلق شعور سے ہے۔

اول، یہ جاننا کہ زندگی میں ہمیشہ حالات فیصلہ کن ہوتے ہیں نہ کہ الفاظ۔ جب انڈیا کا دستور بن رہا تھا تو ہندو لابی نے زبردست کوشش کر کے اس میں ایک مستقل دفعہ اس مضمون کی شامل کر دی کہ ہندی زبان پندرہ سال میں پورے ملک کی زبان بنا دی جائے گی۔ اسی طرح نوابوں اور راجاؤں کی لابی نے دستور میں یہ دفعہ بڑھوائی کہ ریاست کے الحاق کے معاوضہ میں ان کو مستقل پر یوی پرس دیا جائے گا۔ مگر ملک کے حقیقی حالات ان دونوں چیزوں کی موافقت میں نہ تھے۔ چنانچہ دونوں دستوری دفعات فضا میں اڑ گئیں۔

دوسری چیز وہ ہے جس کو قانون کی اصطلاح میں (contributory negligence) کہا جاتا ہے۔ سڑک پر حادثہ صرف ایک شخص کی غلطی کی بنا پر نہیں ہوتا۔ حادثہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ دوسرا آدمی اس کی غفلت یا غلطی میں کنٹری بیوٹ کرے۔ مثال کے طور پر اس مہینہ میں ہونے والا بنگلور کا فساد کنٹر یکنڈر ورسس پولیس تھا۔ مگر کچھ مسلمانوں نے مسجد سے جلوس پر پتھر پھینک کر غیر ضروری طور پر اس کو کنٹریکنڈر ورسس مسلم بنا لیا۔ مسلمان اگر اپنی طرف سے اس طرح کنٹری بیوٹ نہ کرتے تو وہ بالکل محفوظ رہتے۔ اپنے حصہ کی غلطی کو جاننا دوسرے کی غلطی کی اصلاح کا راز ہے۔

۱۰ اکتوبر ۱۹۹۴

قومی آواز (۱۰ اکتوبر) میں جناب سید حامد صاحب کا مضمون چھپا ہے جس کا عنوان ہے: ریزرویشن ہی ایک راستہ۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ہم لوگوں نے مرکزی حکومت سے عرصہ تک مذاکرات کے بعد اقلیتوں کے لئے کوچنگ اسکیم منظور کرائی۔ مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں میں مسلم طلبہ کی کوچنگ کے لئے مراکز کھولے گئے۔ یہ سارا انتظام حکومت کے خرچ پر کیا گیا۔ اس طرح مختلف مقامات پر ۸۳ مراکز قائم ہوگئے۔ مگر ۲۰ سالہ کوشش کے باوجود نتیجہ صفر رہا۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب بدستور ۲ فیصد باقی ہے، حالانکہ ملک کی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ۱۲ فیصد ہے۔

موصوف نے یہ تو بتایا کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب کتنا ہے۔ انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ کوچنگ کے مراکز سے جن مسلمانوں نے فائدہ اٹھایا اور وہ امتحانات میں کامیاب ہوئے، وہ کامیابی کے بعد اب کہاں ہیں۔ پہلی بات کے اعداد وشمار چھاپنا اور دوسری بات کے اعداد وشمار نہ چھاپنا سراسر غیر علمی طریقہ ہے۔ اس یک طرفہ جائزہ سے کبھی حقیقی صورت حال سامنے نہیں آسکتی۔

اصل یہ ہے کہ جو مسلمان تعلیم گاہوں سے کوالی فیکیشن لے کر نکلتے ہیں۔ ان کی زیادہ تعداد باہر چلی جاتی ہے۔ کچھ لوگ برطانیہ اور امریکہ کا رخ کرتے ہیں۔ اور کچھ عرب ممالک میں اپنے لئے روزگار پالیتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہاں کی سروسوں میں مسلمانوں کا تناسب کیوں کر بڑھ سکتا ہے۔

۱۹۴۷ میں بڑی تعداد میں تعلیم یافتہ یا برسر ملازمت مسلمان پاکستان چلے گئے۔ اس کے بعد بھی مذکورہ صورت میں خروج کا یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ ہم مسئلہ کی جڑ کو سمجھیں نہ کہ شکایتی مضامین چھاپ کر مسلمانوں کو پست ہمت کرتے رہیں۔

۱۱ اکتوبر ۱۹۹۴

ناگپور کے جناب جلیل ساز صاحب ملاقات کے لئے آئے۔ ان کے ساتھ بلڈانہ

کے دو آدمی تھے۔ بلڈانہ کے ایک مسلم وکیل نے بتایا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جب بابری مسجد ڈھائی گئی تو ۷ دسمبر کو کچھ مسلمان سڑکوں پر نکل پڑے۔ انھوں نے ایک طرف سے دکانیں بند کروانا شروع کیا۔ ہندو اپنی دکان بند کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس پر ان مسلمانوں کی ہندوؤں سے تکرار ہونے لگی۔ ایک پولیس انسپکٹر وہاں آگیا۔ اس نے مسلمانوں سے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ اگر آپ لوگ ہندوؤں کی دکان بند کروانا چاہتے ہیں تو ان کو کہہ سن کر راضی کرنے کی کوشش کیجئے۔ ان سے اس کے لئے زبردستی نہ کیجئے۔ ورنہ فضا اور خراب ہو جائے گی۔ مسلم نوجوان جوش میں تھے انھوں نے پولیس انسپکٹر کو پتھر مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اس کا سر ٹوٹ گیا۔ وہ اسی حالت میں بھاگ کر پولیس اسٹیشن گیا۔ وہاں پولیس افسر نے جب یہ منظر دیکھا تو وہ غصہ سے بیتاب ہو گیا۔ اس نے کہا کہ مارو ان مسلمانوں کو۔ اس کے بعد پولیس نے مسلمانوں کو مارنا شروع کیا اور اتنا برا حال کیا کہ آج تک بھی وہ سر اٹھانے کے قابل نہیں۔

آجکل مسلمانوں میں یہ برائی عام ہے کہ ہر آدمی اپنے کو لیڈر سمجھتا ہے۔ بلڈانہ کے یہ مسلمان اگر شہر کے کسی بڑے بوڑھے کو اپنا لیڈر مانتے اور اس سے جاکر پوچھتے تو وہ کبھی اس قسم کے مظاہرے کی اجازت نہ دیتا۔ مگر یہ لوگ خود ہی جوش میں آکر نکل پڑے۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۹۴

مکہ کے اخبار العالم الاسلامی (۲۹ اپریل ۱۹۹۱) میں فلسطین کے ایک بڑے عالم الشیخ سعد الدین العلمی (مفتی القدس) کا انٹرویو چھپا تھا۔ اس انٹرویو کا خلاصہ اس کے عنوان میں تھا۔ اس کا عنوان یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے کوئی عزت اور تکریم اسلام کے بغیر نہیں (لا عزة ولا کرامة للمسلمین من غیر الاسلام)

اس قسم کے شاندار الفاظ بار بار ہمارے رہنما دہراتے رہتے ہیں۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ محض جوش کے تحت ہوتا ہے۔ اس کا کوئی تعلق شعور سے نہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان لوگوں سے جب یہ کہا جائے کہ صبر کا طریقہ اختیار کرو، کیوں کہ اللہ

نے اپنی نصرت کو صبر کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ (اعلم ان النصر مع الصبر) ۔ یہی مسلمان اس وقت یہ کہنے لگتے ہیں کہ یہ تو بزدلی کی تعلیم ہے۔ ان لوگوں کے لئے اسلام محض فخر کے لئے ہے نہ کہ تعمیل کے لئے۔

۱۳ اکتوبر ۱۹۹۴

مسٹر ایم اے حق (Tel. 662766) دہلی کارپوریشن میں ۲۲ سال سے سروس کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۴۷ میں جب تقسیم کے بعد بہت سے مسلمان پاکستان چلے گئے تو دہلی میں صرف سات ایسے مسلمان رہ گئے تھے جو لکھ پتی تھے۔ آج دہلی میں رہنے والے ۲۰ کروڑ مسلمانوں میں سات ہزار کروڑ پتی ہیں اور لکھ پتیوں کا تو کوئی شمار نہیں۔

مسٹر حق براہ راست ان امور سے واقفیت رکھتے ہیں، اس لئے ان کا بیان مکمل درست معلوم ہوتا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ دہلی میں مسلمان اتنا زیادہ ترقی کر رہے ہیں۔ مگر آج تک کسی کی زبان سے شکر کا کلمہ میں نے نہیں سنا۔ انھوں نے اس کی تائید کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان اپنی ترقی کا مقابلہ ہندوؤں سے کرتے ہیں۔ چوں کہ ہندو ان کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی کر چکے ہیں، اس لئے اس تقابل میں انھیں اپنی ترقی کم دکھائی دیتی ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ اس معاملہ میں وہ خود اپنی حالت سے تقابل کریں۔ یعنی یہ دیکھیں کہ ۱۹۴۷ میں وہ کہاں تھے اور ۱۹۹۴ میں وہ کہاں ہیں۔ اگر وہ اس طرح تقابل کریں تو ان کا سینہ شکر کے جذبات سے بھر جائے گا۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۹۴

مسٹر ارن شرما (انگلش جرنلسٹ) نے بتایا کہ امریکہ کے کانسٹی ٹیوشن میں لکھا ہوا ہے کہ امریکہ میں کسی عورت کو ریاست کا پریسیڈنٹ نہیں بنایا جائے گا۔ انھوں نے بتایا کہ امریکہ میں اس پر ۱۹۶۲ میں ایک فلم بنائی گئی تھی جس کا نام تھا (President's Kiss) اس فلم میں دکھایا گیا تھا کہ ایک عورت کو امریکہ کا پریسیڈنٹ بنایا جاتا ہے۔ پھر وہ حاملہ ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کو صدر کی ذمہ داریاں ادا کرنا سخت مشکل ہو جاتا ہے۔ آخر میں وہ یہ کہہ کر صدارت سے استعفا دے دیتی ہے کہ عورت کا کام گھر سنبھالنا ہے، صدر بننا عورت کا کام نہیں۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۹۴

کویت میں "عطر المعرفۃ" ایک ماہانہ سلسلہ ہے۔ اس کے تحت ہر ماہ انگریزی یا فرانسیسی سے کسی کتاب کا ترجمہ شائع کیا جاتا ہے۔ اس کے سلسلہ نمبر ۸۹ اکی کتاب کا نام ہے: عودۃ الوفاق بین الانسان والطبیعۃ۔ یہ ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب کے سرنامہ پر سانت تیریزدافیلا کا ایک قول نقل کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ زندگی کی مہم جوئی میں زندگی کا جوہر پوشیدہ ہے۔ (فی مغامرۃ الحیاۃ یکمن جوھر الحیاۃ) صفحہ ۷)

مغامرہ (adventure) بلاشبہ بڑی ترقیوں کا زینہ ہے۔ جن افراد یا جن گروہوں میں یہ صفت ہو وہی اس دنیا میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیتے ہیں۔ اس کو دوسرے لفظوں میں رسک لینا بھی کہہ سکتے ہیں۔ آدمی کے اندر رسک لینے کا حوصلہ ہونا چاہئے۔ ورنہ وہ کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۹۴

موت کیا ہے۔ موت آخرت کا دروازہ ہے۔ موت ایک دور کا خاتمہ اور دوسرے دور کا آغاز ہے۔ موت عارضی دنیا سے ابدی دنیا کی طرف سفر کا دن ہے۔ وہ دن ہر ایک پر آتا ہے جبکہ وہ دروازۂ آخرت میں داخل ہو کر اگلے مرحلۂ حیات میں پہنچ جائے۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۹۴

آکولہ کے ایک نوجوان ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے پچھلے سال ندوہ (لکھنؤ) سے فراغت حاصل کی ہے۔ ان کو میں نے الرسالہ کے دو شمارے دئے۔ انھوں نے کہا کہ اس پر کچھ لکھ دیں۔ میں نے اپنی دستخط کے ساتھ یہ الفاظ لکھ دئے: اسلام آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ باہوش ہو کر دنیا میں زندگی گزار سکے۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۹۴

شفیع الدین صاحب، ڈاکٹر شمس الآفاق صاحب، محمد سلیم صاحب ملاقات کے لئے

آئے۔ تینوں دہلی میں رہتے ہیں اور ساتھی ہیں۔ شفیع الدین صاحب ہمیشہ الرسالہ کے مضامین پر بحث کرتے ہیں۔ آج میں نے گفتگو کی صورت بدل دی۔ میں نے کہا کہ آپ کا اعتراض میں کاغذ پر لکھوں گا۔ اس کے بعد آپ اپنے اعتراض کے حق میں جتنی دیر تک چاہیں بولیں گے۔ اس کے بعد میں اپنا جواب پیش کروں گا۔ دونوں کو صرف ایک بار بولنے کا موقع ہوگا۔ اس کے بعد سلیم صاحب جج کی حیثیت سے اپنا فیصلہ دیں گے۔

شفیع الدین صاحب نے یہ اعتراض کاغذ پر لکھا: "الرسالہ اسلام کا ایک جز پیش کرتا ہے، وہ کل اسلام لوگوں کے سامنے نہیں لاتا۔ پہلے انھوں نے مفصل تقریر کی۔ اس کے بعد میں نے نسبتاً مختصر طور پر جواب دیا۔ آخر میں سلیم صاحب کو جج کی حیثیت سے فیصلہ کرنا تھا۔ انھوں نے میرے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے یہ الفاظ لکھے: مولانا کا جواب بالکل صحیح ہے۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۹۴

اقبال کا یہ شعر لوگ بہت جوش کے ساتھ دہراتے ہیں: جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔ مگر مجھے یہ شعر بالکل بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اہل سیاست کے اندر اگر دین نہ ہو تو وہ ہٹلر اور چنگیز بن جاتے ہیں۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۹۴

برطانیہ کے سابق لیڈر سرونسٹن چرچل نے دوسری عالمی جنگ کے زمانہ میں اپنی قوم کے ہر فرد میں یہ ذہن پیدا کیا تھا کہ ہر کام مجھ کو خود انجام دینا ہے۔ ان کا ماٹو یہ تھا کہ سب کچھ میرے اوپر منحصر ہے:

It all depends on me.

اس کے برعکس ہندستان کے لیڈروں نے اپنی قوم کے افراد کا یہ ذہن بنایا کہ سب کچھ سرکار کو یا سسٹم کو انجام دینا ہے، گویا کہ ان کا دیا ہوا ماٹو یہ ہے کہ:

It all depends on you.

اسی "می" اور "یو" میں قوموں کی ترقی اور تنزل کا راز چھپا ہوا ہے۔ جس قوم کے افراد

کا یہ حال ہو کہ وہ ہر کام کو اپنی ذمہ داری سمجھیں وہ قوم ترقی کرے گی۔ اور جس قوم کے افراد ہر کام کو دوسروں کی ذمہ داری سمجھنے لگیں وہ قوم کبھی ترقی کی منزلیں طے نہیں کر سکتی۔

۲۱ اکتوبر ۱۹۹۴

ایک ہندستانی مسلمان سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ لوگ باہر کے ملکوں میں امتیاز کو بخوشی برداشت کرتے ہیں اور ہندستان میں اتفاق سے کوئی اس قسم کا واقعہ پیش آجائے تو اس کے خلاف ہنگامہ شروع کر دیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ امریکہ کے دستور میں لکھا ہوا ہے کہ یہاں کا پریسیڈنٹ صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو امریکہ کا (natural born citizen) ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندستان اور پاکستان اور بنگلہ دیش سے جو مسلمان وہاں جا کر امریکہ کی شہریت لیتے ہیں وہ اپنے لئے سیاسی امتیاز کو قبول کرتے ہیں۔

اسی دہری پالیسی نے ہندستان کے مسلمانوں کو تباہ کر رکھا ہے۔ اگر مسلمان ہندستان میں بھی اسی طرح رہنے لگیں جس طرح وہ امریکہ میں اور دوسرے ملکوں میں جا کر رہتے ہیں تو ان کا سارا مسئلہ حل ہو جائے۔

۲۲ اکتوبر ۱۹۹۴

نظام الدین ایسٹ میں مسلمانوں کا ایک اسکول ہے جس کا نام نیو ہورائزن اسکول ہے۔ آج اس کے ہال میں ایک سیمینار تھا۔ اس کا موضوع دعوت تھا۔ جناب عبداللہ طارق رام پوری نے تقریر کرتے ہوئے ہندوؤں کے کچھ واقعات سنائے۔ انھوں نے بتایا کہ رام پور میں ایک ہندو جس کا نام دان سنگھ ہے، چار سال پہلے اس نے بڑے تند و تیز لہجہ میں کہا کہ مسلمان سب کے سب غدار ہیں۔ دیکھئے جب انڈیا اور پاکستان کے درمیان کرکٹ میچ ہوتا ہے تو مسلمان پاکستانی کھلاڑیوں کی جیت پر خوشی مناتے ہیں، اور اس کو اپنی فتح سمجھتے ہیں۔

طارق صاحب نے اس ہندو سے کہا کہ مسلمانوں کے اس فعل کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تو لہو و لعب کی چیزیں ہیں، ان کا مذہب اور اسلام سے کیا تعلق حقیقت

یہ ہے کہ یہ اتنا زیادہ لغو کام ہے کہ اگر میرا بس چلے تو میں ایسے مسلمانوں کو کوڑے ماروں۔ یہ گفتگو سن کر مذکورہ ہندو بہت متاثر ہوا اور اس نے کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کر لیا۔ اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ ہندوؤں میں بے پناہ مادہ قبولیت موجود ہے۔

۲۳ اکتوبر ۱۹۹۴

ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ کی زبان مشکل ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ زبان مشکل نہیں ہوتی، بلکہ اس کی بات مشکل ہوتی ہے۔ مشکل بھی اس معنی میں کہ لوگ اس قسم کی باتوں سے مانوس نہیں ہیں۔ مانوس نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس کو پکڑ نہیں پاتے۔ مثلاً ایک دکاندار جب بال بیرنگ (ball-bearing) کا لفظ بولتا ہے تو فوراً گاہک اس کو سمجھ جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ "گولی سنبھال" کہے تو گاہک کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ گولی سنبھال کا لفظ مشکل ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ گاہک اس لفظ سے مانوس نہیں۔ اسی طرح الرسالہ میں جو بات کہی جاتی ہے وہ بذات خود آسان ہے۔ مگر عام قاری چوں کہ اس سے مانوس نہیں اس لئے وہ اس کو جلد سمجھ نہیں پاتا۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۹۴

۲۳ اکتوبر کو میں مظفر نگر (یوپی) میں تھا۔ یہاں علی گڑھ اولڈ بوائز کی طرف سے ریزرویشن اور ایجوکیشن پر سمینار تھا۔ اس میں مجھ کو بلایا گیا تھا۔ چیف گیسٹ کے طور پر وہاں میری ایک تقریر ہوئی۔

یہ میٹنگ اصلاً "سرسید ڈنر" کے لئے تھی۔ سمینار اس کا ایک ضمنی جزء تھا۔ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ حضرات ہر سال علی گڑھ میں اور دوسرے مقامات پر اسی طرح سرسید ڈنر کرتے ہیں۔ اس میں لاکھوں روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ انھیں لوگوں سے اگر کہا جائے کہ آپ لوگ ایک سرسید تعلیمی فنڈ بنائیے اور جتنا روپیہ آپ ڈنر میں خرچ کرتے ہیں وہ ہر سال اس فنڈ میں جمع کر دیجئے تو یقینی طور پر کسی کو ایسے فنڈ سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ سرسید ڈنر حقیقۃً ایک تفریحی تقریب ہے۔ سرسید کے نام پر لوگوں کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ ذاتی تفریح کو اجتماعی تفریح کے طور پر منا سکیں۔ یہی معاملہ

موجودہ زمانہ میں اسلام کے ساتھ ہو رہا ہے۔ لوگ اپنے لئے ایک ذہنی مشغلہ چاہتے ہیں۔ اگر وہ اس کو "ذاتی ذہنی مشغلہ" کے نام پر کریں تو وہ اکیلے رہ جائیں گے۔ اس لئے وہ اسلام کے نام پر ایک تنظیم بناتے ہیں۔ اس طرح یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ ذاتی مشغلہ کو ایک اجتماعی میلہ کے طور پر منایا جاسکے۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۹۴

اردو زبان میں ایک بہت برا رواج یہ پڑ گیا کہ باتوں کو شاعرانہ انداز میں کہا جانے لگا۔ جبکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ باتوں کو حقیقت کی زبان میں کہا جائے۔ شاعرانہ اسلوب کی ایک مثال اقبال کا یہ مشہور شعر ہے :

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا   آگ کرسکتی ہے انداز گلستاں پیدا

حضرت ابراہیم پر آگ ٹھنڈی ہوگئی تھی، یہ بات بذات خود درست ہے۔ مگر شاعر نے اس واقعہ کو ایمان سے جوڑ دیا۔ یہ انتساب درست نہیں۔ اس کا تعلق پیغمبرانہ اتمام حجت سے ہے نہ کہ سادہ طور پر صرف ایمان سے۔ ایمان خواہ کتنا ہی کامل ہو، آدمی اگر آگ میں ڈالا جائے گا تو وہ جلے گا۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۹۴

مسٹر وی کے برن وال (Tel. 3320133) ضلع اعظم گڑھ کے باشندے ہیں۔ آجکل وہ دہلی میں کمشنر انکم ٹیکس کے عہدہ پر ہیں۔ ایک ملاقات میں انھوں نے بتایا کہ وہ اردو جانتے ہیں مگر پریکٹس نہ ہونے کی وجہ سے اب مشکل سے پڑھتے ہیں۔ تاہم وہ صاف ستھری اردو بول رہے تھے۔

انھوں نے بتایا کہ دیوان غالب، غبار خاطر (ابوالکلام آزاد) اور کئی دوسری اردو کتابیں عین اسی زبان میں دیوناگری رسم الخط میں چھاپی گئی ہیں۔ وہ ہندی دانوں میں بہت مقبول ہوئی ہیں۔ وہ اوریجنل اردو اڈیشن سے زیادہ فروخت ہوئی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اسی طرح تمام معیاری اردو کتابوں کو رسم الخط بدل کر ہندی میں چھاپا جانا چاہئے۔ اس رائے میں وہ بہت شدید ہیں۔ چنانچہ وہ دارالمصنفین اعظم گڑھ اسی

لئے گئے اور اس کے ذمہ داروں سے کہا کہ آپ شبلی کی تمام کتابوں کو ہندی رسم الخط میں چھاپ دیں۔ مگر ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا۔

یہی بات اس سے پہلے مسٹر کھنہ نے مجھ سے کہی تھی۔ ۱۹۴۷ کے بعد شمالی ہند کے مسلمانوں نے "اردو بچاؤ" کے نام پر بہت بڑی بڑی تحریکیں اٹھائیں۔ مگر یہ تمام تحریکیں ناکام ہو گئیں۔ اس کے بجائے ان کو وہی کام کرنا چاہئے تھا جو مسٹر برن وال نے کہا۔ ۱۹۴۷ کے بعد بیشتر ہندوؤں کا حال یہ تھا کہ وہ اردو زبان بخوبی طور پر سمجھتے تھے۔ مگر وہ پڑھنے میں دقت محسوس کرتے تھے۔ اس وقت مسلمانوں کو چاہئے تھا کہ اردو کتابیں فارسی رسم الخط کے علاوہ، ہندی رسم الخط میں بڑی تعداد میں چھاپتے۔ اس طرح اردو زبان کم از کم بولی کی حد تک عام اہل ملک میں پوری طرح محفوظ رہتی اور وہ بعد لسانی (Language gap) پیدا نہ ہوتا جو اب پیدا ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۹۴

میرے بڑے لڑکے ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں اوکھلا (ابوالفضل انکلیو) میں رہتے ہیں۔ ان سے ملاقات کے لئے ان کے گھر گیا۔ میرے ساتھ میری بیوی صابرہ اور میرا پوتا عدنان تھے۔ جامعہ ملیہ کے بعد سڑک اچھی نہیں۔ چنانچہ گاڑی کو یہاں بار بار دھچکا لگتا ہے۔ عدنان جس کی عمر ڈھائی سال سے کچھ زیادہ ہے۔ اس نے کہا: ڈرائیور بہت خراب گاڑی چلاتا ہے۔

بچہ گاڑی کو اور ڈرائیور کو جانتا تھا، مگر زمین کی ناہمواری کو نہیں جانتا تھا۔ اس لئے اس نے سمجھ لیا کہ ڈرائیور اس خرابی کا ذمہ دار ہے۔ حالاں کہ اس میں ڈرائیور کا کوئی قصور نہ تھا۔ یہ تمام تر غیر ہموار راستہ کی بنا پر تھا نہ کہ ڈرائیور کی کسی خرابی کی بنا پر۔

یہ تو ایک بچہ کی بات تھی۔ مگر دیکھئے تو بیشتر بڑے بھی اس قسم کی نافہمی میں مبتلا نظر آئیں گے۔ وہ ایک برائی کا تجربہ کریں گے۔ اور اس کا حقیقی سبب نہ جاننے کی وجہ سے اس کو کسی خاص شخص کی طرف منسوب کر دیں گے۔ جیسے الاخوان المسلمون نے مصر میں کچھ خرابیاں دیکھیں۔ ان خرابیوں کے حقیقی اسباب کچھ اور تھے مگر انھوں نے شاہ

فاروق کو اس کا سبب سمجھ لیا۔ وہ شاہ فاروق کے خاتمہ کے درپے ہو گئے۔ مگر شاہ کو ختم کرنے کے بعد بھی تمام برائیاں ملک میں بدستور موجود رہیں۔ اسی طرح پاکستان کے اسلام پسند گروہ نے ایوب خاں اور ذوالفقار علی کو ملک کی خرابیوں کا ذمہ دار سمجھ لیا۔ مگر ان کو ختم کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ تمام برائیاں بدستور ملک کے اندر موجود ہیں۔ یہی طفلانہ تجربہ خود ہندستان میں مختلف صورتوں میں کیا جارہا ہے۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۹۴

مارچ ۱۹۹۴ میں اقوام متحدہ کے تحت جنیوا میں ایک کانفرنس ہوئی۔ اس میں کشمیر کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ ہندستان نے اس میں شرکت کے لئے جو وفد بھیجا اس کے قائد مسٹر اٹل بہاری باجپئی تھے جو پارلی منٹ میں اپوزیشن کے لیڈر ہیں۔ اس طرح ہندستان نے بین اقوامی پلیٹ فارم پر یہ مظاہرہ کیا کہ کشمیر کے مسئلہ پر ہندستان کی مختلف پارٹیوں کے درمیان کامل اتحاد ہے۔ اس کی وجہ سے جنیوا میں ہندستان کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: انڈیا ٹوڈے ۳۱ مارچ ۱۹۹۴)

اب نومبر ۱۹۹۴ میں دوبارہ کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پیش ہونے والا ہے۔ پاکستان کی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے پاکستان اسمبلی میں اپوزیشن کے لیڈر مسٹر نواز شریف کو خط لکھا۔ اس میں انھوں نے مسٹر نواز شریف سے اقوام متحدہ کے لئے پاکستانی وفد کی قیادت کرنے کی درخواست کرتے ہوئے لکھا کہ جس طرح انڈیا نے اپنی پارلیمنٹ میں اپوزیشن کے لیڈر اٹل بہاری باجپئی کو دوبارہ اقوام متحدہ جانے والے وفد کا قائد بنایا ہے اسی طرح پاکستان کو بھی عالمی فورم میں کشمیر کے بارہ میں متفقہ موقف پیش کرنا چاہئے۔

مسٹر نواز شریف نے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ مجھے کشمیر کے بارہ میں حکمراں پارٹی کی پالیسی سے اختلاف ہے۔ یہ عذر بالکل لغو ہے۔ ہندستان میں بھی بھارتیہ جنتا پارٹی کانگرس کی کشمیر پالیسی پر سخت تنقید کرتی ہے۔ اس کے باوجود پارٹی کے لیڈر نے کانگرس کی پیش کش کو قبول کرتے ہوئے ہندستانی وفد کی شرکت منظور کر لی۔ اسی مزاج نے مسلمانوں کو ساری دنیا میں تباہ کر رکھا

ہے۔ کیوں کہ اتحاد ہمیشہ اختلاف کو نظر انداز کرنے سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ اختلاف کو عذر بنانے سے۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۹۴

مولانا کلیم صدیقی (پھلت، ضلع مظفر نگر) نے بتایا کہ ان کے گھر میں ایک ہریجن عورت صفائی کرنے کے لئے آتی ہے۔ ان کی چھوٹی بچی اس سے بہت مانوس ہے۔ ایک روز اس نے ہریجن عورت کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ تم کتنی اچھی ہو۔ مگر تم ایک دن آگ میں جلوگی۔ عورت نے کہا کہ میں کیوں آگ میں جلوں گی۔ بچی نے کہا کہ تم بُت پوجتی ہو۔ مرنے کے بعد اللہ میاں تم کو آگ میں ڈال دیں گے۔ یہ کہہ کر بچی رونے لگی۔ اس واقعہ کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ ہریجن عورت نے اسلام کے بارہ میں مزید معلومات کیں اور اس کے بعد اسلام قبول کر لیا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر باہمی تفریق نہ ہوں تو مسلمانوں اور غیر مسلموں کا سادہ اختلاط ہی تبلیغ کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ حتی کہ مسلم گھرانوں کے بچے بھی مبلغ کا کام کرنے لگتے ہیں۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۹۴

بائبل میں حضرت موسیٰ کی معرفت یہود کو جو احکام دئے گئے ان میں سے ایک حکم موجودہ بائبل میں ان الفاظ میں ملتا ہے: یاد کر کے تو سبت کا دن پاک ماننا۔ چھ دن تک تو محنت کر کے اپنا سارا کام کاج کرنا۔ لیکن ساتواں دن خداوند تیرے خدا کا سبت ہے۔ اس میں نہ تو کوئی کام کرے نہ تیرا بیٹا نہ تیری بیٹی نہ تیرا غلام نہ تیری لونڈی نہ تیرا چوپایہ نہ کوئی مسافر جو تیرے یہاں تیرے پھاٹکوں کے اندر ہو (کیوں کہ خداوند نے چھ دن میں آسمان اور زمین اور سمندر اور جو کچھ ان میں ہے وہ سب بنایا اور ساتویں دن آرام کیا۔ اس لئے خداوند نے سبت کے دن کو برکت دی اور اسے مقدس ٹھہرایا) خروج ۲۰: ۸ - ۱۱

اس عبارت کا آخری فقرہ، جس کو میں نے بریکٹ میں لکھا ہے، وہ واضح طور الحاق ہے۔ پریس کے دور سے پہلے یہودی علما جب بائبل کی کتابت کرتے تھے تو درمیان میں اس طرح کے تشریحی فقرے شامل کر دیتے تھے۔ ابتدا میں شاید اصل متن اور تشریح

الگ الگ رہا ہو۔ مگر دھیرے دھیرے دونوں گڈمڈ ہوگئے۔ یہودی علما کی تشریح بھی بائبل کے متن میں شامل ہو کر اس کا حصہ بن گئی۔ قدیم آسمانی کتابوں کے محرّف ہونے کا ایک سبب اس قسم کا الحاق بھی ہے۔

۳۱ اکتوبر ۱۹۹۴

مصر کے الامام الاکبر الشیخ جاد الحق جاد نے ۱۹۹۱ میں ایک استفسار کے جواب میں یہ فتویٰ دیا تھا کہ میڈیکل ضرورت کے تحت ایک جسم کا خون دوسرے کے جسم میں داخل کرتے وقت مومن و کافر کی تمیز کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے لکھا کہ کافر کا خون بھی مومن کے خون ہی کی طرح پاک ہے:

دمُ الكافر طاهرٌ كدم المسلم تماماً

اس فتوے کے چند مہینے بعد قاہرہ میں سخت زلزلہ آیا۔ زخمی ہونے والوں کو فوراً خون پہنچانے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ بہت سے مسلمانوں کو عیسائیوں نے خون دے کر بچایا۔ یہ فتویٰ اس وقت اتنا مفید ثابت ہوا کہ مصر کے صدر حسنی مبارک نے ذاتی طور پر شیخ کا شکریہ ادا کیا۔

عرب علما اسی طرح واضح الفاظ میں فتوے دیتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندستان کے علما کا حال یہ ہے کہ مذکورہ مسئلہ میں کوئی ہندستانی عالم فتویٰ دیتا تو اپنے معروف قاعدہ کے مطابق شاید یہ لکھتا کہ کافر کا خون مومن کے لئے جائز تو ہے مگر احوط یہ ہے کہ اس کو استعمال نہ کیا جائے۔ اس قسم کی احتیاطی زبان اسلام کی روح کے مطابق نہیں۔

یکم نومبر ۱۹۹۴

علما نے لکھا ہے کہ عرب مادۂ اسلام ہیں۔ (العرب مادة الاسلام) اس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ تو اسلام میں نسلیت کو داخل کرنا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک غلط فہمی ہے۔ اصل یہ ہے کہ "عرب" کا لفظ یہاں علامتی معنی میں ہے۔ عرب سے مراد در اصل وہ انسان ہے جو اپنی فطرت پر قائم ہو۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ عرب مادۂ اسلام ہیں وہ سب فطری اوصاف ہی کو عرب کی خصوصیت بتاتے ہیں۔ قدیم عرب صحرائی

ماحول میں بنے تھے۔ اس بنا پر ان کے فطری اوصاف پوری طرح محفوظ تھے۔ یہی فطری انسان وہ ظرف ہے جو اسلام کی ہدایت کو سنبھالنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ آدمی جتنا زیادہ فطرت سے دور ہوگا اتنا ہی وہ اسلام سے دور ہوگا، اور جتنا زیادہ وہ فطرت سے قریب ہوگا اتنا ہی وہ اسلام سے قریب ہوگا۔

۲ نومبر ۱۹۹۴

الطاف حسین حالی ایک مصلح تھے۔ انھوں نے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے اس عربی مثل کو نقل کیا تھا: دُرمع الدھر حیث دار (زمانہ کے ساتھ چلو جدھر وہ جائے) انھوں نے بتایا تھا کہ یہ ابن الوقتی نہیں ہے بلکہ حقیقت پسندی ہے۔ بڑے بڑے ابو الوقت بھی اسی اصول کو اختیار کرکے ابو الوقت بنے ہیں۔

مسدس حالی بہترین اصلاحی کتاب ہے۔ مسلمانوں میں بعض اسباب سے اقبال کے کلام کو عمومی فروغ حاصل ہوا۔ اگر یہی فروغ مسلمانوں میں حالی کے کلام کو ملتا تو یقیناً موجودہ مسلمانوں کی تاریخ اس سے مختلف ہوتی جو آج نظر آرہی ہے۔ اقبال کا کلام مسلمانوں کو جذباتیت کی طرف لے جاتا ہے اور حالی کا کلام حقیقت پسندی کی طرف۔

۳ نومبر ۱۹۹۴

ڈپٹی نذیر احمد نہایت ذہین آدمی تھے۔ اپنے زمانہ میں وہ بہت مقبول ناول نگار تھے۔ ان کے ایک ناول کا نام ابن الوقت ہے۔ ایک لطیفہ ہے کہ ایک بار ایک میواتی مسلمان گلی قاسم جان (دہلی) آیا جہاں ڈپٹی نذیر احمد رہتے تھے۔ اس نے ڈپٹی صاحب کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ان کا لڑکا باہر نکلا۔ میواتی نے کہا: ابن الوقت Ibn Al-waqt ہے۔ لڑکے کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس نے کہا کہ یہاں کوئی ابن الوقت نہیں ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے گھر کے اندر سے یہ گفت گو سنی۔ وہ زور سے بولے، ارے بھائی، وہ ابن الوقت مانگ رہا ہے۔ چنانچہ اسے مذکورہ ناول دے دیا گیا اور وہ اس کو لے کر خوشی خوشی چلا گیا۔

سمجھ دار آدمی وہ ہے جو اصل مفہوم کو دیکھے نہ کہ ظاہری الفاظ کو جو کسی کہنے والے نے اپنی زبان سے کہا ہے۔

۴ نومبر ۱۹۹۴

کھوئے ہوئے لمحات کی یاد سب سے زیادہ غم ناک یاد ہے۔ دنیا میں آدمی کو جب یاد آتا ہے کہ فلاں وقت میرے لئے بے حد قیمتی تھا۔ مگر میں اس کو بر وقت استعمال نہ کر سکا اور وہ موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ ایسی یاد ہمیشہ بہت زیادہ تڑپا دینے والی ثابت ہوتی ہے۔ آخرت کے اعتبار سے بھی آدمی اسی طرح مواقع کو کھو رہا ہے۔ یہ غم ناک یاد مزید بے حساب اضافہ کے ساتھ آخرت میں آدمی کو گھیر لے گی اور پھر کبھی اس سے جدا نہ ہوگی۔

۵ نومبر ۱۹۹۴

امور کسبی میں بلاشبہ پیغمبر ہمارے لئے اسوہ ہے۔ مگر امور وہبی میں پیغمبر کسی کے لئے بھی اسوہ نہیں۔ اول الذکر پہلو سے پیغمبر تقلید کا عنوان ہے۔ مگر ثانی الذکر پہلو سے پیغمبر امتیازی خصوصیت کا عنوان۔

۶ نومبر ۱۹۹۴

ڈاکٹر کے این ساہنی ایک ریٹائرڈ ڈاکٹر ہیں۔ وہ ڈیفنس کالونی میں رہتے ہیں۔ ان کا ٹیلیفون نمبر 4611247 ہے۔ آج وہ ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے کہا کہ اجودھیا کی بابری مسجد اور رام مندر کے مسئلہ کا ایک بہت آسان حل میری سمجھ میں آیا ہے۔ وہاں جو رام مندر بنا ہے یا آئندہ جو بنایا جائے اس پر اس کا نام لکھ دیا جائے : رام مندر بابری

آج ہی سہارن پور کے حکیم نذیر احمد صاحب ملاقات کے لئے آئے۔ کچھ دیر بات چیت کے بعد انھوں نے پوچھا : الرسالہ ابھی نکل رہا ہے ؟

دونوں صاحبان سے میں نے کوئی گفتگو نہیں کی۔ صرف ان کی باتیں سنتا رہا۔ میں نے سوچا کہ جس سماج میں اتنے سادہ لوح قسم کے لوگ بستے ہوں اس سماج کو کوئی گہری بات کیسے بتائی جا سکتی ہے۔

۷ نومبر ۱۹۹۴

خورشید احمد اندرابی ایک کشمیری ہیں۔ وہ سرینگر میں رہتے ہیں۔ وہاں انھوں نے مرکز تعلیم الاسلام کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ ان کا ٹیلیفون نمبر یہ ہے 71316

انھوں نے بتایا کہ وہ کلیم اللہ خاں صاحب ایم ایس سی کے دوستوں میں سے ہیں۔ دونوں کا خیال ہے کہ ہندستانی فوج جو ہمارے علاقہ میں آئی ہے۔ عام طور پر کشمیری انھیں ظالم کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ مگر کیا معلوم، اللہ تعالٰی کو ان کی ہدایت مطلوب ہو اور اسی لئے انھیں ہمارے پاس بھیجا گیا ہو۔ اس سوچ کے تحت ان لوگوں نے طے کیا کہ وہ ہندستانی فوجیوں، خاص طور پر افسروں کو اسلامی لٹریچر پہنچانا شروع کریں۔ میں نے انھیں اپنے یہاں کی انگریزی اور ہندی کتابیں دیں۔

یہ بہت صحت مند اور مثبت تصور ہے۔ کشمیری اگر اس انداز میں سوچنے لگیں تو یقینی ہے کہ ہندستانی فوج کا کشمیر میں داخلہ ان کے لئے زحمت میں رحمت کا مصداق بن جائے گا۔

۸ نومبر ۱۹۹۴

کسی کا قول ہے کہ قیدی ہونا برا ہے۔ مگر سب سے برا قیدی وہ ہے جو اپنی سوچ کا قیدی ہو۔ جیل خانہ کی قید آدمی کے جسم کو دیواروں کے پیچھے بند کر دیتی ہے۔ مگر اس کا ذہن پھر بھی آزاد رہتا ہے۔ اس کا جسم ایک کمرہ کے اندر محدود ہوتا ہے مگر اس کی فکر لامحدود فضا میں پرواز کرنے کے لئے آزاد ہوتی ہے۔

۹ نومبر ۱۹۹۴

انوار الحق صاحب (۴۵ سال) مادھو پور، ضلع ایسٹ چمپارن کے رہنے والے ہیں۔ وہ تبلیغی مرکز میں آئے تھے۔ آج مجھ سے ملے۔ میں نے پوچھا کہ ہندو مسلم جھگڑوں میں تبلیغ کے لوگ کیا کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہم مسلمانوں کو صبر و تحمل کی تلقین کرتے ہیں۔ اور دعا کرتے ہیں۔ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ اللہ پر بھروسہ کرو، اللہ تمہارے سب کام بنا دے گا۔

انوار الحق صاحب کے قریب سسوا (Sisva) نام کا ایک گاؤں ہے۔ یہاں ۱۹۸۸ میں ایک قصہ پیش آیا۔ گاؤں کے کنارے مسلمانوں کا قبرستان ہے۔ اس کے بیچ سے ہندوؤں نے چوڑا راستہ نکال لیا۔ بیل گاڑی وغیرہ اس راستہ سے لے جانے لگے۔

مسلمانوں نے کہا کہ اگر آپ کو راستہ کی ضرورت ہے تو ہم قبرستان کے کنارے سے راستہ دے دیتے ہیں۔ آپ لوگ بیچ کا راستہ چھوڑ دیجئے۔ وہ لوگ نہیں مانے اور فساد پر آمادہ ہوگئے۔ اس کے بعد اطراف میں پروپگنڈہ کیا گیا کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کا راستہ بند کر دیا ہے۔ ایک دن ہزاروں کی تعداد میں ہندوؤں نے آکر قبرستان کو گھیر لیا۔

تبلیغ کے لوگوں نے مسلمانوں سے کہا کہ تم اللہ پر بھروسہ کرو اور مسجد میں جمع ہو کر عبادت اور دعا کرو۔ چنانچہ مسلمان مسجد میں اکٹھا ہو کر دعا اور عبادت میں مشغول ہوگئے۔ اسی وقت ایک مسلمان لڑکی کی موت ہوگئی۔ اب اس کی تدفین کا مسئلہ تھا۔ کچھ مسلمان ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے یہاں گئے اور اس کو صورت حال بتائی۔ ڈی ایم نے کہا کہ ہم پولیس فورس لے کر آتے ہیں۔ ۔ ۲ مسلمان لاش لے کر ہمارے ساتھ قبرستان چلیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ مگر جب جنازہ قبرستان کے پاس پہنچا تو ہندوؤں کی بھیڑ نے اس کو داخلہ سے روک دیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر رنجن (S.E. Ranjan) نے بہت کہا، مگر وہ لوگ نہیں مانے۔ یہاں تک کہ انھوں نے پولیس پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ اب ڈی ایم نے فائرنگ کا آرڈر دے دیا۔

اس فائرنگ میں بہت سے ہندو مارے گئے۔ انوار الحق صاحب کا بیان ہے کہ ٹھیلہ میں ہندوؤں کی لاشیں لے جائی گئیں۔ فائرنگ کے بعد وہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ اپنے پیچھے سیکڑوں کی تعداد میں بائیسکلیں اور اسکوٹر چھوڑ گئے۔ اس کے بعد وہی ہوا جو مسلمانوں نے کہا تھا۔ قبرستان کا درمیانی راستہ بند ہوگیا۔ مسلمانوں نے قبرستان کے کنارے سے ایک راستہ نکال دیا۔

۱۰ نومبر ۱۹۹۴

دو احساسات ہر وقت غم کا پہاڑ بن کر میرے اوپر چھائے رہتے ہیں۔ ایک، دعوت دین اور اصلاح امت کی ذمہ داری۔ دوسرے، آخرت کی جواب دہی کا مسئلہ۔ ان دونوں غموں کے نیچے میری شخصیت گویا کچل کر رہ گئی۔ آج صبح فجر کی نماز کے بعد کھلی جگہ ٹہل رہا تھا، فطرت کے مناظر سامنے تھے۔ اس ماحول میں ایک عجیب تاثر ہوا۔ ایک آہ کے ساتھ یہ فقرہ میری زبان سے نکلا ــــــ اتنا زیادہ جینے کی ضرورت ہے اور حال یہ ہے کہ ایک لمحہ بھی جینے

کی طاقت نہیں۔ اتنا زیادہ لازمی طور پر آخرت کی دنیا میں داخل ہونا ہے اور آخرت کی دنیا میں داخل ہونے کی ذرا بھی ہمت نہیں۔

۱۱ نومبر ۱۹۹۴

قرآن میں دو جگہ یہ آیت آئی ہے کہ ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے۔ اور دین صرف اللہ کے لئے ہو جائے (البقرہ، الانفال) اس پر غور کرنے کے بعد میری سمجھ میں یہ آیا ہے کہ یہاں دین سے مراد شریعت نہیں ہے بلکہ فطرت ہے۔ اور جنگ کا مقصد حکومت اسلامی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ حالت فطری کا قیام ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو فطرت (نیچر) پر پیدا کیا ہے۔ قدیم زمانہ میں شرک اور جبری بادشاہت کے نظام نے اس حالت فطری کو ختم کر رکھا تھا۔ اصحاب رسول کو حکم دیا گیا کہ جنگ کرکے شرک اور جبری بادشاہت کا زور توڑ دو۔ تاکہ اللہ کی تخلیق کے مطابق حالت فطری دوبارہ قائم ہو جائے۔

عبد اللہ بن زبیر کے زمانہ میں جو لڑائی ہوئی۔ اس میں حضرت عبد اللہ بن عمر علیحدہ رہے۔ کچھ لوگوں نے ان سے شرکت کے لئے کہا۔ ان کے انکار پر انھوں نے یہی آیت پیش کی کہ ختم فتنہ کا تو خود قرآن میں حکم ہے، عبد اللہ ابن عمر نے فرمایا کہ قد فعلنا۔ یعنی وہ تو ہم نے کر دیا۔ اب تم لوگ خود ساختہ جنگ چھیڑ کر مصنوعی طور پر دوبارہ ایک نیا فتنہ پیدا کر رہے ہو۔

۱۲ نومبر ۱۹۹۴

۹ نومبر کو مسٹر پی وردراجن (P. Varadarajan) آئے۔ وہ بھارتیہ ودیا بھون میں کام کرتے ہیں۔ ان کا ٹیلیفون نمبر 6802184 ہے۔

انھوں نے بتایا کہ ودیا بھون کے تحت بہت سے اسکول چل رہے ہیں۔ ہم نے اپنے طالب علموں کے لئے ایک کلچرل کورس رکھا ہے۔ اس میں ہم انھیں کہانیوں پر مشتمل کتاب پڑھاتے ہیں۔ ہمارے چیرمین نے ان کتابوں کو دیکھا تو کہا کہ یہ تو ساری کی ساری ہندو کہانیوں پر مشتمل ہیں۔ ہم کو مسلم کہانیوں پر مشتمل کتابیں بھی تیار کرنا چاہئیں۔ چنانچہ وہ اسلامی تاریخ سے دو درجن اخلاقی کہانیاں چاہتے ہیں جن کو وہ بچوں کے انداز میں لکھ کر

اپنی کتاب میں شامل کرسکیں۔ میں نے کہا کہ میں ضرور آپ کو ایسی کہانیاں دوں گا۔

۱۳ نومبر ۱۹۹۴

ایک تعلیم یافتہ ہندو نوجوان ہمانشو شیکھر جھا (Himanshu Shekhar Jha) مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ گفت گو کے دوران انھوں نے اسلام کی تعریف کی۔ اس کے ساتھ انھوں نے کہا کہ کرشن اور رام یہ دونوں پرافٹ تھے۔ آپ اس میں ذرا بھی شبہ نہ کریں۔ یہ اسی طرح سے پرافٹ تھے جیسے دوسرے پرافٹ ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ کرشن اور رام پرافٹ تھے یا نہیں تھے، یہ تو بعد کی بات ہے۔ پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ وہ تھے بھی یا نہیں تھے۔

۱۴ نومبر ۱۹۹۴

عباس محمود العقاد نے محمد عبدہ پر ایک کتاب لکھی ہے جو سلسلۃ اعلام العرب کے تحت قاہرہ سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ محمد عبدہ بعد کو جب سیاست اور سیاسی عمل سے بے رغبت ہوگئے تو انھوں نے کہا کہ میں سیاست سے اور ہر سیاسی چیز سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں حتی کہ سیاست کے لفظ سے بھی :

قال محمد عبدہ بعد أن رغب عن السياسة والعمل السياسی، اعوذ باللّٰہ من السياسة ومن لفظ السياسة ومن ساسَ يسوسُ وسائس مسوس (صفحہ ۱۵۸)

۱۵ نومبر ۱۹۹۴

میرے لڑکے ڈاکٹر ثانی اثنین اور پرمود کمار بترا پچھلے دو سال سے مل کر کام کر رہے ہیں۔ اس سے دونوں کو بہت فائدہ ہے۔ ثانی اثنین کی استعداد سے مسٹر بترا کو فائدہ مل رہا ہے اور مسٹر بترا کی استعداد سے ثانی اثنین کو۔ میں نے سوچا کہ مل جل کر کام کرنے کے یہی مواقع پورے ہندستان اور خود پاکستان میں بھرپور طور پر حاصل تھے۔ اور بہت سے ہندو اور مسلمان اس طرح کام کر بھی رہے تھے۔ مگر سطحی مسلم لیڈروں اور جھوٹے مسلم اخباروں نے سارا ذہن بگاڑ کر رکھ دیا۔ ان لیڈروں اور اخباروں نے مثبت واقعات کا چرچا نہیں کیا۔ البتہ کوئی منفی واقعہ مل گیا تو اس کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ حالانکہ منفی واقعہ اگر ایک فیصد تھا تو مثبت واقعہ ۹۹ فیصد۔

۱۶ نومبر ۱۹۹۴

ایک مسلمان جو مرکزی گورنمنٹ میں افسر ہیں۔ انھوں نے مسلم افسران کی نفسیات کے بارہ میں بتایا کہ یہ لوگ شروع میں تو ملازمت کے جوش میں ہوتے ہیں۔ مگر جب وہ ۵۰ سال سے اوپر کی عمر کو پہنچتے ہیں تو ہر ایک کو یہ خیال ستانے لگتا ہے کہ ہم تو صرف دنیا کمانے میں رہے۔ آخرت کی کمائی کچھ نہیں کی۔ انھوں نے اپنے بارہ میں اور بیشتر افسروں کے بارہ میں بتایا کہ ہم لوگ اسلام کی واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں، مگر علما نے ہمارے جیسے لوگوں کے لئے کوئی تعلیمی یا تربیتی انتظام نہیں کیا۔ روایتی قسم کے مولوی سے جب ہم بات کرتے ہیں تو وہ ہماری ضرورت کے مطابق ہمیں بتا نہیں پاتے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کسی مدرسہ میں ایک شعبہ کھلوائیے یا خود کوئی ادارہ کھولئے۔ اس میں ہمارے جیسے لوگوں کو تھوڑے تھوڑے دن کے لئے بلائیے مثلاً چھٹیوں کے دن میں۔

یہ تجویز بے حد مفید اور ضروری ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسی کوئی صورت پیدا فرمائیں کہ اس قسم کے مسلمانوں کے لئے ایک تعلیمی اور تربیتی ادارہ جاری ہو سکے۔

۱۷ نومبر ۱۹۹۴

مسٹر آر کے سید (IAS) آجکل گورنر کشمیر کے ایڈوائزر ہیں۔ آج وہ ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ ۵۴ - ۱۹۵۳ میں وہ الٰہ آباد میں تھے اور ایچ ایل کالج میں کامرس کے طالب علم تھے۔ پروفیسر ایس وی ڈیسائی ان کے ساتھ تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ انڈیا نے بے شمار پیسہ کشمیریوں کو دیا مگر وہ زیادہ تر کشمیر کے کچھ لیڈروں کی جیب میں چلا گیا۔ اور ضائع ہو گیا:

So much money has gone down the drains in Kashmir that even the drains are full.

۱۸ نومبر ۱۹۹۴

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں پر جتنی مصیبتیں آرہی ہیں اس کا ایک ہی بنیادی سبب ہے۔ اور وہ ہے دعوتی ذہن کا نہ ہونا۔ مثلاً انگریز اور دوسرے یورپی لوگ جب ہندستان میں

اور دوسرے مسلم ملکوں میں آئے تو مسلم رہنماؤں میں ان کے مقابلہ میں صرف نفرت کا جذبہ پیدا ہوا۔ وہ ان کو باہر نکالنے کے درپے ہو گئے۔ اگر ان مسلمانوں میں دعوتی ذہن ہوتا تو وہ سوچتے کہ یہ تو مدعو خود ہمارے پاس آگیا ہے، آؤ انھیں اسلام کی دعوت پہنچائیں۔ اگر ہندستان اور تمام ملکوں میں یہ ذہن چل پڑتا تو بیشتر یورپی لوگ اسلام قبول کر لیتے اور آج ہماری تاریخ اس سے بالکل مختلف ہوتی جو اب نظر آرہی ہے۔

۱۹ نومبر ۱۹۹۴

ہندستان کے مسلم رہنماؤں نے ہندوؤں کے معاملہ میں ہمیشہ مجرمانہ سلوک کیا ہے۔ مسلم سلطنت کے زمانہ میں انھیں ہندوؤں کے ساتھ اعلیٰ برتاؤ کا معاملہ کرنا تھا مگر انھوں نے ان سے جنگ کی۔ برٹش اقتدار کے زمانہ میں ان کے لئے دعوت کا موقع تھا۔ مگر انھوں نے ان سے مناظرہ بازی کی۔ ۱۹۴۷ کے بعد انھیں صبر کا طریقہ اختیار کرنا ہے مگر اب وہ احتجاج کا انداز اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اگر خدا کا دین وہی ہے جو قرآن و حدیث میں بتایا گیا ہے تو مدعو کے سلسلہ میں اس قسم کی مجرمانہ روش کے بعد مسلمانوں کا کوئی بھی دوسرا عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ خواہ بظاہر وہ کتنا ہی زیادہ اخلاص کے ساتھ کیا گیا ہو۔ اور کتنی ہی زیادہ مقدس شخصیتیں اس کے ساتھ شریک ہوں۔ قرآن کے مطابق، دعوتی ذمہ داری میں کوتاہی کے بعد خود پیغمبر کی حیثیت بھی غیر متحقق ہو جاتی تھی۔ پھر امت کی حیثیت دعوتی کوتاہی کے بعد کیوں غیر متحقق نہ ہو گی۔

۲۰ نومبر ۱۹۹۴

آج کے انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس میں آخری صفحہ پر ایک خبر تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ الکشن کمیشن (موجودہ کمشنر ٹی این سیشن) نے سنٹرل حکومت سے درخواست کی تھی کہ وہ الکشن کے موقع پر سرکاری جہاز اور ہیلی کاپٹر کو اسے استعمال کی اجازت دے تاکہ سکم، گوا، آندھرا پردیش اور کرناٹک میں اگلے ماہ ہونے والے الکشنی عمل کی نگرانی کی جاسکے۔ اس سلسلہ میں خبر میں جو لفظ تھا وہ یہ تھا:

'for overseeing election related work.

اورسی انگ (بالائی نگرانی) کا لفظ انڈسٹریل دور کی پیداوار ہے۔ فضا میں بلند ہو کر اوپر سے نگرانی کرنا پہلے ممکن نہ تھا، اس لئے پہلے اس قسم کا لفظ بھی نہیں بن سکتا تھا۔ جدید صنعتی دور نے اس قسم کی بہت سی چیزیں پیدا کی ہیں جو گویا مذہبی عقائد کی تمثیل یا ان کا مظاہرہ ہیں۔ ان کو دیکھ کر مجھے خیال آتا ہے کہ جدید صنعتی دور کو خدا نے شاید اسی لئے ظاہر فرمایا تاکہ حقائق اسلامی یا معتقدات اسلامی پر مظاہراتی استدلال قائم کیا جاسکے۔

۲۱ نومبر ۱۹۹۴

ایک صاحب کا خط موصول ہوا ہے۔ مگر اس پر مکتوب نگار کا پتہ درج نہیں کہ ان کا جواب دیا جاسکے۔ موصوف لکھتے ہیں کہ آپ اپنے نقطۂ نظر کو مثبت نقطۂ نظر کہتے ہیں۔ اور دوسروں کے نقطۂ نظر کو منفی نقطۂ نظر۔ میں مانتا ہوں کہ دوسروں کا نقطۂ نظر منفی ہے لیکن اگر آپ کا مثبت نقطۂ نظر ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں۔ تو اس کا مثبت نتیجہ نکلنا چاہئے۔ جب اس کا بھی مثبت نتیجہ نہیں نکل رہا ہے تو اس سے ثابت ہوا کہ آپ کا نقطۂ نظر بھی منفی ہے۔

یہ غلط منطق سے غلط نتیجہ نکالنا ہے۔ میرا نقطۂ نظر ابھی تک قومی سطح پر قبول نہیں کیا گیا ہے۔ قومی سطح پر جو نقطۂ نظر رائج ہے وہ وہی منفی نقطۂ نظر ہے۔ میرا نقطۂ نظر انفرادی طور پر الرسالہ کے قاریوں کو اپیل کرتا ہے۔ چنانچہ ہزاروں لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم الرسالہ پڑھنے سے پہلے جذباتی تھے۔ اب ہمارے اندر پختگی آگئی۔ اس طرح انفرادی طور پر ہمارے مشن کا نتیجہ نکل رہا ہے۔ قومی سطح پر تو اسی نقطۂ نظر کا نتیجہ نکلے گا جو عملاً قوم نے اختیار کر رکھا ہو۔

۲۲ نومبر ۱۹۹۴

پاکستان میں اپوزیشن کے لیڈر نواز شریف نے "گھونسہ مکا" کا جلوس نکالنا طے کیا۔ اس کے جواب میں حکمراں پارٹی نے اعلان کیا کہ ہم "لاٹھی ڈنڈا" سے جلوس کا مقابلہ کریں گے۔ جو پاکستان ہندو۔ مسلم جھگڑے کے خاتمہ کے نام پر بنا تھا، وہ شدید انداز میں مسلم۔ مسلم جھگڑے کا شکار ہو رہا ہے۔

اصل یہ ہے کہ سماجی جھگڑے کا خاتمہ زمینی تقسیم سے نہیں ہوتا، بلکہ صبر و اعراض کا اصول اختیار کرنے سے ہوتا ہے۔ یہی اصول ہندستان اور پاکستان کے لئے ہے، اور

یہی اصول ساری دنیا کے لئے۔

۲۳ نومبر ۱۹۹۴

ہندستان ٹائمس (۲۳ نومبر) میں اس کے واشنگٹن کے کرسپانڈنٹ مسٹر این سی منن کی بھیجی ہوئی ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ پبلک براڈ کاسٹنگ سروس کے تحت مسٹر ایمرسن (Steve Emerson) نے ایک ڈاکومنٹری فلم تیار کی ہے۔ اس کا نام ہے جہاد ان امریکا۔

اس میں بتایا گیا ہے کہ اسلامک ملٹنٹ جو امریکہ سمیت ساری دنیا میں سرگرم ہیں، وہ ایک عالمی اسلامک ایمپائر بنانا چاہتے ہیں۔ امریکہ کی سی آئی اے نے افغان لڑائی کے دوران تین بلین ڈالر کی قیمت کا ہتھیار افغانی مجاہدین کو دیا تھا۔ افغان۔ روس جنگ کے خاتمہ کے بعد اس کا بہت سا حصہ بچ گیا۔ اب یہ ہتھیار اسلامی ملٹنٹ جگہ جگہ استعمال کر رہے ہیں۔ اس میں فلسطینیوں کے قائم کردہ اقصیٰ وژن ویڈیوز کا ذکر ہے جس میں ایک فلسطینی نوجوان کہتا ہے کہ ہم یہودیوں کے خون سے جنت خریدتے ہیں:

We buy paradise with the blood of Jews.

ایک اور اسلامک ایکٹوسٹ کہتے ہیں کہ اللہ کے نام پر ہمیں کافروں کے ملک کو فتح کرنا ہے۔ اگر وہ ہمارے راستہ میں رکاوٹ بنیں گے تو ہم ان کو تباہ کر دیں گے:

We must conquer the lands of the infidels in the name of Allah. If they stand in our way, we must destroy them. (p. 14)

•

اس قسم کا اسلام اسلام کی نفی ہے۔ اسلام کا اصل نشانہ دعوت ہے۔ اور اس قسم کا جنگجویانہ اسلام مدعو کو اسلام سے متنفر کرکے اس کا امکان ہی ختم کر دیتا ہے۔ کہ اس کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی جائے اور وہ سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کرے۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۹۴

نئی دہلی کے نہرو میوزیم (تین مورتی ہاؤس) میں ایک سمینار تھا۔ یہاں تقریر کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہندستان میں سیاسی بگاڑ کا بنیادی سبب یہ ہے کہ آزادی

(۱۹۴۷) کے بعد جب یہاں قومی حکومت بنی تو پوری حکومت فریڈم فائٹرس کے ہاتھ میں دے دی گئی۔ جدوجہد آزادی کے دور میں اور اس کے بعد بھی فریڈم فائٹرس کو اتنا زیادہ گلوریفائی کیا گیا اور ان کو اس طرح ہیرو بنایا گیا کہ ملک کے نیم خواندہ یا ناخواندہ ووٹروں کے لئے دوسرا کوئی چوائس ہی باقی نہ رہا۔

فریڈم فائٹرس بلاشبہ اچھے فائٹر تھے، مگر وہ ناگزیر طور پر اچھے ایڈمنسٹریٹر نہیں تھے:

Freedom fighters were good fighters, but not necessarily good administrators.

۲۵ نومبر ۱۹۹۴

کسی مغربی مفکر کا قول ہے کہ ——— حکومت صرف حکومت کے لئے ہے۔ وہ بزنس کے لئے نہیں ہے:

Government is for governing. not for business.

یہ قول ہندستان پر بالکل پورا اترتا ہے۔ یہاں آزادی کے بعد بڑے پیمانہ پر پبلک سکٹر قائم کیا گیا۔ پبلک سکٹر گویا حکومت کا تجارت کرنا تھا۔ مگر یہ تجربہ سخت ناکام ہوا۔ بے شمار ناقابل تلافی نقصان کے بعد اب موجودہ وزیر مالیات ڈاکٹر من موہن سنگھ پبلک سکٹر کو ختم کرکے نج کاری (privatization) کا عمل جاری کئے ہوئے ہیں۔

۲۶ نومبر ۱۹۹۴

بعض چڑیوں کے بچے جب پیدا ہوتے ہیں تو وہ نرم گوشت کے ٹکڑے کی مانند ہوتے ہیں۔ ان کے جسم پر بال نہیں ہوتا۔ ان کی آنکھیں بھی بند ہوتی ہیں۔ ان کی ہر ضرورت مکمل طور پر اپنی ماں کے اوپر منحصر ہوتی ہے۔ ماں اِدھر اُدھر جاکر ان کے لئے غذا تلاش کرتی ہے۔ وہ چاول یا دانہ نہیں لاتی۔ کیوں کہ بچہ دانے کو ہضم نہیں کرسکتا۔ وہ چھوٹے کیڑے اپنی چونچ میں پکڑ کر لاتی ہے۔ گھونسلے میں بیٹھا ہوا بچہ آہٹ پاکر اپنا منھ کھول دیتا ہے اور ماں اپنی چونچ کی مدد سے کیڑے کو اس کے منھ میں ڈال دیتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ بچے عجز کی مکمل تصویر ہوتے ہیں۔ وہ عجز تام کو ممثل کرتے ہیں فطرت میں یہ منظر شاید اس لئے رکھا گیا ہے تاکہ انسان ان کو دیکھ کر اپنے عجز کا ادراک کرے۔ انسان بھی سراپا عاجز ہے۔ فرق یہ ہے کہ چڑیا کا بچہ اپنے ظاہر کے اعتبار سے بھی عاجز ہے۔ اور انسان کو اس امتحان میں کھڑا کیا گیا ہے کہ وہ خود اپنے شعور کے تحت اپنی حقیقت عجز کی معرفت حاصل کرے۔

۲۷ نومبر ۱۹۹۴

پر جوش تقریر کرنے کا نام لیڈری نہیں۔ اور نہ قوم کو ٹکراؤ کے راستہ پر دوڑانا لیڈری ہے۔ لیڈری ایک دانش مندانہ عمل کا نام ہے۔ دانش مند لیڈر کا رول صرف وہ شخص ادا کر سکتا ہے جو ذاتی مصلحتوں سے اوپر اٹھ جائے جو اپنی ذات کے تقاضوں سے زیادہ اصول کے تقاضوں کو اہمیت دے۔ جس کا حال یہ ہو کہ وہ اس چیز سے بے نیاز ہو جائے جو لوگوں کی طرف سے ملتی ہے اور اپنی ساری توجہ اس چیز کی طرف کر دے جو خدا کی طرف سے اہل حق کو دیا جاتا ہے۔

۲۸ نومبر ۱۹۹۴

بنجمن ڈزرائیلی (Benjamin Disraeli) نے کہا کہ اپنے آپ کو درست بنانے کے مقابلہ میں دوسروں پر تنقید کرنا کتنا زیادہ آسان ہے:

How much easier it is to be critical than to be correct.

تنقید کرنے کے لئے صرف زبان سے بولنا یا قلم سے لکھ دینا کافی ہے۔ مگر درست بننے کے لئے سیکڑوں عملی اسباب جمع کرنے پڑتے ہیں۔ اپنے نفس کو دبانا ہوتا ہے۔ اپنے مفاد کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ اسی فرق نے تنقید کو آسان بنا دیا ہے اور درست عمل کو مشکل کر دیا ہے۔

۲۹ مئی ۱۹۹۴

تین روزہ کانفرنس میں شرکت کے لئے میں اسپین میں تھا۔ یہاں کے ماحول میں میری زبان سے کچھ مخصوص دعائیں نکلیں۔ میرا احساس ہے کہ اللہ کی یاد اور دعاؤں کا معاملہ

شاید حالات یا جغرافیہ سے بھی بندھا ہوا ہے۔ مخصوص حالات یا مخصوص جغرافیہ میں ایسی دعائیں نکلتی ہیں یا ایسا ذکر زبان پر جاری ہوتا ہے جو اس کے سوا دوسرے احوال و ظروف میں نہیں ہوتا۔

۳۰ نومبر ۱۹۹۴

بمبئی کے ڈاکٹر عبدالکریم نائک اکثر افریقہ جاتے ہیں۔ احمد دیدات صاحب سے ان کی کافی ملاقات ہے۔ وہ ساؤتھ افریقہ سے حال میں واپس آئے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ احمد دیدات صاحب اپنے وطن ساؤتھ افریقہ میں مقبول نہیں ہیں۔ وہاں لوگ ان کو پسند نہیں کرتے۔ کیوں کہ ان کا انداز ڈیبیٹ اور مناظرہ کا ہے۔ وہ عیسائیوں اور یہودیوں کو کنڈم کرتے ہیں۔ اس سے نفرت اور اشتعال پیدا ہوتا ہے۔ البتہ عرب لوگ ان کو بہت پسند کرتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب کے لوگ شکست کی نفسیات میں مبتلا ہیں۔ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کو جنگ کے میدان میں مفتوح نہ کر سکے۔ اب احمد دیدات صاحب تقریر کے اسٹیج پر جب ان کو "لفظی شکست" دیتے ہیں تو عربوں کو اس میں دشمن پر فتح کا احساس ہوتا ہے۔ اس لئے وہ احمد دیدات کا استقبال کرتے ہیں۔

یکم دسمبر ۱۹۹۴

ایک پرانی مثل ہے زحمت میں رحمت (blessing in disguise) میں سمجھتا ہوں کہ یہ استثنائی بات نہیں بلکہ یہی تقریباً ہر ایک کا معاملہ ہے۔ اس دنیا میں بیشتر حالات میں یہی ہوتا ہے کہ بظاہر ایک زحمت کی صورت پیش آتی ہے اور اس کے اندر رحمت چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ آدمی زحمت والے پہلو میں الجھ کر رہ جاتا ہے، اور رحمت والے پہلو پر دھیان نہیں دے پاتا۔ اس لئے اکثر وہ قیمتی مواقع کو استعمال کرنے سے محروم رہ جاتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ آدمی یہ جانے کہ اس دنیا میں اسے زحمتوں کے درمیان زندگی گزارنا ہے۔ زحمتوں میں سے رحمت نکال لینا یہی زندگی کا امتحان ہے۔ اگر آدمی پر یہ بات واضح ہو تو وہ مایوسی سے بچ جائے اور ناکامی سے بھی۔

۲ دسمبر ۱۹۹۴

وصی اللہ ندوی صاحب اس وقت دہلی یونیورسٹی میں ایم اے عربی کے طالب علم ہیں۔ وہ گونڈہ (منگاپور) کے علاقہ کے رہنے والے ہیں۔ یہ علاقہ ہمالیہ کی ترائی میں نیپال کے قریب واقع ہے۔ یہاں کثرت سے جنگلات ہیں اور زیادہ تر لکڑی کا کاروبار ہوتا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ میرے بڑے بھائی سمیع اللہ خاں علی گڑھ سے انجنیرنگ کا کورس کرکے آئے۔ وہ جوشیلے آدمی تھے۔ چنانچہ ہندو ٹھیکیداروں سے ان کا ٹکراؤ ہوگیا۔ انھوں نے ایک بڑے ہندو ٹھیکیدار کو قتل کرا دیا۔ اس کے بعد ہندوؤں نے سمیع اللہ خاں کو بھی مار ڈالا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۳ سال تھی۔ اس کے بعد رشتہ دار اور دوست آئے۔ انھوں نے وصی اللہ صاحب کو اکسایا کہ تمہیں اپنے بھائی کا بدلہ لینا چاہئے۔ وصی اللہ صاحب نے بتایا کہ انھوں نے کچھ شمارے الرسالہ کے پڑھے تھے۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ جاپان نے کس طرح امریکہ کے ظلم کو بھلا کر اپنی تعمیر کی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے احباب سے کہہ دیا کہ میں انتقام نہیں لوں گا بلکہ میں تاریخ جاپان کو دہراؤں گا۔ چنانچہ انھوں نے قتل کے واقعہ کو بھلا کر اپنی زندگی کی تعمیر شروع کر دی۔ انھوں نے بتایا کہ علاقہ کے جو ہندو میرے بھائی کے دشمن بن گئے تھے وہ آج میرے دوست بنے ہوئے ہیں اور میرا انتہائی احترام کرتے ہیں۔ اور میرے کام میں تعاون بھی کرتے ہیں۔

۳ دسمبر ۱۹۹۴

محمد وسیم الحق صاحب دہلی سے مسلمانوں کا ایک انگریزی اخبار نکالنا چاہتے ہیں اس سلسلہ میں عرب ملکوں نے ان کو مالی امداد کی بھی یقین دہانی کرائی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پہلے مرحلہ میں ہم کسی ہندو کو اس کا اڈیٹر بنائیں گے۔ جس طرح مسٹر جناح نے ۱۹۴۷ سے پہلے اپنے اخبار ڈان کے لئے پوتھن جوزف کو اڈیٹر بنایا تھا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے مسٹر کلدیپ نیر کا نام لیا۔

میں نے کہا کہ جس مسلم اخبار کے اڈیٹر کلدیپ نیر جیسے لوگ ہوں اس کو ہندو کبھی نہیں پڑھ سکتے۔ کیوں کہ ہندو کی نظر میں کلدیپ نیر ایک پرو مسلم شخص ہیں۔ آپ کو اس کے بجائے ایک

لبرل ہندو کو تلاش کرنا ہوگا۔ مثال کے طور پر دلیپ پیڈگاؤکر۔ انھوں نے اس سے اتفاق کیا۔

۴ دسمبر ۱۹۹۴

کلکتہ کے اخبار مشرق کے چیف اڈیٹر ایم ڈبلیو حق (Tel. 406748) ملاقات کے لئے آئے۔ گفتگو کے دوران اقبال کا ذکر آیا۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ میں مجھ میں اور دوسروں میں صرف یہ فرق ہے کہ دوسرے لوگ اقبال کے اس شعر کو پکڑے ہوئے ہیں کہ لڑا دے ممولے کو شہباز سے۔ اس کے برعکس میں اقبال کے اس دوسرے شعر پر عامل ہوں کہ:

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ

مزید یہ کہ پہلا شعر بانگ درا کا ہے جو اقبال کا ابتدائی کلام ہے اور دوسرا شعر ضرب کلیم کا ہے جو اقبال کا آخری کلام ہے۔ اس طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پہلا شعر منسوخ ہے اور دوسرا شعر اس کا ناسخ ہے۔

۵ دسمبر ۱۹۹۴

آج دوپہر کو سوامی ادم پورن سوتنترا (ہیلی روڈ، نئی دہلی) کی رہائش گاہ پر ایک مشاورتی میٹنگ تھی۔ اس میں تعلیم یافتہ ہندو تقریباً ۲۰ کی تعداد میں شریک ہوئے۔ موضوع یہ تھا کہ گاندھی کے خوابوں والا "نیو انڈیا" کس طرح بنایا جائے۔ اس میٹنگ میں ایک ماسٹر جین بھی تھے۔ وہ ہریانہ میں منسٹر رہے ہیں۔ اور مرکزی پارلیمنٹ کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میری عمر اب ۸۰ سال ہے۔ میں نے اپنی عمر کے ۶۰ سال پالٹکس میں گزارے ہیں۔ اپنے تجربہ کی بنیاد پر میں کہتا ہوں کہ سنگھرش کے بغیر ہمیں کامیابی نہیں مل سکتی۔ اگر ہمیں عوام کو اپنے ساتھ لینا ہے تو ہم کو سنگھرش کا طریقہ اختیار کرنا ہوگا (انتقال ماسٹر جین ۱۹۹۷)

عوام کو ابھارنے کے لئے یہ بات درست ہے مگر کسی مثبت مقصد کے لئے وہ اتنی ہی غلط ہے۔ اس لئے کہ سنگھرش کا طریقہ اختیار کرنے کے لئے ایک "دشمن" کھڑا کرنا پڑتا ہے۔ سامنے جب تک ایک دشمن نہ ہو، سنگھرش نہیں ہو سکتا۔ دشمن کو نشانہ بنا کر تحریک چلاتے ہی تحریک مکمل طور پر منفی ہو جاتی ہے۔ اور منفی تحریک سے کبھی مثبت نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ خود

گاندھی کی زندگی اس کی مثال ہے۔ انھوں نے انگریزوں کے خلاف سنگھرش پر تحریک چلائی۔ اس طریق عمل نے ۱۹۴۷ سے پہلے ان کو ہیرو بنادیا۔ لیکن انگریزوں کے ہٹتے ہی گاندھی زیرو بن گئے۔ آزاد ہندستان میں گاندھی کے لئے یا گاندھی وادیوں کے لئے مزید اپنا تعمیری رول ادا کرنا ناممکن ہوگیا۔ کیوں کہ اب کوئی دشمن موجود نہ تھا جس کے خلاف سنگھرش کیا جاسکے۔ سنگھرش کا طریقہ تخریب کے لئے کارآمد ہے مگر وہ تعمیر کے لئے اتنا ہی زیادہ مضر ہے۔

۶ دسمبر ۱۹۹۴

لکھنؤ کے پروفیسر یونس نگرامی (Tel. 0522-266738) الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ انھوں نے اس کے بارہ میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا: الرسالہ کے مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ آدمی کے اندر دو جذبہ بیدار کرتا ہے —— اعتماد علی اللہ اور اعتماد علی النفس۔

دوسری بات انھوں نے یہ کہی کہ جو لوگ الرسالہ کی مخالفت کرتے ہیں ان سے میں کہتا ہوں کہ الرسالہ کے پیغام کو اس نظر سے دیکھو کہ وہی واحد قابل عمل پیغام ہے۔ اگر آپ اس کے مخالف ہیں تو بتائیے کہ اس کے علاوہ دوسرا قابل عمل طریقہ کیا ہے۔ کیونکہ طریقہ وہی ہے جو قابل عمل ہو۔ جو طریقہ قابل عمل نہ ہو وہ کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا۔

۷ دسمبر ۱۹۹۴

عبد الحسیب خاں صاحب ملاقات کے لئے۔ وہ کراچی (گلشن اقبال) میں رہتے ہیں۔ ان کا دواؤں کا بزنس ہے (Tel. 4968253, 6970256)

گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ بھوپال میں میرے عزیز ہیں۔ ان سے ملنے کے لئے آیا ہوں۔ مگر میں صرف ۴ دن رہ سکوں گا۔ کراچی میں میرے بچے ہیں۔ اور وہاں زندگی اس قدر غیر محفوظ ہے کہ کسی بھی وقت کوئی حادثہ ہوسکتا ہے۔ اس لئے یہاں زیادہ ٹھہرنا ممکن نہیں۔ انھوں نے بتایا کہ کراچی میں ہر روز ایک درجن آدمیوں کے قتل کا اوسط ہے۔

میں نے کہا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اس لئے ہمیں پاکستان کی ضرورت ہے۔ پھر پاکستان میں مسلمان کیوں نہیں مل کر رہ رہے

ہیں۔ وہ اس کا کوئی خاص جواب نہ دے سکے۔ میں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ اختلاف زندگی کا ایک حصہ ہے۔ مثلاً میاں بیوی کے تعلق کو لیجئے۔ شہزادہ چارلس سے لیکر آپ تک کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کے اور اس کی بیوی کے درمیان بار بار اختلاف نہ ہوتا ہو۔ مگر ہم اس کو ایڈجسٹمنٹ کا مسئلہ بناتے ہیں نہ کہ تفریق کا مسئلہ۔ اگر اختلاف کو تفریق کا مسئلہ بنایا جائے تو ہر شادی آخرکار طلاق پر ختم ہوگی۔

ہندو اور مسلمان کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ قانون فطرت کے تحت دونوں میں اختلافات واقع ہوں گے۔ مگر ان اختلافات کو ہمیں ایڈجسٹمنٹ کا اشو بنانا تھا نہ کہ تقسیم ملک کا اشو۔ اختلافات کو تفریق کا اشو بنانے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ پاکستان کے مسلمانوں میں ایڈجسٹمنٹ کا ذہن نہیں۔ پہلے وہ ہندوؤں سے لڑتے تھے، اب خود آپس میں لڑتے ہیں۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ لوگوں کی سوچ کو بدلا جائے۔

۸ دسمبر ۱۹۹۴

ہارون شیخ صاحب (بمبئی) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ حال میں وہ جزیرہ لکشا دیپ گئے تھے جو کوچین کے قریب ہے۔ وہاں تقریباً دس ہزار کی آبادی ہے۔ اور سب کے سب مسلمان ہیں۔ اور شافعی مسلک پر ہیں۔ وہاں کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں ایک دوسرے کے احترام کی روایت بہت گہرائی کے ساتھ موجود ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر میں راستہ میں پیدل چل رہا ہوں اور سامنے سے ایک نوجوان بائیسکل پر آرہا ہے تو وہ میرے احترام میں بائیسکل سے اتر جائے گا۔ وغیرہ۔

یہی انسانی روایات کسی معاشرہ میں خیر وفلاح کی ضامن ہیں۔ ان روایات کا توڑنا ہی سماج کو توڑنا ہے۔ اس لئے جب بھی کسی سماج میں کوئی تحریک چلائی جائے تو روایات کو توڑے بغیر چلائی جائے۔ کیونکہ ایک بار اگر کوئی روایت ٹوٹ جائے تو اس کو دوبارہ قائم کرنا انتہائی حد تک دشوار ہو جاتا ہے۔

۹ دسمبر ۱۹۹۴

علامہ اقبال جنوری ۱۹۳۳ میں اسپین گئے۔ وہاں سے وہ قرطبہ پہنچے۔ اور قرطبہ کی

مشہور مسجد کو دیکھا۔ مسجد قرطبہ پر ان کی ایک مشہور نظم بھی موجود ہے۔ واپسی کے بعد ڈاکٹر شیخ محمد اکرام کے نام ایک خط میں اقبال نے لکھا: مسجد قرطبہ کو دیکھ کر انھیں جو روحانی بلندی ملی وہ اس سے قبل انھیں کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ (اقبال نامہ، جلد دوم، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۱ صفحہ ۳۲۲)

اس میں شک نہیں کہ مسجد قرطبہ اپنی عمارت کے اعتبار سے بہت عظیم ہے۔ میں بھی ۱۹۹۴ میں اسپین گیا ہوں۔ مگر مجھے بہت تعجب ہے کہ اقبال جیسے مفکر اور فلسفی کو انسانی ساخت کی عمارت کو دیکھ کر روحانی بلندی حاصل ہوئی۔ حالانکہ مجھے تو ایک پتی کو یا ایک ذرہ کو دیکھ کر اس سے زیادہ روحانی بلندی ملتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ روحانی بلندی کا منبع آلاء اللہ ہیں نہ کہ قرطبہ اور غرناطہ کی انسانی تعمیرات۔

۱۰ دسمبر ۱۹۹۴

مولانا شکیل احمد قاسمی (میرٹھ) نے بتایا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۴ کو میرٹھ کے مقامی لیڈروں نے یہ کال دی کہ بابری مسجد کو توڑنے کی دوسری برسی کو یوم سیاہ کے طور پر منایا جائے۔ لوگ اپنے بازو میں سیاہ پٹی باندھیں۔ اپنی دکانیں بند رکھیں۔ مسجدوں میں جا کر دعا کریں۔ مقامی حکام کے یہاں جا کر میمورنڈم پیش کریں کہ بابری مسجد کو دوبارہ اسی جگہ بنایا جائے۔ مگر میرٹھ کے مسلمانوں نے اس کال کو مکمل طور پر نظرانداز کر دیا۔ انھوں نے اس سلسلہ میں کچھ بھی نہیں کیا۔ حتی کہ میرٹھ میں اس موضوع پر کوئی جلسہ تک نہیں ہوا۔ لیڈروں نے جو پوسٹر دیواروں پر لگوائے تھے اس کو لوگوں نے پھاڑ کر پھینک دیا۔ یوم سیاہ منانے کی یہ کال مسلم لیگ وغیرہ وغیرہ سے وابستہ لوگوں نے دی تھی۔

مولانا شکیل صاحب نے بتایا کہ لوگ یہ کہتے ہوئے سنے گئے کہ اس مسئلہ کو سڑک پر لا کر ایک بار جو غلطی ہو چکی ہے اب اس کو دہرانے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اس طریق کار نے پوری قوم کو ذلت میں مبتلا کر دیا۔ بابری مسجد کے کیس کو اگر اجودھیا ہی میں انفرادی طور پر اٹھایا جاتا تو ہار کی صورت میں وہ انفرادی ہار ہوتی۔ لیکن اس کو پوری مسلم قوم کا مسئلہ بنا کر اٹھانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب جو ہار ہوئی وہ ایک اجتماعی ہار بن گئی۔

۱۱ دسمبر ۱۹۹۴

مولانا شکیل احمد قاسمی (میرٹھ) نے بتایا کہ میرٹھ میں سب سے زیادہ ٹاپ کا اسکول سینٹ میری اسکول ہے۔ اس کی بہت زیادہ فیس ہے اور داخلہ کی شرائط بہت سخت ہیں۔ بچہ کے گارجین تک کا انٹرویو لیا جاتا ہے۔ وغیرہ

ایک ہندو ٹھیلہ والا اپنے بچہ کو لے کر وہاں گیا۔ اور پرنسپل سے کہا کہ اس کو داخل کر لیجئے۔ پرنسپل نے کہا کہ یہاں تمہارے لڑکے کا داخلہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں بہت زیادہ فیس ہوتی ہے۔ تم اس کو ادا نہیں کر سکتے۔ دوسرے اسکول بہت سے ہیں جہاں فیس کم ہے۔ وہاں اپنے بچہ کو داخل کر دو۔ ٹھیلہ والے نے کہا کہ میں زیادہ محنت کروں گا اور آپ کی جو بھی فیس ہے اس کو ادا کر دوں گا۔ پرنسپل نے کہا کہ یہ صرف فیس کا معاملہ نہیں ہے۔ ہم گارجین کا بھی انٹرویو لیتے ہیں۔ جس گھر میں انگریزی بولنے کا ماحول ہو اسی کو داخل کرتے ہیں اور تم تو جاہل ہو پھر ہم کیسے تمہارے بچہ کو لے سکتے ہیں۔

اس کے بعد وہ ٹھیلہ والا پرنسپل کے پاؤں پر گر پڑا اور رونے لگا۔ اس نے کہا کہ مجھے تو بس آپ ہی کے اسکول میں اپنے بچہ کو داخل کرنا ہے اور یہیں پڑھانا ہے۔ اب پرنسپل کے لئے کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے فارم منگوایا اور خود ہی اس کو پر کر کے اس کے بچہ کو داخل کر لیا۔

اس واقعہ میں یہ سبق ہے کہ آدمی اگر لیاقت کی سطح پر اہل نہ ہو تب بھی اس کے لئے دروازہ بند نہیں۔ وہ طلب کی سطح پر ثبوت دے کر اپنے مقصد کو حاصل کر سکتا ہے۔

۱۲ دسمبر ۱۹۹۴

دہلی کے انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (۱۲ دسمبر) میں میرا ایک مضمون چھپا ہے اس کا عنوان ہے: ہندستان میں اسلام (Islam in India) اس میں واضح طور پر دعوت کی بات کہی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ہندستان میں اگر ہندو اور مسلمان کے درمیان نفرت کو ختم کر دیا جائے تو اس کے بعد نہایت آسانی سے یہاں اسلام پھیلنے لگے گا۔

اس سلسلہ میں قابل نصیحت بات یہ ہے کہ اس قسم کا ایک دعوتی مضمون ایک ایسے

اخبار میں چھپتا ہے جس کو ہندو چلاتے ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے اس کو اپنے درمیانی صفحہ پر چھاپا۔ پھر آج صبح سب سے پہلا جو ٹیلیفون آیا وہ سوامی اوم پورن سوتنترا کا تھا۔ انھوں نے مبارک باد دی کہ آج ہمیں اسی قسم کے مضامین کی ضرورت ہے۔

۱۳ دسمبر ۱۹۹۴

کچھ مسلمان ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے کہا کہ آپ ہندوؤں کے ساتھ مل جل کر رہنے کی بات کرتے ہیں۔ یہ تو ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں سے سب سے زیادہ عداوت رکھنے والے گروہ دو ہیں ـــــ یہودی اور مشرکین (المائدہ ۸۲) اس کے مطابق، ہندو مشرکین تو مسلمانوں کے سب سے زیادہ بڑے دشمن ہیں۔ پھر ان کے ساتھ مل جل کر رہنا کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔

میں نے کہا کہ قرآن کی اس آیت کا مطلب یہ نہیں۔ پہلی بات یہ کہ اس آیت میں جو چیز ہے وہ اعلان خداوندی ہے نہ کہ قول مومنین۔ یعنی خدا نے اپنے علم کے مطابق ایک گروہ کی بابت ایسا اعلان فرمایا۔ مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ خود اپنی رائے سے یہ فیصلہ کریں کہ فلاں قوم ابدی طور پر دشمن اسلام ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ خدائی اعلان اتمام حجت کے بعد کیا گیا ہے۔ اس کا تعلق پیغمبر کے مخاطبین اول سے ہے۔ یہاں "مشرکین" سے مراد نسل مشرکین نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد وہ معاصر مشرکین ہیں جو پیغمبرانہ دعوت اور اتمام حجت کے باوجود توحید کے منکر بنے رہے۔ ہندستان کے لوگوں پر سرے سے دعوت کا کام ہی نہیں کیا گیا اس لئے وہ اس آیت کا مصداق بھی نہیں بن سکتے۔

۱۴ دسمبر ۱۹۹۴

مسند احمد میں یہ روایت ہے کہ انّ اللّٰہ اذا احبّ قوماً ابتلاھم (اللہ جب کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو اس کو مصیبت میں ڈال دیتا ہے) اس حدیث کی روشنی میں اگر موجودہ مسلمانوں کے معاملہ کو دیکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ موجودہ مسلمانوں کو جو مسائل پیش آ رہے ہیں وہ خدا کی رحمت ہیں۔ مصیبت آدمی کی خفیہ صلاحیتوں کو جگاتی ہے۔ یہ

مصائب مسلمانوں پر اس لئے ڈالے جارہے ہیں کہ وہ بیدار ہو جائیں۔ اور ایک زندہ قوم کی حیثیت سے دنیا میں اپنا عمل کرسکیں۔

۱۵ دسمبر ۱۹۹۴

آج سپرو ہاؤس (نئی دہلی) میں ایک جلسہ تھا۔ اس کا انتظام سودیشی جاگرن منچ نے کیا تھا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے ایک لیڈر نے اپنی پرجوش تقریر میں کہا کہ اڑیسہ میں ایک عورت نے غریبی کی وجہ سے اپنے بچہ کو ایک ہزار روپیہ میں بازار میں بیچ دیا۔ یہ حالت ہے ہمارے دیش کی۔ یہاں پہنچایا ہے کانگرس نے ہمارے دیش کو۔

یہ ایک استثنائی واقعہ کا جنرلائزیشن ہے۔ مذکورہ لیڈر اگر یہ کہتے کہ ہندستان کے ۸۰ کروڑ لوگوں میں سے ایک عورت نے ایسا کیا کہ اس نے اپنے بچہ کو بازار میں بیچ دیا تو یہ ایک بیان واقعہ ہوتا۔ مگر جب انھوں نے مذکورہ انداز میں بات کہی تو انھوں نے ایک استثناء کو عام بنا کر پیش کیا۔

استثنائی واقعات کا یہ جنرلائزیشن موجودہ زمانہ کی قیادت اور صحافت دونوں میں عام ہے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں ہے۔ اسی انداز اظہار نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تمام جھگڑے پیدا کر رہے ہیں۔

۱۶ دسمبر ۱۹۹۴

دین کو جاننے کی دو سطحیں ہیں۔ ایک ہے معلومات کی سطح پر جاننا۔ اور دوسرا ہے معرفت کی سطح پر جاننا۔ معلومات کی سطح پر دین کو ہر شخص جان سکتا ہے۔ مگر معرفت کی سطح پر دین کو جاننا صرف اسی انسان کے لئے ممکن ہے جس کے ایمان نے اس کو تقویٰ کے درجہ میں پہنچایا ہو۔ تقویٰ آدمی کو ایک سنجیدہ اور حساس انسان بنا دیتا ہے۔ اور سنجیدہ اور حساس انسان ہی حقائق کی معرفت حاصل کرسکتا ہے۔

۱۷ دسمبر ۱۹۹۴

گاندھی بھون (دہلی یونیورسٹی) میں ایک سیمنار تھا۔ اس میں دہلی کے ذہین اور تعلیم یافتہ لوگ آئے تھے۔ زیادہ تر پروفیسر کلاس کے لوگ تھے۔ میں واحد مسلمان تھا۔ اس سیمنار

کاعنوان بحث تھا : National alternative

اس سیمنار میں تقریباً تیس آدمی شریک ہوئے۔ مگر میں نے دیکھا کہ ہر آدمی غیر متعلق (irrelevant) بول رہا ہے۔ ایک صاحب سے اپنا تاثر ظاہر کرتے ہوئے میں نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے دانشور طبقہ کا concern دیش نہیں ہے۔ اگر دیش اس کا concern ہوتا تو وہ کبھی اس طرح کی غیر متعلق باتیں نہیں کرتے۔ مثلاً اپنی بیٹی کی شادی ہر آدمی کا کنسرن ہوتا ہے۔ اس لئے بیٹی کی شادی کے معاملہ میں کوئی بھی اس طرح کی غیر متعلق بات نہیں کرتا۔

۱۸ دسمبر ۱۹۹۴

۲۱ - ۲۲ نومبر ۱۹۹۴ کی درمیانی رات میں پولیس نے ندوہ کے اطہر ہاسٹل کے کمرہ ۲۰ پر چھاپہ مارا۔ پولیس کا خیال تھا کہ اس کمرہ میں کوئی دہشت گرد کشمیری چھپا ہوا ہے۔ مگر ایسا کوئی طالب علم وہاں نہیں نکلا۔ طلبہ کی طرف سے مزاحمت پر پولیس نے ہوائی گولی چلائی۔ اس سے کچھ طلبہ معمولی طور پر زخمی ہو گئے۔

آج کے انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس میں اس سلسلہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (ناظم ندوہ) کا انٹرویو چھپا ہے۔ انھوں نے شاید انٹرویو رسے تلخ انداز میں گفتگو کی۔ چنانچہ اس نے اپنی رپورٹ کی سرخی ان الفاظ میں قائم کی ہے:

Nadwa raid leaves Ali Mian a bitter man.

ندوہ کے پندرہ روزہ اخبار تعمیر حیات (۲۵ نومبر ۱۹۹۴) میں اس پر نہایت تیز و تند مضامین چھاپے گئے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس موقع کو ندوہ والے استعمال نہ کرسکے۔ تعمیر حیات نے اس سلسلہ میں جو اداریہ لکھا ہے اس کا عنوان ہے ـــــ اسلامی تشخص کو مٹانے کی ایک کوشش۔ یہ محض ایک منفی ردعمل ہے۔ مثبت ردعمل یہ تھا کہ اہل ندوہ اس واقعہ کو اسلامی مدارس کے تعارف کے لئے استعمال کرتے۔ پولیس کے اس چھاپہ سے ندوہ "نیوز" میں آگیا تھا۔ اگر اہل ندوہ اپنے ہوش وحواس کو بحال رکھتے تو وہ مذمت کا انداز چھوڑ کر تعارف کا انداز اختیار کرتے۔ پریس کانفرنس، جلسہ اور مضامین کے ذریعہ وہ انگریزی اور ہندی پریس میں یہ بتاتے کہ اسلامی مدارس کا نصاب کیا ہے۔ وہاں کس طرح نوجوانوں کو

تربیت دی جاتی ہے۔ وغیرہ۔ مگر دعوتی مزاج نہ ہونے کی وجہ سے وہ مذمت سے آگے نہ جاسکے۔

۱۹ دسمبر ۱۹۹۴

میرے بڑے بھائی عبد العزیز خاں صاحب نے لائٹ اینڈ کمپنی لمیٹڈ کے نام سے جو کمپنی بنائی تھی اس کے وہ خود چیرمین تھے اور ان کے لڑکے شکیل احمد صاحب منیجنگ ڈائرکٹر تھے۔ اکتوبر ۱۹۸۱ میں دونوں کے درمیان اختلاف ہوگیا یہاں تک کہ شکیل احمد صاحب کمپنی سے الگ ہوگئے۔

میرے بھائی اس کے بعد دہلی آئے تھے۔ میری ڈائری میں ۱۲ مارچ ۱۹۸۲ء کو انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا کہ ۲۰ دسمبر ۱۹۲۹ کو جب والد صاحب کا انتقال ہوا تو دشواریوں کا پہاڑ سر پر گر پڑا۔ خاندان والے سانپ کی طرح پھن نکال کر چاروں طرف کھڑے ہوگئے۔ مگر اس سے بھی زیادہ بڑی پریشانی ۲ اکتوبر ۱۹۸۱ کو پیش آئی۔ بھائی صاحب کا اشارہ اپنے بیٹے شکیل احمد کی طرف تھا۔

شکیل احمد خاں دہلی سے آئے تو ان سے اس کا ذکر ہوا۔ اب حقیقت معلوم ہوئی۔ اصل یہ ہے کہ اختلاف پیدا ہونے کے بعد شکیل احمد خاں نے آفس جانا بند کر دیا تھا۔ اور الٰہ آباد میں اپنے گھر کے اندر رہنے لگے تھے۔ اس وقت انھوں نے اپنے گھر پر کسی سے بات کرتے ہوئے کہا کہ میں اپنے آپ کو گولی مار لوں گا۔ یہ بات بھائی صاحب تک اس طرح پہنچی کہ شکیل احمد نے کہا ہے کہ "میں ابا کو گولی مار دوں گا"۔

آخر عمر میں بھائی صاحب کو معلوم ہوگیا کہ یہ سراسر غلط فہمی تھی ——— اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غلط فہمی کتنی زیادہ خطرناک ہو سکتی ہے۔

۲۰ دسمبر ۱۹۹۴

حضرت عمر بن عبد العزیز اسلامی تاریخ کی ایک استثنائی شخصیت ہیں۔ جوانی کی عمر میں وہ ایک خوش فکر اور خوش باش آدمی تھے۔ مگر بعد کو وہ انتہا درجہ کے متقی بن گئے حتی کہ صحابہ کے بعد ہزار برس کی تاریخ میں شاید کوئی اتنا بڑا متقی پیدا نہیں ہوا۔ عمر بن

عبد العزیز کی سیرت پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان سے اس کا راز معلوم نہ ہو سکا تھا۔ اس کا راز مجھے اس وقت معلوم ہوا جب میں نے البدایہ والنھایہ میں ان کا ایک قصہ پڑھا۔ ان کی ایک بھیانک غلطی نے ان کو اتنا اعلیٰ درجہ کا انسان بنا دیا۔ ملاحظہ ہو کتاب مذکور، الجزالتاسع، صفحہ ۸۷

۲۱ دسمبر ۱۹۹۴

ایک تلخ تجربہ گزرا جس نے مجھ کو شدت کے ساتھ جھنجھوڑ دیا۔ اس کے بعد ایک دردناک احساس کے ساتھ میری زبان سے یہ الفاظ نکلے —— آہ وہ لوگ جن کو جہنم بھی قبول نہ کرے، وہ جنت کی کھڑکیوں پر لائن لگائے ہوئے ہیں۔

۲۲ دسمبر ۱۹۹۴

سری نگر (کشمیر) کے مظفر پرے ایڈوکیٹ سے ملاقات ہوئی۔ وہ الرسالہ پڑھتے ہیں۔ اور دوسروں کو پڑھاتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ مارچ ۱۹۹۴ میں ہائی کورٹ (جموں) میں ایک مقدمہ تھا۔ یہ مقدمہ سردار گوربخش سنگھ بنام اسٹیٹ آف جموں اینڈ کشمیر تھا۔ سردار گوربخش سنگھ کے وکیل مسٹر پرے تھے اور سرکاری وکیل کے طور پر مسٹر ایس کے آنند ڈوگرا پیش ہوتے۔

مسٹر پرے نے بتایا کہ کورٹ میں بحث کے دوران دونوں وکیلوں میں تکرار ہو گئی۔ مسٹر پرے چونکہ میری حمایت کرتے ہیں اور جسٹس علی محمد میر کو بھی انھوں نے میری کتابیں پڑھنے کے لئے دی ہیں۔ چنانچہ جسٹس میر نے جب دونوں میں تکرار ہوتے ہوئے دیکھی تو کہا:

Mr Paray, what is the philosophy of Maulana Wahiduddin?

اس کے جواب میں مسٹر پرے نے جسٹس علی محمد سے کہا کہ جناب ان کی فلاسفی اعراض (forebearance) ہے۔ اس کے فوراً بعد مسٹر پرے اور مسٹر ڈوگرا دونوں نرم پڑ گئے اور نارمل انداز میں بات کرنے لگے۔

۲۳ دسمبر ۱۹۹۴

خلیفہ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں رومیوں اور ایرانیوں سے جنگ ہوئی اس زمانہ میں حضرت عمر اکثر کہا کرتے تھے: لوكان بيننا و بينهم جبل من نار (کاش

ہمارے اور ان کے درمیان آگ کی ایک دیوار ہوتی) ایک مسلم مورخ نے اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے کہ پس نہ وہ ہم تک پہنچتے اور نہ ہم ان تک پہنچتے۔ اور ہر ایک امن وسلامتی کے ساتھ رہتا (فلا یصلون الینا ولا نصل الیہم ویعیش کل واحد فی آمن و سلامة)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلافت راشدہ کے زمانہ میں رومی سلطنت اور ایرانی سلطنت سے مسلمانوں کی جو لڑائی ہوئی اس کا سبب ان شہنشاہیتوں کی جارحیت تھی۔ یہ خود مسلمانوں کا جنگی اقدام نہ تھا جو "مصلحانہ نظام" قائم کرنے کے نام پر کیا گیا ہو، جیسا کہ موجودہ زمانہ کے بعض انقلابی مسلمان دعویٰ کرتے ہیں۔

۲۴ دسمبر ۱۹۹۴

۲۳ دسمبر کو سوامی اوم پورن سوتنترا کے مکان پر ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں تعلیم یافتہ ہندو شریک ہوئے۔ مسئلہ یہ تھا کہ ملک کو تباہی کے گڑھے سے نکال کر ترقی کی راہ پر کیسے لگایا جائے۔ میں نے کہا کہ سب سے پہلے یہ جانئے کہ اصل مسئلہ کیا ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے عوام اور خواص میں رائٹ تھنکنگ نہیں۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ہمارے ملک میں جو تحریک چلی اس نے ہم کو پولٹیکل لیڈر شپ دی۔ مگر اس نے ہمیں انٹلکچول لیڈر شپ نہیں دی۔

دسمبر ۱۹۹۴ میں آندھرا کے الکشن میں کانگرس بری طرح ہار گئی۔ اس کا راز یہ تھا کہ مخالف پارٹی نے نعرہ دیا کہ "دو روپیہ کیلو چاول" اس نے کہا کہ ہم کو ووٹ دے کر جتاؤ تو ہم چاول کا دام دو روپیہ کیلو کر دیں گے۔ ہر سمجھ دار آدمی جانتا ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ مگر اس نعرہ پر عوام ٹوٹ پڑے اور اس کو بھاری تعداد میں ووٹ دے کر کامیاب کر دیا۔

ایسی حالت میں ماس ایجوکیشن ہماری پہلی ضرورت ہے۔ مگر ماس ایجوکیشن کون کرے۔ بدقسمتی سے ہمارے پاس اس کے لئے افراد نہیں۔ کیوں کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ خود غلط فکری کا شکار ہے۔ میں نے تجویز کیا کہ دہلی میں ایک ہفتہ وار میٹنگ شروع کی جائے جس کا مقصد تعمیر شعور ہو۔ اس پر سب کا اتفاق ہوگیا۔ اور پہلی تاریخ یکم جنوری ۱۹۹۵ مقرر ہوئی۔ اگرچہ مجھے یقین نہیں کہ اس قسم کا سنجیدہ کام تسلسل کے ساتھ جاری رہ سکے گا۔

۲۵ دسمبر ۱۹۹۴

مسٹر مظفر پرے ایڈوکیٹ (سرینگر) نے بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے وہ اپنے آبائی گاؤں بیگام میں تھے۔ یہاں ان کا سیب کا باغ ہے اور اس سے متصل ان کا مکان ہے۔ وہ باغ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ چار کشمیری گن لئے ہوئے آئے۔ مسٹر پرے ان کو اپنے گھر میں لے گئے اور چائے وغیرہ سے ان کی تواضع کی۔ اس کے بعد پوچھا کہ آپ لوگ کہاں جارہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ بیگام کے فلاں آدمی کو ہم قتل کرنے کے لئے آئے ہیں۔ مسٹر پرے نے ان کو منع کیا مگر وہ اس کے قتل پر اصرار کرتے رہے اور یہ کہہ کر اٹھ گئے کہ ہم اپنے مشن کو پورا کرنے جارہے ہیں۔

اس کے بعد مسٹر پرے نے کہا کہ اچھا آپ دو منٹ اور ٹھہر جائیں۔ اس کے بعد وہ گھر کے اندر گئے اور میری کتاب "پیغمبر انقلاب" لے کر آئے۔ اس کا ایک حصہ کھول کر انھوں نے کہا کہ اس کو آپ پڑھ لیں، اس میں ہمارے پیغمبر کی بات بتائی گئی ہے۔ مسٹر پرے کا بیان ہے کہ جنگجو بیٹھ گئے اور کتاب پڑھنا شروع کیا۔ وہ کتاب کو پڑھ رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ آپ کا شکریہ۔ ہم واپس جارہے ہیں۔ اب ہم اس آدمی کو نہیں ماریں گے جس کو مارنے کے لئے ہم آئے تھے۔

۲۶ دسمبر ۱۹۹۴

ڈاکٹر ایل ایم سنگھوی لندن میں انڈیا کے ہائی کمشنر ہیں۔ ان سے لندن کی کانفرنس میں ملاقات ہوئی۔ وہ میری تقریر سے کافی متاثر ہوئے تھے۔ دہلی میں مہرولی کے علاقہ میں ان کا ایک خوبصورت فارم ہاؤس ہے۔ یہاں انھوں نے ایک تقریب کی۔ اس میں آدھی تعداد برطانیہ اور امریکہ کے سفید فام حضرات کی تھی، آدھی تعداد میں ہندو تھے۔ سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس موقع پر ڈاکٹر سنگھوی نے مجھے بھی بلایا۔ وہاں جو غیر ملکی افراد جمع تھے، ان سے میرا تعارف کراتے ہوئے انھوں نے کہا:

He is a very noble soul of India. He came to London and addressed a conference there. He made the people cry.

یہ سن کر لوگ مجھے حیرت کے ساتھ دیکھنے لگے۔

۲۷ دسمبر ۱۹۹۴

مسٹر اعجاز رضوی (لکھنؤ) پچھلے ۲۲ سال سے بھارتیہ جنتا پارٹی سے وابستہ ہیں۔ ۹۲-۱۹۹۱ میں وہ اتر پردیش میں بھاجپا گورنمنٹ میں منسٹر بھی تھے۔ انھوں نے بتایا کہ میں اس فیصلہ میں شریک تھا جب یہ طے کیا گیا کہ بابری مسجد کی جگہ رام مندر بنانے کے اشو پر وشو ہندو پریشد کا ساتھ دیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا مقصد ہرگز بابری مسجد کو توڑنا نہیں تھا۔ بلکہ صرف ہندو ووٹ حاصل کرنا تھا۔ ۱۹۸۴ میں ساری کوشش کے باوجود ہمارے صرف دو ممبر پارلی منٹ میں پہنچ سکے تھے۔ اس لئے ہم نے طے کیا کہ اب ہمیں ووٹروں کو کھینچنے کے لئے کوئی نیا اشو لینا پڑے گا۔ بابری مسجد تو ہمارے لئے ایک سیاسی سیڑھی تھی جس سے ہم سنٹر تک پہنچنا چاہتے تھے۔ پھر ہم کیسے اسے توڑتے۔ چنانچہ ۲ دسمبر ۱۹۹۲ کی شام کو جب لال کرشن آڈوانی اجودھیا سے لکھنؤ آئے اور چیف منسٹر کے مکان پر ہم لوگوں کی میٹنگ ہوئی تو میں نے دیکھا کہ آڈوانی رو رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ آپ لوگوں کے لئے بہت رسکی گیم تھا۔ کھلے طور پر بابری مسجد توڑنے کا نعرہ دے رہے تھے، جبکہ آپ اس کو توڑنا نہیں چاہتے تھے۔ کیوں کہ بابری مسجد کو توڑنا سادہ طور پر ایک اسٹرکچر کو توڑنا نہیں تھا بلکہ خود اپنے پولٹیکل اشو کو ختم کر دینا تھا۔ مگر عوام اس فرق کو نہیں جانتے۔ جب آپ توڑنے کے نام پر عوام کو ابھاریں گے تو یہی ہوگا کہ ان کی بھیڑ جمع ہو کر اس کو توڑ ڈالے گی۔ اور آپ ان کو روکنے میں ناکام رہیں گے۔

مسٹر جناح اسی قسم کی غلطی کر چکے ہیں۔ انھوں نے ملک کو بانٹنے کی بات کی۔ حالانکہ وہ ملک کو بانٹنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ ان کا صرف بارگیننگ پوائنٹ تھا۔ مگر جب مسلم عوام کو انھوں نے تقسیم کے نام پر ابھار دیا تو ان کے لئے ناممکن ہوگیا کہ وہ واپس ہوں یا مسلم عوام کو تقسیم کا نظریہ چھوڑنے پر آمادہ کر سکیں۔

۲۸ دسمبر ۱۹۹۴

شیخ عبد اللہ بن زید المحمود (پیدائش ۱۳۲۹ھ) ایک بڑے عالم ہیں۔ ان کے مختلف رسائل کا اردو ترجمہ الدار السلفیہ، بمبئی سے شائع کیا گیا ہے۔ اس کے آخر میں ایک باب

کا عنوان ہے : امت پر رسول کا حق۔

۲۹ ستمبر ۱۹۹۴

ایک تلخ تجربہ گزرا۔ اس کے بعد میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ایک ایسی دنیا جہاں لوگ خدا کی بات نہ سنتے ہوں وہاں لوگ میری بات کیسے سنیں گے۔ جہاں لوگ خدا کے کنٹرول میں نہ ہوں وہاں لوگ میرا کنٹرول کیسے قبول کریں گے۔ آہ میرے مولا، جہاں خود آپ بے بس ہو گئے ہوں وہاں اگر میں بے بس ہو جاؤں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

۳۰ دسمبر ۱۹۹۴

غالب فدائی ایم اے ملاقات کے لئے آئے۔ وہ وشاکھاپٹنم کے رہنے والے ہیں۔ ان سے میری پہلی ملاقات ۳۰ سال قبل ہوئی تھی۔ آج دیکھا تو بڑھاپا شدت سے ان کے اوپر طاری تھا۔ ان کا پورا جسم نحیف ہو رہا تھا۔ چہرہ پر زندگی باقی نہیں تھی۔ حالاں کہ وہ آرام کی زندگی گزارتے ہیں۔ بظاہر انھیں کوئی رنج یا مصیبت لاحق نہیں۔

غالب فدائی صاحب تقریباً میری ہی عمر کے ہیں۔ مگر مجھ کو لوگ دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ آپ تو اس عمر میں بھی جوان معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ میری شخصیت میں ذہنی حرکات (mental activities) بہت زیادہ جاری رہتی ہیں۔ میں مسلسل طور پر ایک مِنٹل ٹارچر کی کیفیت میں مبتلا رہتا ہوں۔ یہ مِنٹل ٹارچر ہر آن میرے ذہن کو متحرک رکھتا ہے۔ یہی مسلسل ذہنی حرکت اس کا سبب ہے کہ خدا کے فضل سے اس عمر کو پہنچ کر بھی میں ذہنی طور پر بوڑھا نہ ہو سکا۔ اور ذہنی بڑھاپے ہی کا نام بڑھاپا ہے اور ذہنی جوانی ہی کا نام جوانی۔

۳۱ دسمبر ۱۹۹۴

حدیث (ابن ماجہ کتاب الاقامۃ) میں ہے کہ جو شخص رات کو نماز میں کثرت کرے گا دن میں اس کا چہرہ روشن ہوگا (من کثرت صلاتہ باللیل حسن وجہہ بالنہار)

یہ کوئی پراسرار بات نہیں، وہ ایک سادہ فطری حقیقت ہے۔ آدمی جس کام میں بھی زیادہ مشغول ہو اس کا اثر اس کے چہرہ پر آجاتا ہے۔ ایک آدمی خدا فراموشی کے کاموں میں

مشغول ہو تو اس کے چہرہ پر بے حسی، غیر سنجیدگی، سرکشی جیسی صفات کا عکس نظر آئے گا۔ اس کے برعکس جو آدمی خدا کی عبادت میں وقت گزارے تو اس کے چہرے پر تواضع، خشوع سنجیدگی جیسی صفات کا پرتو دکھائی دے گا۔

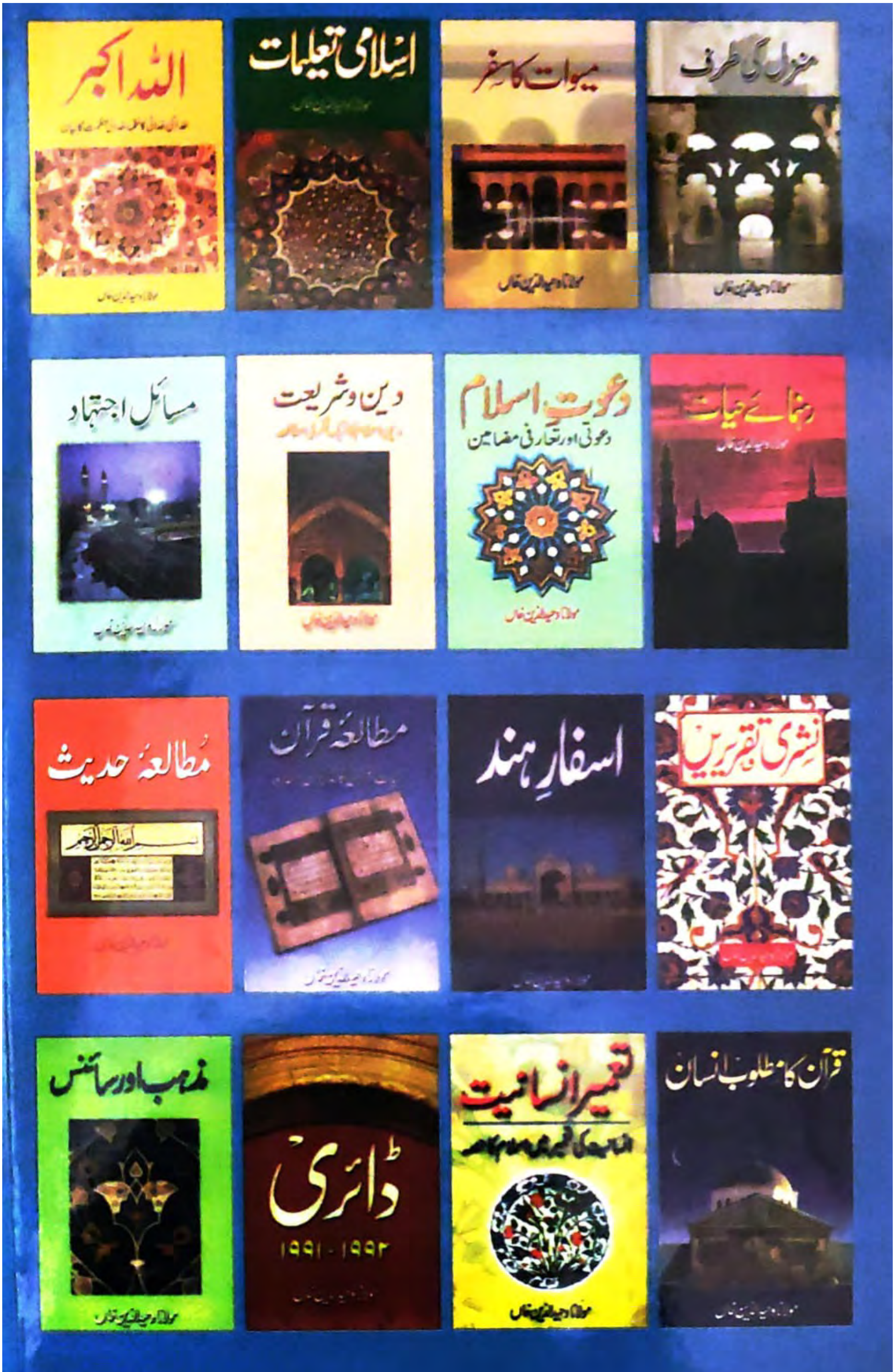
منزل کی طرف
میوات کا سفر
اسلامی تعلیمات
اللہ اکبر
رہنمائے حیات
دعوتِ اسلام
دعوتی اور تعارفی مضامین
دین و شریعت
مسائل اجتہاد
نشری تقریریں
اسفارِ ہند
مطالعۂ قرآن
مطالعۂ حدیث
قرآن کا مطلوب انسان
تعمیر انسانیت
ڈائری
۱۹۹۱ - ۱۹۹۲
مذہب اور سائنس